www.paksociety.com
نگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ پرچہ
ماہنامہ
نئے اُفق
کراچی
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
عید مبارک

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

ناول

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

کچھ توجہ ادھر بھی......!

بھارت نے کبھی بھی پاکستان کے وجود کو خوش دلی سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا بلکہ اپنی سازشوں کی منصوبہ بندی پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کرتا ہے جو ان کے دفاعی بجٹ کا حصہ ہوتا ہے۔ اب تک جتنی وارداتیں بھارت کے مختلف شہروں میں ہوئی ہیں چاہے وہ ممبئی دھماکے ہوں یا مکہ مسجد اجمیر یا مالی گاؤں میں ہونے والے بم دھماکے۔ گجرات کا قتل عام ہو یا سمجھوتہ ایکسپریس کی آتش زدگی ان سب کا ملبہ بھارتی حکمران بڑی آسانی سے بلا تحقیق پاکستان پر ڈال دیتے ہیں اور عالمی سطح پر پاکستان کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں اور جب تمام تر تحقیقات کے بعد خود ان کے منہ پر سیاہی پھیلتی نظر آتی ہے تو کان دبا کر رہ جاتے ہیں۔ اب تک جتنے بھی حادثات بھارت میں رونما ہو چکے ہیں ان سب کا الزام بلا تحقیق اور بعد از تحقیق وہ پاکستانی تنظیموں خصوصاً لشکر طیبہ، حرکت الجہاد اسلامی وغیرہ پر ڈال کر اپنا منہ کالا کر لیتے ہیں۔

امریکا جس کی آج کل ساری توجہ بھارت پر مرکوز ہے اس کی حمایت میں امریکہ نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں اگر بھارتی حکمران سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہتے ہیں تو امریکا اس کی آنکھ بند کر کے تصدیق کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہوتا ہے۔ اس کے پس پردہ کیا امریکی مفادات ہیں اسے سمجھنا ہوگا۔ جس طرح امریکا' کو سوویت یونین متحدہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا ایسے ہی چین' امریکی آنکھوں میں کھٹکتا رہتا ہے۔ پہلے امریکا نے پاکستان کے توسط سے روس کے ساتھ چین کا بھی راستا روکنے کی کوشش کی روس کو تو پاکستان کے توسط سے منتشر کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن چین پر اس طرح کا ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ اب بھارت پر اس کی کرم فرمائیاں صرف اس لیے بڑھ رہی ہیں کہ اس کی طویل سرحدیں چین سے ملحق ہیں اور بھارت خود بھی چین دشمنی میں امریکا سے دو ہاتھ آگے ہی ہے جب کہ پاکستان نے شاہراہ قراقرم بنا کر چین سے دوستی تجارت اور اخوت کے رشتے کو اور مضبوط اور مستحکم کر لیا ہے۔ پاکستان کا یہ عمل امریکا اور اس کے نئے حلیف بھارت کو پسند نہیں ہے۔ پہلے بھارت' امریکا اور اسرائیل کے گٹھ جوڑ سے بلوچستان میں آگ و خون کی ہولی کھیل رہا تھا اور بلوچستان کو مشرقی پاکستان کی طرح الگ کر دینے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا لیکن غیور بلوچوں پر قابو پانے میں بھارت کو اس طرح

کامیابی نہیں ملی جیسے مشرقی پاکستان میں انہیں ملی تھی۔ اب سنا ہے کہ بھارت کی مدد اور تعاون سے امریکا نے پاکستان میں ایک نیا محاذ کھولا ہے شاہراہ قراقرم کو تہس نہس کر دینے اور پاکستان چین کی اس عظیم شہ رگ کو کاٹ دینے کی مذموم سازشیں ہو رہی ہیں۔ پہلے قدرتی آفات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برساتی پانی کا رخ موڑ کر شاہراہ قراقرم کو ایک بڑی جھیل میں تبدیل کر کے آمد و رفت کا سلسلہ معطل کر دیا۔ اب گلگت بلتستان میں حکومت مخالف تنظیمیں قائم کر کے انہیں فنڈ فراہم کیے جا رہے ہیں تاکہ پاکستان اور چین کے درمیان تجارت کو روکا جا سکے اور دونوں ملکوں کے درمیان قائم ہونے والا نیا تجارتی راستا جو گوادر پورٹ سے چین کو تجارتی راہ داری مہیا کرے گا۔ خصوصاً چین کے وہ علاقے جو گلگت بلتستان سے ملحق ہیں جہاں اسے اپنے اندرونی راستوں سے ضروریات زندگی پہنچانے میں دشواری ہوتی تھی۔ اب اسے گوادر بندرگاہ کے باعث وہاں تک رسائی میں سہولت میسر آئے گی لیکن امریکا اور بھارت کو یہ پسند نہیں چنانچہ انہوں نے اس منصوبہ کو روکنے اور پاک چین تعلقات میں رخنہ ڈالنے کے لیے بلوچستان کے بعد گلگت اور بلتستان کو اپنے نشانے پر رکھ لیا ہے۔ وہاں حکومت کی مخالف تحریکوں کو ہوا دی جا رہی ہے اور چین کی پاکستان میں بڑھتی ہوئی مقبولیت سے نا صرف بھارت بلکہ امریکا بھی خوف زدگی کا شکار ہو رہا ہے اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔ امریکا میں موجود بلاورستان نیشنل فرنٹ نامی تنظیم کو فعال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس کی سر پرستی امریکی یہودی کر رہے ہیں دوسری طرف گلگت بلتستان کو الگ صوبہ بنانے کی بات بھی بھارت کو پسند نہیں آ رہی۔ ان کے خیال میں تو وہ مقبوضہ کشمیر کا حصہ ہے جس پر خود بھارت کا حق بنتا ہے۔ اس لیے شاید اب بھارتی سازشوں کا مرکز بلوچستان سے تبدیل ہو کر امریکی سر پرستی میں گلگت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی حکمران مسلسل یہ کہہ رہے ہیں کہ گلگت میں چینی افواج موجود ہیں جیسا کہ بھارتی فوج کے جنرل کے ٹی پارنائیک کا بیان بھی آیا کہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں چینی افواج موجود ہیں حالانکہ چینی افواج تو اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اپنی سرحدوں میں ہی ہوں گی۔ بھارت اور امریکی یہودی جو اسرائیلی مفادات کے لیے بے دریغ اربوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں جنہیں پاکستان کی ایٹمی قوت سے بھی نام نہاد خطرہ لگا رہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پاکستان اپنے پڑوسیوں سے مل کر رہے اور خطے میں امن و سکون قائم ہو سکے۔ اللہ پاکستان کی حفاظت فرمائے اور پاک چین دوستی کو دشمنوں کی نظر بد سے محفوظ رکھے آمین۔

گفتگو

عمران احمد

> فرمان رسول اللہ ﷺ
>
> زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کی کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک نوجوان (پاس سے) گانا گاتے ہوئے گزرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: "اے نوجوان! تم پر افسوس ہے تم (گانے کی بجائے) قرآن کریم کو ترنم سے کیوں نہیں پڑھ لیتے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کئی بار دہرائی۔ (دیلمی)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

عید مبارک کے ساتھ یوم آزادی مبارک۔

الحمدللہ رمضان المبارک کا دوسرا عشرہ یعنی مغفرت واستغفار کا عشرہ ختم ہونے کو ہے۔ جس وقت آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے تیسرا اور آخری عشرہ بھی اپنے اختتام کو ہوگا۔ یہ ماہ مبارک قبل از اسلام بھی بڑا متبرک مانا جاتا تھا اس ماہ کفار بھی اگر حالت جنگ میں ہوتے تو ہتھیار رکھ دیتے تھے۔ ظہور اسلام کے بعد اس ماہ میں بڑے اہم واقعات رونما ہوئے۔ یعنی قرآن پاک اسی ماہ مکمل ہوا فتح مکہ اسی ماہ کی 15 تاریخ کو ہوا۔ آپ کو روزانہ موبائل فون پر جانے ان جانے لوگوں کے درجنوں میسجز ملتے ہوں گے جس میں طرح طرح کے دنوں کی مناسبت سے مبارک باد کے پیغامات ملتے ہوں گے مگر افسوس کہ ان پیغامات میں کسی بھی مسلمان نے 15 رمضان کو فتح مکہ مبارک کا پیغام نہیں دیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جو قوم اپنی تاریخ بھلا دیتی ہے وقت انہیں تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیتا ہے۔

بازی گر حسام بٹ کی "دیگر" مصروفیات کے باعث اس ماہ بھی شامل اشاعت نہیں ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ حسام بٹ کو اپنے ارادوں وعدوں پر استقامت کے ساتھ قائم رہنے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔ بازی گر کی جگہ اس ماہ سے برصغیر کے مایہ ناز ادیب اور سیاح اے حمید کا معترکۃ الآرا سفرنامہ "گنگا کا پجاری" پیش کیا جا رہا جو یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔

اب آئیے اپنے خطوط کی طرف پہلا خط ہے کراچی سے این شاہین کا سلام کے بعد کہتی ہیں دستک میں قریشی صاحب نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ یا اللہ ہماری مدد فرما۔ جیسا کہ پانی، گیس، بجلی اور مہنگائی نے دھوم مچائی ہوئی ہے وہیں بے گناہ انسانی جانوں کو ایسی بے رحمی سے دھڑا دھڑ اور بنا کسی قصوریوں سر راہ قتل کیا جا رہا ہے کہ سن کر ہی روح کانپ اٹھتی ہے نہ جانے ایسا کرنے والے کس دل سے ایسا کر لیتے ہیں۔ یہ انسانی جانوں کا زیاں، بے روزگاری، سخت گرمی میں حد سے بڑھتی لوڈشیڈنگ، بارش کا نہ ہونا، بڑھتی ہوئی بھوک پیاس اور ایسی بہت سی چیزیں یہ سب ہمارے اعمال کی سزا ہی تو ہیں کیونکہ ہم دنیا کے پیچھے بھاگتے اپنے دین اسلام کو بھول رہے ہیں۔ اپنے اللہ سے مدد مانگنے کے بجائے عہدیداروں کے پیچھے پیچھے لمبی قطاریں باندھے عرضیاں لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے رب غفور الرحیم کی طرف رجوع کریں تو نہ تو ہمیں لمبی قطاروں میں لگ کر انتظار کرنا پڑتا ہے اور نہ ہی خالی ہاتھ لوٹنا پڑتا ہے۔ اپنی وقعت کی وجہ سے کیونکہ اللہ کے ہاں تو کوئی عہدہ نہیں دیکھا جاتا وہاں تو سب برابر ہیں بس اعمال کا فرق ہوتا ہے۔ اب جبکہ رمضان جیسا بابرکت مہینہ رواں ہے تو اس میں بھی تو اپنے اعمال کو درست نہیں کر پا رہے۔ اس میں بھی بے ایمانی سے کام لے رہے ہیں اور بھی بہت سے ایسے عمل کہ جو ہم بندوں سے چھپا کر جاری رکھے ہوئے ہیں مگر اللہ پاک سے تو کوئی بھید بھی ذرہ برابر بھی چھپا نہیں ہے وہ تو سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے پھر ہمیں سزا نہ ملے تو کیا ہو یہ سب ہمارے اعمال کے سبب ہی تو ہے یہاں تک کہ ابر کرم بھی نہیں برستا اب تو (ایسی باتیں اور بھی بہت ہیں کہنے اور

سوچنے کو مگر کبھی کہی نہیں جاتی۔ اب بھی جو یہ سب لکھا ہے وہ ٹھیک ہے کہ نہیں میں تو بس بے اختیار لکھ گئی۔ خیر گفتگو کی طرف بڑھتے ہیں ورنہ خط طویل ترین ہو جائے گا۔ عمران بھائی آپ نے یوم آزادی کے بارے میں درست فرمایا کیونکہ ہم آزاد رہ کر بھی آزاد نہیں ہیں۔ پھر خالی خولی مبارک باد کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ سمجھنے والے میری بات کو خوب سمجھ گئے ہوں گے۔ اللہ ہی ہمیں عقل سلیم عطا فرمائے۔ تو جناب کرسی صدارت پر تشریف فرما طاہرہ جبیں صاحبہ سلام اور مبارک باد کرسی صدارت کی بھی، رمضان کی بھی یوم آزادی کی بھی اور عید المبارک کی بھی وہ بھی ایڈوانس میں۔ ریاض انکل آپ کو بھی این شاہین کا سلام اور مبارک باد انکل خوش رہیں مایوی کیسی اگر یونہی مایوس ہونے لگے تا ہر کوئی تو پھر تو گیا کام سے۔ خیر آپ جس بات سے مایوس ہوئے تھے اب خوش بھی ہو جائیے کہ آپ کی محبت کی سیڑھی لگ گئی ہے اور واقعی باقی کی تمام (آپ کی) اسٹوریز سے ہٹ کر رہی یہ تو خالد انسپکٹر کے کیا کہنے۔ عصمت صاحبہ آپ کو بھی سلام اور مبارک باد آپ نے بالکل درست کہا ان نام نہاد پیروں فقیروں کے بارے میں کیونکہ یہ حقیقت ہے۔ یہ نئے حیدر صاحب کہاں سے ٹپک پڑے اور میرے لیے اتنا کچھ کہہ گئے۔ شکریہ جناب خیر آپ کو بھی سلام اینڈ ویلکم ویسے کافی پرانے لگتے ہیں (کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت) ارے ریاض انکل آپ کے پڑوسی بھی شامل ہونے لگ گئے اور آپ نے بتایا تک نہیں۔ تعارف ہی کروا دیتے سب سے۔ حیدر صاحب دعا گو رہیے گا ہمیشہ۔ مقبول صدیقی انکل سلام قبول ہو مع مبارک باد آتے رہا کیجیے غائب مت ہوا کریں۔ میری نظم پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ اگر آپ سب کی حوصلہ افزائی ملنے لگے تو این شاہین بھی کوئی مقام پا ہی لے گی بھی اور آپ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے میرا ووٹ آپ کے حق میں ہے۔ عبداللہ صاحب آپ کو بھی سلام مبارکباد آپ کی حصار نے تو حصار میں لے لیا کم فہم لوگ ہیں کچھ سمجھ پاتے ہیں اور کچھ نہیں دعاؤں کی طلبگار۔ عبدالمالک کیف صاحب بھئی گزرے تو پہلے ہم بھی آپ کے شہر سے تھے مگر آپ نے تو صرف بھائیوں کو ہی دعوت دی تھی بہنوں کو پوچھا تک نہیں اس لیے ہم نے بھی آپ کو مطلع نہیں کیا آپ کے یاد رکھنے کا شکریہ اور آپ کے بھائی کہاں غائب ہو گئے مجاہد ناز صاحب کہاں گم گئے آپ۔ آپ بھی یاد رکھتے ہیں شکریہ سلام اور مبارک باد۔ محمد فہد وعلیکم السلام بھیا کیسے ہیں آپ۔ اتنا غائب مت ہوا کریں۔ کچھ باتوں پر نانیا گلہ اور ہو گیا ہے آپ سے ہمیں یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اپنی سسٹر کی طرف سے سلام اور مبارک باد وصول کیجیے نظم پسند کرنے کا شکریہ۔ بھئی گفتگو تو اختتام کو پہنچی مگر جو کمی شروع میں لگی وہ آخر تک رہی اور اب سمجھ گئی وہ کیا کمی ہے وہ شہناز آنٹی کی کیونکہ وہ شامل گفتگو نہیں ہیں۔ پلیز حاضر ہو جائیں۔ سلام مبارک باد اور ڈھیروں دعائیں اور دوسری کی فقیر لنگاہ انکل کی جو مجھے تو بھول گئے پر ہم نہیں بھولے انہیں۔ سلام انکل مع فیملی اور مبارک باد دعاؤں کی منتظر۔ خیر غائب تو اور بہت سے نام ہیں وہ بھی اپنی حاضری یقینی بنائیں سب کو سلام اور دعائیں مبارک باد باقی سلسلوں کی طرف جاتے ہیں۔ اسماء الحسنیٰ کی تعریف کے لیے الفاظ پانا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس ذات باری تعالیٰ کے ناموں اور کاموں کی تعریف کرنا ہمارے بس کی بات نہیں وہ پاک ذات اور ہم گنہگار۔ اقرا امین طاہر صاحب نے ہمیشہ کی طرح بہت پیاری احادیث پیش کیں اور وضاحت بھی خوب کی تو ناول حصار کا تو ہم بتا ہی چکے ہیں مزید کچھ نہیں کہہ سکتے۔ "شکاری" کی آخری سطر نے واقعی چونکا دیا۔ جرم لاشعور دور اندیش ٹھیک اور بازی گر میں حسام انکل آپ نے تو رلا ہی دیا ہم تو پہلے سے بیمار تھے دل اور بوجھل ہو گیا۔ گردش خوب جا رہی ہے بس سرمئی پر حیرت ہے کہ وہ اپنی ماں کو پہچان نہیں پائی۔ باقی سب بھی شاندار ہیں۔ خوش بو سخن اور ذوق آگہی میں سب کی تحریریں خوب رہیں۔ قابل داد اور محمد اعظم کی خالی دامن نے دل ہلکا کر دیا۔ بہت اچھی رہی اور اختتام بھی اچھا ہی ہوا بس اگر کرم دین زندہ رہتا تو اپنے بچوں کے ساتھ زندگی گزارتا مگر......! ساتھیوں اب اجازت تکلیف دہ باتوں پر معذرت دعاؤں کی متمنی ہوں۔

مجاہد ناز عباسی...... سنجر پور۔ محترم عمران احمد السلام علیکم سدا خوش رہیں۔ آج تبصرہ کرنے کو دل نہیں کر رہا کیونکہ آج پھر کراچی لہولہان ہو گیا ہے۔ درجنوں افراد نامعلوم ٹارگٹ کلرز کے ہاتھوں لقمہ اجل بن

گئے۔ چوکوں شاہراہوں اور گلیوں میں پڑی بے گوروکفن نعشوں نے جہاں امن کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کی اصلیت کا پردہ چاک کیا ہے۔ وہیں کراچی کے کروڑوں شہری ان دیکھے خوف اور بے وجہ موت کے خوف سے نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ نہ جانے کب کہاں کوئی حادثہ ہو جائے کوئی نہیں جانتا۔ شہر میں جاری حالیہ کشیدگی کے باعث اورنگی اور متصل آبادیوں کے لاکھوں مکین اپنے گھروں کو نہیں لوٹ سکے۔ خواتین بچوں اور بزرگوں نے سڑکوں پر راتیں جاگ کر گزاری۔ ان دیکھی قوتوں کے ہاتھوں یرغمال اس شہر کراچی کے اندر اذیتوں کے ایسے کئی قصے ہیں جن کا شعوری طور پر کوئی خاص ذکر نہیں کیا جاسکتا تاہم ان واقعات کے اندر کرب اور احساس ذلت کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن کا مہذب معاشروں میں تصور محال ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت شہر میں وقتاً فوقتاً ہونے والی بدامنی پر قابو پائے ورنہ بے بس شہریوں کا یہ جم غفیر غیظ و غضب کا لشکر بن کر امن کے دعویداروں پر ٹوٹ پڑے گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک کراچی اور ہمارے پیارے وطن پاکستان کو اپنی امان میں رکھے۔ اب آتا ہوں میگزین کی طرف تو سب سے پہلے میں جناب عمران احمد، مشتاق احمد قریشی، طاہر قریشی، عفان احمد، عمر اسرار، سید عبداللہ شاہد، ناظم بخاری، فقیر محمد صابر لنگاہ، ریاض بٹ، ریاض حسین قمر، واجد نگینوی، ارشاد احمد قریشی، محمد امجد علی کیف، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، محمد اسلم صدیقی، محمد فہد، آپی شہناز بانو، طاہرہ جبیں تارا، شبنم ارشاد، عصمت اقبال، عین صاحبہ، ناز سلوش، ذیشان، فاخرہ سلطانہ، خدیجہ احمد، ریحانہ سعیدہ عالیہ انعام الہٰی، این شاہین اور تمام رائٹرز جن کے نام میں نہیں لے سکا سب کو میری طرف سے جشن آزادی اور عیدالفطر مبارک ہو۔ دستک میں جناب عمران احمد صاحب نے موجودہ حکومت کی چال بازی اور ان کی مکاریوں سے ہمیں آگاہ کیا۔ گفتگو میں اپنے تمام رائٹرز بھائیوں بہنوں کی کمی محسوس ہوئی اور میں خود بھی حاضری نہیں دے سکا کیونکہ میں بیمار تھا اور میں بہت مشکور ہوں کہ تمام نئے افق رائٹرز نے میری تیمارداری کی (اب مذاق مت سمجھو کافی رائٹر میرے گھر آئے تھے وہ بھی خواب میں) شہناز آپی آپ نے کہا تھا کہ زندگی میں صبر کرنا سیکھو اور خواہش کے مطابق ہر چیز فوراً نہیں ملتی لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ انسان کو کچھ حاصل کرنے کے لیے محنت تو کرنی چاہیے ناویسے میں کوشش کرتا ہوں صبر کروں لیکن ہوتا نہیں۔ آپ کی "گردش" بہت پسند ہے مجھے ویل ڈن آپی۔ خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی کا سارا انتخاب بہت پسند آیا۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! سب سے پہلے اس بندۂ ناچیز کی طرف سے تمام قارئین نئے افق اور نئے افق کے تمام اسٹاف اور ورکرز کو دلی عید مبارک قبول ہو۔ خدا بزرگ و برتر آپ کو ایسی ہزاروں عیدیں اور خوشیاں دیکھنا نصیب کرے آمین ثم آمین۔ اس ماہ یعنی اگست کا پرچہ ذرا تاخیر سے بے قرار نگاہوں کے سامنے آیا۔ سرورق پر آج کل خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ جس سے پرچے کی دلکشی کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ سب سے پہلے دھڑکتے دل اور تھرتھراتے ہاتھوں کے ساتھ ورق الٹ کر فہرست پر نگاہ ڈالی اپنی کاوش موجود پاکر خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ بہت بہت مہربانی شکریہ۔ دستک میں اس بار مشتاق احمد قریشی صاحب آج کل کے برننگ ایشو پر بات چیت کر رہے ہیں۔ دراصل ہمارے حکمران اپنا وقت پورا کر رہے ہیں اور اپوزیشن والے اپنے دونوں کے چکر میں لگے ہوئے ہیں۔ کرنا کسی نے کچھ نہیں دوسری پارٹی نے آکر یہی کہنا ہے کہ توانائی کا بحران پچھلی حکومت کا چھوڑا ہوا ہے۔ اس کو ٹھیک کرنے میں وقت تو لگے گا۔ اس طرح ان کی مدت حکومت بھی تمام ہوجائے گی اور عوام بے چارے صرف اپنا سر پیٹ کر رہ جائیں گے۔ خیر یہ بحث تو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ بڑھتے ہیں اپنی محفل گفتگو کی طرف بھائی عمران احمد کی باتیں سوچ کے نئے در وا کر رہی ہیں۔ اس پر خدارا غور کیجیے طاہرہ جبیں، بہن آپ کا رونا بھی بجا ہے لگتا ہے اب ہم اونٹوں پر سفر کیا کریں گے۔ لیکن اس طرح تو ہم پرانے دور میں چلے جائیں گے۔ ویسے آپ کا تبصرہ خوب ہے۔ عصمت اقبال عین صاحبہ آپ کی بچپن والی شرارت نے میری ایک کہانی کا خون کردیا ہے۔ بھلا بتائیے کیسے؟ حیدر بھائی خوش آمدید۔ اتنے عرصہ بعد پرچے کی یاد تو آئی۔ ارے جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب بڑے عرصے بعد ایک

بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لائے اور ہمیشہ کی طرح چھا گئے۔ بھائی آپ نے بالکل غلط شکوہ کیا ہے کہ میں نے آپ کو یاد نہیں کیا۔ پچھلے چھ سات ماہ کے پرچے ذرا دیکھیں۔ ایک بات کے لیے میں آپ کا شکر گزار رہوں گا کہ آپ میری کہانیوں کے فین ہیں۔ اس بار "محبت کی سیڑھی" کے متعلق ضرور اظہار خیال کیجیے گا۔ عبداللہ شاہد بھائی آپ کا تبصرہ بھی زبردست ہے۔ آپ کی اس بات سے بھی مجھے اتفاق ہے کہ اس دور میں اچھی بیوی ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ سید عبداللہ شاہد آپ کی کہانی بلکہ ناول بہت پسند آیا۔ محنت رنگ تو لاتی ہے۔ عبدالمالک کیف صاحب یاد کرنے کا شکریہ۔ محمد فہد آپ نے مجھے یاد رکھا اور محفل میں ذکر کیا اس کے لیے بھی یہ بندۂ ناچیز مشکور اور ممنون ہے۔ اب بڑھتے ہیں باقی کہانیوں کی طرف واجد نگینوی کی تحریر شکاری ایک چونکا دینے والے انجام کی تحریر ثابت ہوئی۔ "جرم لاشعور" بھی معیاری تحریروں میں شمار ہوگی۔ قاتل اگر غلطیاں نہ کرے تو کسی تھانے دار کے لیے قاتل کو پکڑنا ممکن نہیں۔ اب بات ہوجائے سلسلہ وار کہانیوں بازی گر اور گردش کی۔ دونوں کی موجودہ قسطیں لاجواب ہیں۔ ان کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہانی کو پڑھتے ہوئے بوریت کا احساس بالکل نہیں ہوتا۔ باقی کہانیوں میں کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔ کیونکہ سب اپنی اپنی جگہ لازوال ہیں۔

محمد فہد...... مظفر گڑھ۔ بعد از سلام مسنون سب سے پہلے آپ کو میرے پیارے نئے افق کے اسٹاف، تمام رائٹرز حضرات، کاکے، کاکیاں، بزرگ، نوجوان سب کو تمام قارئین کرام اور پوری امت مسلمہ کو محمد فہد کی طرف سے ایڈوانس عید مبارک اس امید کے ساتھ کہ ان شاء اللہ اس مرتبہ عید سعید کے موقع پر کوئی بری خبر سننے کو نہ ملے گی۔ اس بار ٹائٹل بہت ہی منفرد اور انوکھا انداز لیے بہت سحر انگیز منظر لیے یہ بتا رہا تھا کہ اے ابن آدم اپنا قبلہ درست کرلے ورنہ قبر کے اندھیرے میں تیرے لیے روشنی کی کرن لانے والا کوئی نا ہوگا۔ بلکہ تیرے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو تو اس دنیا سے کما کر لے جائے گا۔ تو تمام اہل اسلام سے درخواست ہے کہ رمضان کے مہینے سے جتنا منافع کما سکتے ہیں کمائیں جو جتنا ڈپازٹ کرسکتا ہے کرے کیونکہ اس بنک میں ڈپازٹ کی کوئی حد نہیں لیکن مختصر مدت ضرور ہے۔ جو صرف 29 یا 30 دن ہے۔ "دستک" بابا مشتاق احمد قریشی اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے اور آپ کا شفقت بھرا سایہ سدا ہمارے سروں پر بنا رہے اس بار آپ نے ایسے عنوان پر قلم کاری کی جو آج کل عروج پر ہے۔ روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانے والی نام نہاد جمہوریت نے ملک کے غریب عوام کا سانس لینا بھی محال کردیا ہے جو نعرہ لگا کر عوام کو اچھے وقت کے حسین سپنے دکھا کر حکمرانوں نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی۔ بھولی بھالی اور غریب عوام سے وہی سہولیات ہی چھین لیں۔ آج ملک میں غربت عام ہے بے روزگاری اور معاشی بدحالی روز بروز پروان چڑھتی جارہی ہے۔ کیا یہی ہے ہماری جمہوریت کہ رمضان کے مقدس مہینے میں بھی ملک بھر میں بجلی کی لوڈشیڈنگ کئی علاقوں میں تو ایک ایک ہفتہ تک بجلی نہیں آئی نہ سحری کے وقت بجلی ہوتی ہے نا افطار کے وقت کیا گورنمنٹ کا ضمیر مردہ ہوگیا ہے اور واپڈا والے بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہم سے تو چائنہ والے بھی ہزار گنا بہتر ہیں وہ ہمارے ایک سال بعد آزاد ہوئے لیکن ایک اسلامی ریاست نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اسلامی قوانین کو اپنایا اور آج دنیا کی ترقی یافتہ اور مضبوط ترین قوم ہیں۔ کچھ سوچیے اپنے ضمیر کو جگائیے اور آپ اپنے آپ سے وعدہ کریں کہ آپ آج سے ہی اپنے آپ کو شرعی قوانین کا پابند بنائیں گے اور کسی بھی برے کام میں نہ شریک ہوں گے نہ کسی برے انسان کا ساتھ دیں گے۔ "گفتگو" محترم عمران بھائی سلام باشد! کیسے مزاج گرامی ہیں جناب کے؟ ویسے لگتا ہے آپ کو مجھ سے زیادہ ہی محبت ہے کیونکہ آپ مجھے اکثر کوئی نا کوئی شکایت کا موقع ضرور دے کر نوازتے ہیں۔ میں جس حصے پر قینچی چلانے سے منع کرتا ہوں آپ کی قینچی اسی حصے پر ضرور چلتی ہے۔ بزم سخن کا سلسلہ مستقل بند کرنے کا ارادہ ہے کیا؟ بھئی نئے سلسلے شروع کیے اچھی بات ہے شمارے کی خوب صورتی میں اضافہ ہوا لیکن پرانے سلسلے بند کرنا یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اب آتا ہوں دوستوں کے محبت ناموں کی طرف۔ ماشاء اللہ کرسی صدارت پر محترمہ طاہرہ جبیں تارا براجمان ہیں مبارک باد قبول کریں۔ اللہ آپ کو صحت کاملہ عاجلہ عطا کرے اور بے پناہ خوشیوں سے

نوازے۔ اللہ کرے کہ غم کبھی آپ کی دہلیز تک نہ دیکھیں آمین۔ جناب عبدالمالک کیف صاحب سلام محبت قبول کیجیے خاکسار کو یاد رکھنے کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تمام تمناؤں کو خوب صورت انجام تک پہنچائے آمین۔ ڈیئر سسٹر ابن شاہین سلام محبت! کہاں غائب ہو جی اور باقی گھر والے کیسے ہیں امی جان کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس بیٹے کے حق میں دعا فرمائیں۔ لاہور والوں کے لیے پیغام لگتا ہے آپ لوگ ہمیں بھول گئے ہیں یا بھولنا چاہ رہے ہیں کیونکہ نہ تو کوئی رابطہ ہے نہ خیر و عافیت کی خبر اگر پڑھ رہے ہو تو جلد از جلد رابطہ کرو۔ جناب ریاض بٹ' عصمت اقبال عین' حیدر صاحب اُز حسن ابدال' محترم ابن مقبول جاوید صدیقی' محترمہ شہناز بانو' محترمہ شبنمی ارشاد' جناب عبداللہ عاطر' بابا فقیر محمد بخش صابر لنگاہ بمع لنگاہ فیملی' سیدہ آکاش بخاری' جناب ارشاد قریشی' محترمہ ریحانہ سعیدہ' ڈاکٹر واجد نگینوی' ناظم بخاری' راؤ چاند' وقاص احمد وکی' کشمیری سیب (نازسلوش ذشے) اصغر علی ناصر' ارسلان علی ناصر' محترمہ عالیہ انعام الٰہی' اللہ دتہ عابد' امیر حمزہ چاند' فاخرہ سلطانہ اور جن دوستوں کے نام نہیں لکھ سکا سب کو محمد فہد کی جانب سے ڈھیروں دعائیں اور تحفہ سلام اور ایڈوانس عید مبارک ایک بار پھر سے۔ خوش بوئے سخن میں میثم علی آغا' غلام عباس جتوئی' ماہ نور خانزادہ' نازسلوش ذشے اور باقی دوستوں کی کاوش بھی بہت اچھی رہی۔ فی الحال انہیں الفاظ کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ ورنہ معاف کیجیے گا۔

آپ کی دعاؤں کا طالب

ایم خان...... لانڈھی، کراچی۔ عمران صاحب السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے مع اسٹاف و اہل و عیال نئے افق پڑھنے کی وجہ تسمیہ سناتا ہوں آپ کو کہ میرے بھائی صاحب جو عرصہ دراز سے نئے افق پڑھ رہے ہیں تو ہر ماہ تو رسالہ گھر آتا ہے پر میں نے کبھی نہیں پڑھا کیونکہ مصروف زندگی میں اتنا ٹائم نہیں ملتا یہ تو سب ہی جانتے ہیں تو اسی طرح جون کا شمارہ لایا گیا تو ایک تو اس کے سرورق نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور دوسرا یہ کہ اس دن مجھے چھٹی بھی تھی تو میں وہ رسالہ اٹھا کر یوں ہی صفحے الٹنے لگا اور آخر کار خالی دامن پر آ کے رک گیا جو کہ خواہشوں کے غلام کی ایک کہانی تھی پھر میں نے جب وہ شروع کی تو پڑھتا چلا گیا پھر اگلے ماہ تو میں خود جا کے رسالہ لے آیا۔ حالانکہ میں نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا اور جب اس کی آخری قسط میں نے پڑھی تو سوچا کہ میں بھی ذرا حصہ لے ہی لوں گفتگو میں کیونکہ کچھ خط میں نے پڑھے تھے لوگوں کے اور سچ بتاؤں تو میں نے اس کہانی خالی دامن کے علاوہ اور کچھ پڑھا نہیں مگر اب ارادہ کیا ہے اور اگر میں گفتگو میں شامل ہو گیا تو پھر ہر سلسلے میں شامل ہو جاؤں گا۔ اللہ آپ کو اور نئے افق کو ترقی دے آمین۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں اللہ حافظ۔

سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد۔ السلام علیکم ورحمۃ خدائے مطلق سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور میرے دم ساز اور ہم دم رسالے نئے افق کی تمام وحدتوں' جہتوں اور سعادتوں کے ساتھ مصروف عمل ہوں گے۔ اللہ عزوجل آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ مجلس ادارت میں سرپرست اعلیٰ بابا مشتاق احمد قریشی اور دیگر احباب و رفقا کی خدمت میں سلام اور عید الفطر کے موقع پر میٹھی عید کی ڈھیروں خوشیوں کے تحفے پر خلوص' محبتوں کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی شب و روز کی محنت و ریاضت کو ٹھکانے لگائے اور نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے آمین۔ رحمتوں برکتوں کا مبارک مہینہ شروع ہونے میں ابھی چند دن باقی تھے کہ ماہ اگست کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آپ نے رمضان المبارک کی مناسبت سے سرورق دیا تھا جو فکر و تدبر کی تحریک پیدا کر رہا تھا۔ زمانہ حال اور ماضی کے لحاظ سے فلیش بیک کرتے ہوئے ایک سوختہ اور جلی عمارت کو فوکس کیا گیا تھا۔ سرخ لہو کی روشنی سے عمارت کی پہلی منزل میں کوئی الاؤ جل رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے گلابی سرخ رنگ کے یاقوت اور مرجان دل آویزی سے جگمگا رہے ہوں۔ دائیں جانب آگ میں جھلس کر خاکستر اور بے آب و گیاہ ہونے والے قبرستان کی زمین آہ و بکا کرتی محسوس ہوتی تھی۔ افغانستان' عراق اور مشرق وسطیٰ میں ورلڈ آرڈر اور امریکی جارجیت کا شکار ہونے والے بے گناہ مسلمانوں کی اجتماعی قبروں کا منظر تھا۔ دیکھ کر دکھ اور آزردگی کا احساس ہوا۔ مادہ پرستی اور نفسانی خواہشات میں سچے مسلمانوں کی غیرت دانا سے محروم رہ جانے والے ہم لوگ ایمان و یقین کے راستے میں بے نام و نشان ہونے والے ان مظلوم مسلمانوں کی قبروں کو دیکھ کر کیا بیدار نہیں ہو سکتے؟ کیا مسلم غیرت و خودداری کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے؟ حقیقت یہ ہے کہ ظاہری عیش پرستی نے ہم مسلمانوں کو باطنی اور روحانی حقیقتوں سے غافل اور اندھا کر دیا ہے۔ ہم ایک مظلوم کی گریہ زاری سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ بھوک اور روٹی کی طلب سے روتا ہے حالانکہ وہ غریب شخص عدل و انصاف نہ ملنے پر بے بسی سے آنسو بہا رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مادہ پرستی کی سر سامانیوں سے اور غفلتوں سے پناہ میں رکھے آمین۔ اس مرتبہ قبلہ محترم مشتاق احمد قریشی "اللہ مدد فرما" کے الفاظ ادا کرتے ہوئے حکومتی ایوانوں کے بلند و بالا دروازوں پر دستک دیتے ہوئے ارباب اختیار اور غافل حکمرانوں کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ الیکشن سے پہلے مچنے والی اس ہاہا کار کا مقصد اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے کہ اس بدنظمی کو وجہ بنا کر الیکشن کے دورانیے کو طول دیا جائے یا ملتوی کیا جائے؟ جمہوریت کی اصل روح یہ ہے کہ چاہے کوئی انتظامی تبدیلی در پیش ہو عوامی زندگی اور کاروباری نقل و حمل میں رکاوٹ اور تعطل نہیں ہوتا۔ یہ معمول کے مطابق جاری رہتا ہے لیکن پاکستان کی تقدیر میں جمہوریت کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ابتدائی قیمتی صفحات پر اپنی کہانی "حصار" کو مبہوت ہو کر دیکھتا رہا۔ خوشی اور تشکر سے آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ یہ خلاف توقع بات تھی محترم عمران بھائی۔ اس لیے حیرت و خوشی کی ملی جلی کیفیت سے مسحور ہو کر آپ کی پر خلوص محبتوں کے بارے میں تا حال مستغرق ہوں۔ آپ کا شکریہ اس شعر کی صورت ادا کر رہا ہوں بقول شاعر۔

چھپتا نہیں آنکھوں میں اب کوئی سر محفل

بینائی تیرا عکس بدن اوڑھے بیٹھی ہے

جناب اس بندہ پروری پر خود کو منکسر اور عاجز محسوس کر رہا ہوں۔ بہت خوشی کے ساتھ کوئی انجانا خوف بھی ہولائے دے رہا ہے کہ کہیں مجھ ناتواں سے آپ کوئی آزمائش نہ لے رہے ہو۔ دم سوچ رہا ہوں کہ کیا میں اس قدر قامت کے ساتھ آئندہ بھی انصاف کر پاؤں گا؟ مختصر ناول کی اشاعت پر بے حد مشکور ہوں۔ اس مرتبہ "اقرأ" میں محترم طاہر قریشی درس و تدریس دیتے ہوئے حرص و طمع جیسی بری خصلتوں پر احادیث کی روشنی میں وعید فرما رہے تھے اور ایمان و یقین کے جذبوں کو جلا بخش رہے تھے۔ ہم مسلمان گناہوں میں یوں ڈوبے ہوئے ہیں کہ حرص و طمع ہماری ضرورت بن گئے ہیں جبکہ بے بسی اور مجبوری کی حالت میں ہم صبر و شکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا اسے ہی دین اسلام کی روح کہتے ہیں۔ اللہ عزوجل ہمیں عقل سلیم عطا فرمائے آمین۔ اس بار پہلے مستقل سلسلوں پر رائے زنی کرتا چلوں۔ اسماء الحسنیٰ میں حسام بٹ صاحب نے "یا واحد" کی صفاتی برکات اور وظائف کا قدرے سہل لفظوں میں ذکر فرمایا۔ جس سے اس اسم مبارک کی تاثیر اور کیفیت سے آگہی حاصل ہوئی۔ ذوق آگہی میں برادر عفان احمد کے منتخب اقتباس اور مراسلے بہت خوب لگے۔ ابن مقبول صدیقی صاحب کا ڈر اور پیار کا فکری نقطہ دل کو اچھا لگا یعنی سارا کھیل ہی تعلق اور نسبت کا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بندے کا تعلق ہی سب سے بہتر ہوتا ہے۔ ذشے کا "ایشیائے کوچک" سے معلومات میں اضافہ ہوا اور "کچھ دشمن کے بارے میں ارشادات" جو ساہیوال سے ماجد علی نے لکھا تھا۔ خاصے کی چیز تھی۔ ویسے عفان بھائی اقتباس مختصر ہوں تو خوب تاثر چھوڑتے ہیں۔ (ایک مشورہ ہے امید ہے غور کریں گے)۔ خوش بوئے سخن میں عمر اسرار نے اس مرتبہ جو شعرا اکرام کی شاعری کا انتخاب کیا اس میں میرا گیت بھی شامل تھا۔ اپنے پہلے گیت کی اشاعت پر شکر گزار ہوں۔ مزید یہاں آزاد شاعری کے حوالے سے خواتین میں مقابلہ بازی دکھائی دے رہی تھی۔ نازش جی' ریحانہ سعیدہ' عصمت اقبال عین اور فرحانہ عارف بھی منفرد خیال سے دل کو چھو رہی تھیں۔ تاہم وسیم اختر کی نظم "وجود" کے ساتھ عصمت کا "انتظار" وکٹری اسٹینڈ کے پہلے نمبر پر پسند آئیں۔ غزلیات میں ریاض حسین قمر' میثم علی آغا' پروفیسر واجد اور سیج جمال کی غزلیں لاجواب تھیں۔ غلام عباس جتوئی کی غزل لمبے مصرعے کی وجہ سے کچھ نوآموز لگی۔ جتوئی صاحب

شاعری کا جنون اپنی جگہ لیکن اپنی دھاک بٹھانا مقصود ہے تو چھوٹی بحر کی غزلیں لکھیں۔ یہ سچ ہے کہ کسی بھی شعبے میں نام کمانے کے لیے درجہ بہ درجہ بڑھنا سود مند رہتا ہے ورنہ وقت کو ضائع کرنے کی بات ہے۔ ”روحانی مسائل“ میں عوامی مشکلات اور پریشانیوں پر مبنی خطوط پڑھنے کو ملے حافظ شبیر احمد نے اپنے صائب جوابات سے ان کی مسیحائی فرمائی۔ اس کار خیر پر وہ قابل قدر شخص ہیں۔ اللہ عزوجل انہیں جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ اب گفتگو کے دوست واحباب سے سلام کلام ہوجائے۔ اس دفعہ طاہرہ جبین تارا صدارتی کرسی پر متمکن نظر آرہی تھیں اور خوش گوار لب ولہجے میں تبصرہ کر رہی تھیں۔ اس تبدیلی آب وہوا پر خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ دراصل تاراجی کے محبت کے فلسفے کی بعض شقوں میں ان کے جملوں کی وجہ سے فسوں کاری اور یاسیت تحریر سے جھلکتی رہی ہے۔ جس کی وجہ سے اداسی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ محترمہ نے بذلہ سنجی سے مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا۔ اس لیے اچھا لگا جھوٹے جعل ساز پیروں اور جعلی عاملوں پر آپ کے سروے کی نتیجہ خیز کامیابی پر میری جانب سے مبارک باد قبول کریں۔ محترم ریاض بٹ یہ آن ریکارڈ بات ہے کہ میں گفتگو میں رائے زنی کرتے ہوئے بھی آپ کو فراموش نہیں کرتا۔ بھول چوک میں ذہن سے رہ جاتا ہے اس لیے درگزر کرتے ہوئے مجھے تو بخش دیں۔ ویسے جناب کہانی کی اشاعت کی صبر آمیز خوشی قدر مشترک ہوگئی ہے لہٰذا آؤ بزرگوار ”محبت کی سیڑھی“ پر چڑھ کر حسین نظاروں کا لطف اٹھائیں اور ہاں چند لمحوں میں برادر ناظم بخاری بھی اس خوشی وانبساط کو دوبالا کرنے کے لیے پہنچ رہے ہیں۔ کیونکہ ایک انتظار کے بعد ان کی کہانی بھی شائع کردی گئی ہے۔ واہ جناب بخاری صاحب ”نٹ کھٹ“ ایک حساس موضوع پر خوب صورت تحریر تھی۔ آپ نے دریا کو کوزے میں بند کر کے دکھایا یہ مجھ سمیت چند صبر کرنے والے لکھاریوں کی خوشی کا احوال تھا۔ عمران بھائی آپ نے درست فرمایا کہ صبر کرنے والوں کو ان کی محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ عصمت اقبال عین آپ نے دلچسپ واقعہ بیان کیا اچھا تبصرہ کرنے لگی ہو لیکن یاد آوری کرتے ہوئے نظر انداز کر گئیں کیوں عصمت؟ ابن مقبول صدیقی ہم نے پکارا تھا اس لیے آپ کی آمد لازمی تھی۔ محترم بھرپور اور مفصل انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ میرے لیے روز اول ہی سے آپ کی محبتیں بہت قیمتی رہی ہیں۔ میری کہانی پر اب تبصرہ کرنا مت بھولیے گا۔ جناب ریاض حسین قمر ہمیشہ شاد وآباد رہیں آپ کی طرف داری سے حوصلہ ملا اب دیکھتے کا عمران بھائی میری تحریروں کو روک نہیں پائیں گے۔ محمد فہد تبصرہ خوب اور جاندار کیا ہے لیکن میرے چھوٹے بھائی اب تم برساتی مینڈک بنتے جارہے ہو پچھلی بار مجھ سے جواب لے کر یوں غائب ہوگئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کیسے نوجوان ہو تم یار؟ عبدالمالک کیف، محمد اسلم جاوید اور حیدر ساہیوال کے لیے نیک تمنائیں یاد آوری کا بھی شکریہ۔ اس مرتبہ محفل میں بہت سے دوست اور دیرینہ ساتھیوں کی غیر حاضری پر افسوس ہوا۔ ان سب کو سلام اور نیک تمنائیں۔ ساتھ ہی عیدالفطر کی ڈھیروں خوشیاں تمام دوستوں اور ساتھیوں کو مبارک ہوں۔ اب مختصر طور پر کہانیوں کے بارے میں رائے زنی کرتا چلوں۔ تین مغربی کہانیوں میں اسرار احمد کی دور اندیش نمبر ون اسٹوری رہی۔ فلپ براجرس کے تمام تحفظات اور احتیاط پسندی کو اس کے بیٹے ایلکس نے آخر کار نظر انداز کرتے ہوئے ازابیلا سے گٹھ جوڑ کرلیا۔ بیٹے کا مکروفریب کوئی باپ مشکل سے برداشت کر پاتا ہے۔ یہ صدمے کی بات ہے کیا فلپ بیٹے کو اس وقت اس کے حال پر چھوڑ نہیں سکتا تھا کہ جب وہ دشمن کی بیٹی سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا تھا۔ اس لیے بیٹے کی بے وفائی کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ سچ بیانیوں میں نوشاد عادل صاحب کی عبادت پہلے نمبر پر بھی پسند آئی۔ دفتری ریشہ دوانیوں کے ماحول پر یہ ایک معیاری اور سبق آموز کہانی تھی۔ دوسرے نمبر پر خدیجہ احمد کی نقد جاں اور تیسرے نمبر پر برائے فروخت (زین نقوی) پسند آئیں۔ سلسلے وار ناول میں پچھلے واقعات کی گردان کی وجہ سے ٹھہراؤ پوست اور جمود کا احساس ہوتا ہے البتہ بجیا شہناز بانو اپنے قلم کی جادوگری سے گردش کو لکھ رہی ہیں۔ اس دفعہ سرمئی اور روشن آرا کے جذباتی مناظر پڑھ کر آنکھیں نم آلود ہوگئیں۔ بجیا کے زور قلم کے لیے دعا گو ہوں۔

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ، محمد شفاعت حسنین صابر لنگاہ، محمد ثقلین صابر لنگاہ..... خانیوال۔ السلام علیکم! میں فقیر محمد بخش صابر لنگاہ بیماری کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا رہا اور جسم پر آ جانے والی سوجن نے چلنے پھرنے سے بھی مجبور رکھا۔ اللہ پاک نے اپنی رحمتوں کے سائے میں میرے دونوں بچوں محمد شفاعت حسنین صابر و محمد ثقلین صابر لنگاہ اور میرے عزیز ترین آفیسرز حاجی نور الٰہی جٹ اور حاجی سلیم احمد صاحب نے میرے علاج معالجہ میں کسی بھی طرح کوئی کمی نہ آنے دی۔ پر شفاء دینے والی تو اللہ کی ذات ہے۔ اسی وجہ سے سابقہ ماہ محفل میں شامل نہ ہوسکا۔ اس ماہ کا پیارا شمارہ نئے افق ملتان شریف سے جناب راؤ شہریار صاحب جو مجھے اس بات کی مبارک باد بھی دینے آئے تھے کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے ریکوری کیس کورٹ ڈی سی او ضلع خانیوال سے باعزت طور پر جیت لیا ہے۔ اب آتے ہیں پرچے کی طرف۔ صاحبزادی محترمہ شبنم ارشاد آف کراچی سدا خوش رہو۔ کامیابیاں پاؤ اور دکھ وغم تمہارے پاؤں کی دھول تک کو بھی نہ چھو سکیں۔ آپ کے مرحوم والد محترم ارشاد صاحب کو اللہ پاک جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کی والدہ کی جھولی سدا تمہارے لیے محبت کے پھول برساتی رہے اور تم بھی ان کی خدمت کرتے ہوئے کبھی نہ تھکو۔ فقیر کی عزت افزائی آپ اکثر اپنا بزرگ سمجھ کر کرتی ہیں۔ جس پر دلی طور پر شکریہ اور سو فیصد دعائیں آپ کے نام۔ آپ کی تحریر کردہ سچ بیانیاں دل سے پڑھی جاتی ہیں اور نئی والی داستان کا انتظار کیا جاتا ہے۔ باقی اس کے سلسلہ میں بھی انتظار ہے کہ کب آپ کی کوئی سلسلہ وار داستان پڑھنے کو ملے گی۔ باقی میری طرف سے آپ کو اجازت ہے جب بھی چاہیں آپ مجھ سے رابطہ کرسکتی ہیں فقط دعا گو صابر لنگاہ۔ عزیزی بہن شہناز بانو صاحبہ پیارا بھرا اسلام دعائیں اور عید مبارک کا پیغام۔ آپ کی داستان گردش کو دل سے پڑھا جاتا ہے اور اس دفعہ گردش نے ایک سال کی عمر پا کر دوسرے سال میں داخل ہونے کی تیاری کرلی۔ کہانی میلان و تیزی ایکشن دکھ سکھ کے دور اپنے پیچھے چھوڑ کر آگے سے آگے قدم بڑھا رہی ہے۔ جس پر آپ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ حسام بٹ صاحب کی ایکشن پرور سلسلہ وار داستان قسط نمبر 8 بازی گر تیزی سے میلان کو برقرار رکھتے ہوئے آگے سے آگے بڑھ کر قاری کے لیے ایک سسپنس کا سماں کرتی ہوئی اختتام تک لے جاتی ہے اور پھر ایک ماہ کے انتظار پر مجبور کردیتی ہے۔ یہ پھول اور کانٹوں کا سفر ہے۔ جس میں دکھ اور خوشی قانون کی پاسداری کے ساتھ لاقانونیت کا رنگ بھی ہے۔ مبارک باد بٹ صاحب اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ سابقہ ماہ میں دو نظمیں اتنی پیاری لگیں جن کا ہر ہر لفظ دل میں اتر گیا۔ وہ نظمیں ہیں ”اے اجنبی“ جسے تحریر کیا ابن شاہین صاحب نے۔ شاہین صاحب مبارک باد قبول کریں۔ دوسری نظم صاحبزادی ناز سلوش ذشے نے ”مہربان“ کے عنوان سے لکھی۔ میری طرف سے ناز صاحبہ کو مبارک باد اور دعائیں۔ بہت ہی کم صفحات میں حافظ شبیر احمد صاحب کے روحانی قلم کی مسیحائی بعنوان ”روحانی مسائل“ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی کہ کئی قسم کے مریضوں کا علاج فی سبیل اللہ ہو رہا ہے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب ہم سب کے مقبول مصنف ہیں۔ یہ نئے افق میں 2 صفحاتی رنگ دستک کو پیش کرتے ہوئے نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں کہ اٹھو جاگو انسان بنو کہ ہمارے ملک کو ہماری ضرورت ہے۔ محترمی جناب حسام بٹ صاحب کی تحریر اسماء الحسنیٰ قرآن مجید اور آیت کریمہ سے تلاش کی گئی ایک مجرب دوا و شفاء اور مشکلات بندش و پکڑ کو ختم کر کے راہ شفاء و ترقی کامیابی کی ایک سو فیصد سند بخشتی ہوئی سوغات ہے۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ ”اقرأ“ طاہر احمد قریشی صاحب کی دل میں اتر جانے والی خوب صورت قلم کی مسیحائی اور دین وحدیث نبوی کے اسباق سے آشنائی اور فرمانات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگاہی حضرت ابوہریرہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت ابوذر غفاریؓ حضرت ابوسعید خدریؓ جیسے صحابہ رسول اور معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی کی محنت اور صحیح مسلم، صحیح بخاری سے حاصل کردہ موتیوں کی لڑیوں سے قاری کو آگاہی بخش کر اس کے خالی وجود کو دینی روشنی سے منور کردیا۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ و دو فیملی ممبران کی جانب سے تمام اسٹاف، قارئین، مصنفین کو عیدالفطر کی خوشیاں مبارک ہوں۔ ماہنامہ نئے افق بابت ماہ اگست 2012ء کا سرسری طور پر ایک جائزہ ضرور لیا گیا اور محبت نامہ بھی ادارہ نئے افق کو لکھ کر ارسال کیا جارہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا مطالعہ نہیں کیا جاسکا کیونکہ یہ بہت دیر سے موصول ہوا تھا۔

جناب عمر اسرار صاحب کی محفل خوش بوئے سخن اور عفان احمد صاحب کی ذوق آگہی کے سلسلہ میں بس اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ دونوں محفلیں ہر اعتبار سے ایک مقابلہ کا رنگ سجائے ہوئے پڑھنے والے اور ان محفلوں میں شامل ہونے والوں کا مقابلہ کرواتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ باقی ہماری طرف سے عمر اسرار صاحب زوبین احمد صاحب اور عفان احمد صاحب کو دلی سلام دعا اور مبارک باد کا پیغام عرض ہے۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد۔ شروع اللہ کے بابرکت نام سے جو دلوں کے بھید سے باخوبی واقف ہے اور کائنات کی ہر ذی روح کی لحہ لحہ خبر رکھتا ہے اور ہمارے ہر اچھے برے اعمال سے واقف ہے اور اس قادر مطلق سے عاجزی کے ساتھ دعا ہے کہ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے آمین۔ جب تک نئے افق مارکیٹ میں آئے گا عید بھی آجائے گی۔ اس لیے میری طرف سے سب بہنوں بھائیوں کو عید مبارک اور وہ بھی خلوص دل سے گھبرائیں نہیں عیدی نہیں لوں گا۔ اگست کا شمارہ بہت ہی عمدہ تھا۔ کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ گفتگو میں طاہرہ جبیں تارا، ریاض بٹ، عصمت اقبال، نیا چہرہ حیدر (خوش آمدید) اور جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی یار نام تھوڑا کم کرو قلم کی سیاہی ختم ہو جاتی ہیں لکھتے لکھتے۔ بہر حال تبصرہ خوب رہا۔ اور آپ کی سچ بیانی سے مس آنچلو کو غصہ آ گیا ہوگا ذرا ہوشیار رہنا۔ سید عبداللہ شاہد بھائی کمال ہے آپ نے تو چیونٹم سے بھی کام نکلوالیا۔ بہت خوب تبصرہ بہت جاندار تھا محمد اسلم جاوید، ریاض حسین قمر، عبدالمالک کیف، محمد فہد جتوئی یار حاضری لگوالیا کرو غائب ہو جاتے ہو۔ سب دوستوں کو سلام محبت اسماء الحسنیٰ واقراء سے مستفید ہوئے۔ خوش بوئے سخن کو بے تابی سے دیکھا مگر اپنی شاعری نہ پاکر (کچھ بھی نہیں ہوا) ہاں تو ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں۔ عمران قریشی صاحب آپ سے شکوہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ دو چار مہینوں سے میرا مواد (علاوہ لیٹر) شائع نہیں ہو رہا ہے اور میری ایک تجویز بھی ہے اور مجھے امید ہے دوسرے دوست بھی اس سے متفق ہوں گے کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے "ناقابل اشاعت" تحریروں کے بارے میں ایک پیج شائع کیا کریں تاکہ ہمیں اپنی ان تحریروں کے بارے میں آگاہی ملے کہ یہ ناقابل اشاعت ہیں تاکہ ہم ان تحاریر کے شائع ہونے کے انتظار کی کوفت سے بچ سکیں۔ ایک بار پھر سب پاکستانیوں، دیار غیر میں بسنے والوں کو اور نئے افق پڑھنے والوں کو دلی عید مبارک۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ اچھے عمران جی سلامت تاقیامت السلام علیکم! رمضان کے بابرکت مہینے میں نئے افق ساتھ دے رہا ہے اور اس بار بھی پوری قوم مہنگائی کی چکی میں پس رہی ہے۔ نئی سے نئی پریشانی کا ہر روز قوم کو سامنا ہے۔ ان حکمرانوں سے کوئی بھی اچھائی کی امید نہ رکھی جائے۔ گفتگو میں عمران جی آپ نے مسلمانوں کے قتل عام کا ذکر کیا ہوا اور یہ تو ہر دور میں آرہا ہے۔ مسلمانوں کو کبھی بھی کہیں صحیح معنوں میں خوش آمدید نہیں کہا گیا۔ آج کل برما میں 30 لاکھ مسلمان اپنی بدقسمتی اور حکمرانوں کے ظالمانہ رویہ سے زندگی سے بے زار ہو چکے ہیں اور مزے کی بات کہ بنگلہ دیش نے اپنے ہی جیسے مسانوں پر ہر طرح کی امداد اور دروازے بند کر دیے ہیں۔ کچھ خاندان تھائی لینڈ ہجرت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ طاہرہ جبیں تارا، نیا چہرہ زبردست تھا اور یہ ریاض بٹ صاحب آپ نے تو ہمیں یاد تک نہ کیا۔ عصمت اقبال عین کا تبصرہ بھرپور تھا سبع پورے ایک واقعہ کے۔ محمد اسلم جاوید ریاض حسین قمر نے مختصراً اچھے تبصرے کیے اور عبدالمالک کیف کا بھی تبصرہ تھا مگر ہمارا ذکر تک نہیں کیا۔ محمد فہد نے تبصرہ خوب لکھا اور ناز سلوش ذشے کو فرمائش بھی کر ڈالی فہد ضرور آیا کریں اور یاد رکھنے کا شکریہ۔ سید عبداللہ شاہد کا خوب تفصیلاً تبصرہ تھا۔ آپ کی ذات میں تضاد دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ آپ لکھتے ہیں کہ اطمینان قلب کے لیے درود ابراہیمی کا ذکر کرتا ہوں تو طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے اور اوپر آپ فرما رہے ہیں نہ زندگی ان تین طریقوں سے آرام اور خوشگوار طریقے سے گزارا جاسکتا ہے۔ عورت، موسیقی اور مطالعہ بھئی عورت تو ٹھیک ہے کہ بیوی کے روپ میں اللہ کی نعمت اور مطالعہ بھی بہترین عادت ہے مگر موسیقی کیوں؟ درود پڑھا کریں اور موسیقی کو دفعہ کریں کہ آج کل کی موسیقی اور پچھلی بھی قطعاً حرام ہے آپ کی طبیعت میں یہ ہی تضاد آپ کو بے چین رکھتا ہے۔

دنیاوی لوگوں کو ہمیشہ نظر میں نہ رکھیں بلکہ نیک اور اچھے لوگوں کی پیروی کرنے کی کوشش کیا کریں اور اللہ سے اچھائی کی دعا کیا کریں۔ اللہ سے اچھائی سے اچھائی کی دعا کیا کریں۔ تمام سلسلے بے حد اچھے ہیں۔ سچی کہانیاں بے حد اچھی، بے حد دل چسپ، بے حد سبق آموز اور الفاظ کی چاشنی سے بھرپور رہیں اور وکٹری اسٹینڈ پر نمبر ون پر نقد جاں (خدیجہ احمد) رہی۔ کیا کہانی ہے اور اتنی جرأت اور ذہانت والی صنف نازک بھی ہیں اور بہترین پلاننگ اور عقل مندی سے تمام عمل کرنے سے رشیدہ ایک مضبوط اور مردوں کی عقل کو ٹھکانے لگانے والی ہستی بن کر سامنے آئی ویری گڈ۔ ریاض بٹ نے محبت کی سیڑھی پر چڑھ کر خوب جاسوسی کہانی لکھی۔ زین نقوی کا قلم تو انتہائی منجھے ہوئے اور الفاظ پر پوری گرفت ہونے کا ثبوت دے رہا ہے زبردست زین بھئی۔ "عبادت" یقیناً دوسرے نمبر پر کتنی خوب صورت اور دل کو موہ لینے والی نوشاد عادل کے انمٹ قلم سے نکلی کہانی ہے اور کاش یہ تمام عورتیں جو اپنی ہی جنس کی تباہی کا سبب بنتی ہیں شہلا کے کردار سے سبق سیکھیں یہ تیسرے نمبر کی عابد بیگ کی کاوش ہے اور ناظم بخاری کی نٹ کھٹ بھی زبردست تھی۔ بدیسی کہانیوں میں دونوں یعنی جرم لاشعور اور دوراندیش خلاف توقع ایکسٹرا زبردست رہیں مگر افسوس کہ واجد نگینوی نے 1965ء کی جنگ کے بعد ایسی کئی کہانیاں کرنل اور میجر کے رینک والوں کی لکھی گئیں کسی میں دونوں ٹانگیں نہ تھیں کسی میں دائیں بازو اور بائیں ٹانگ نہ تھی اسی طرح کئی دفعہ اس طرز کی کہانیاں پڑھیں۔ واجد صاحب نے انہی کو پڑھ رکھا ہے اور جنرل کے روپ میں سرقہ کر کے یہ جرنیل لکھ دیا۔ عمران جی کیا نیا ہے؟ آپ کے لیے لمحہ فکریہ۔ دونوں ناول خالی دامن تو پھر بھی دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب رہا اور اعظم صاحب کے پاس اچھا آئیڈیا تھا۔ مگر حصار بالکل پسند نہیں آئی۔ وجہ بے وجہ تشریحات اور وعظ جیسے الفاظ نے بور کیا۔ عبداللہ کے ساتھ ایک حادثہ گزرا تو اسی کو ہر کہانی کا موضوع بنا کر عورت ذات کو خوب کوستے ہیں اور اپنی ذاتی بھڑاس کہانی کے کردار پر اتارتے ہیں اور عورت بھی بیوی کے روپ میں اپنی اولاد کے لیے جنت کا دروازہ ہوتی ہے بھئی یہ آپ کیوں بھول جاتے ہیں۔ آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ ماں باپ کی انتہائی نافرمانی کی وجہ سے آپ کو یہ حادثہ پیش آیا پھر یہ عورت کے خلاف دوسری باتوں کا اتنا کھیر چرچا کیوں؟ اب ہر ایسے حادثے میں صرف عورت یہ سو فیصد قصوروار نہیں ہوتیں امید ہے کہ آگے آپ ذرا مختصر اور عورت کو کوسے دیے بغیر نئے افق کے صفحات پر جلوہ گر ہوں گے۔ ویسے ایک مشورہ ہے کہ شبنمی ارشاد کی تحریر بڑے ہی غور سے پڑھا کریں خوب سیکھیں گے۔ امید واثق کہ اگر آپ کو میری کوئی بات ذہن پر بار گزری ہو تو میں تمام قارئین کو گواہ بنا کر معذرت خواہ ہوں۔ مستقل سلسلوں میں گردش حسب معمول زبردست جا رہی ہے اور قارئین کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے۔ بازی گر تو مجھے اپنے معیار کی نہیں لگتی حسام بٹ اچھا لکھتے ہیں مگر...... ! خیر کئی قارئین پسند کرتے ہیں تو چلنے دیں۔ روحانی مسائل میں انداز اً نوے فیصد تو صنف نازک کی رشتہ ملے نہ ملے شادی ہو نہ ہو وغیرہ کے حسب معمول مسائل ہی سے بھرا جاتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ خوش بوئے سخن میں عام غزل، نظم میں ماہ نور خانزادہ نمبر ون پر ہیں محمد اسلم جاوید سیکنڈ اور ریاض حسین قمر تیسرے نمبر پر بڑی کامیاب کاوش تھی ان کی۔ آزاد نظموں میں ریحانہ سعیدہ بے حد اچھا لکھ کر ٹاپ پر رہی پھر عصمت اقبال عین اور فرحانہ عارف، یہ بہت زبردست تینوں کی کاوشیں تھیں۔ ہاں میثم علی آغا سب سے مختلف اور مجموعی طور پر ٹاپ پر رہی۔ ذوق آگہی میں ڈر اور پیار اور مشاہیر کی ولادت میری کاوش کو شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیا۔ جی ہاں اس دفعہ طویل تبصروں کا دنگل کروایا گیا۔ اسی لیے بہت سے ساتھی محروم رہے۔ ہمارے محمد بخش صابر لنگاہ اینڈ پیدران غائب تھے۔ باقی آکاش بخاری، ناظم بخاری، ارشاد صاحب، شبنمی ارشاد، شہناز بانو صاحبہ، ناز سلوش ذشے اور جو یاد نہیں آرہے سب کو آنے کی کھلی اجازت ہے۔ میری طرف سے سب قارئین اور عمران احمد صاحب کو عید مبارک۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

.....اس سلسلہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں ذیل میں پڑھیے:۔

(۲۳۷)

(ترجمہ) حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ بندہ مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے اس کے ہر معاملہ اور ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اگر اس کو خوشی اور راحت و آرام پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ (اس کو بھی اپنے حکیم و کریم رب کا فیصلہ اور اس کی مشیت یقین کرتے ہوئے) اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے سراسر خیر اور موجب برکت ہوتا ہے۔

(مسلم)

(تشریح) اس دنیا میں تکلیف اور آرام تو سب ہی کے لیے ہے لیکن اس تکلیف اور آرام سے اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنا یہ صرف ان اہل ایمان ہی کا حصہ ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ایمانی رابطہ قائم کر لیا ہے کہ وہ چین و آرام اور مسرت و خوشی کی ہر گھڑی میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور جب کسی رنج اور دکھ میں مبتلا کیے جاتے ہیں اور کوئی ناخوشگواری ان کو پیش آتی ہے تو وہ بندگی کی پوری شان کے ساتھ صبر کرتے ہیں..... اور چونکہ دکھ سکھ اور خوشی و ناخوشی ایسی چیزیں ہیں جن سے انسان کی زندگی کسی وقت بھی خالی نہیں رہتی اس لیے ان بندگان خدا کے قلوب بھی صبر و شکر کی کیفیات سے ہمہ دم معمور رہتے ہیں۔

(۲۳۸)

(ترجمہ) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ:۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے فرزند آدم! اگر تو نے شروع صدمہ میں صبر کیا اور میری رضا اور ثواب کی نیت کی تو میں نہیں راضی ہوں گا کہ جنت سے کم اور اس کے سوا کوئی ثواب تجھے دیا جائے۔

(ابن ماجہ)

(تشریح) جب کوئی صدمہ کسی آدمی کو پہنچتا ہے تو اس کا زیادہ اثر ابتدا ہی میں ہوتا ہے ورنہ کچھ دن گزرنے کے بعد تو وہ اثر خود بخود بھی زائل ہو جاتا ہے اس لیے صبر دراصل وہی ہے جو صدمہ پہنچنے کے وقت اللہ تعالیٰ کا خیال کر کے اور اس کی رضا اور ثواب کی امید پر کیا جائے اسی کی فضیلت ہے اور اسی پر ثواب کا وعدہ ہے بعد میں طبعی طور پر جو صبر آ جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان فرمایا ہے کہ جو صاحب ایمان بندہ کسی صدمہ کے پہنچنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب کی نیت سے صبر کرے گا تو اللہ اس کو جنت ضرور عطا فرمائے گا اور جنت کے سوا اور اس سے کم درجہ کی کوئی چیز اس کے صبر کے ثواب میں دینے پر خود اللہ تعالیٰ راضی نہ ہوں گا..... اللہ اکبر! کس قدر کریمانہ انداز ہے براہ راست بندہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اے ابن آدم جب تجھے میرے تقدیری حکم سے کوئی صدمہ پہنچے اور تو اس وقت میری رضا اور ثواب کی امید پر اس صدمہ کا استقبال صبر سے کرے تو تجھے جنت دیئے بغیر میں راضی نہ ہوں گا..... گویا اس صبر کی وجہ سے بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ایسا خاص تعلق ہو جائے گا کہ اس بندہ کو جنت دیئے بغیر اللہ تعالیٰ راضی اور خوش نہ ہوں گے۔

(ف) جب کسی بندہ خدا کو کسی قسم کا کوئی صدمہ پہنچے تو اگر اس وقت اس حدیث کو اور اللہ تعالیٰ کے اس کریمانہ وعدہ کو یاد کر کے صبر کر لے تو انشاءاللہ اس صبر میں ایک خاص لذت اور حلاوت ملے گی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یقیناً جنت بھی عطا ہوگی۔

(۲۳۹)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:۔ جو بندہ کسی جانی یا مالی مصیبت میں مبتلا ہو اور وہ کسی سے اس کا اظہار نہ کرے اور نہ لوگوں سے شکوہ شکایت کرے تو اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے کہ وہ اس کو بخش دیں گے۔ (معجم اوسط طبرانی)

(تشریح) صبر کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنی مصیبت اور تکلیف کا کسی سے اظہار بھی نہ ہو اور ایسے صابروں کے لیے اس حدیث میں مغفرت کا پختہ وعدہ کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی بخشش کا ذمہ لیا ہے..... اللہ تعالیٰ ان مواعید پر یقین اور ان سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۲۳۹)

(ترجمہ) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی (حضرت زینب رضی اللہ عنہا) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہلا کے بھیجا کہ میرے بچے کا آخری دم ہے اور چل چلاؤ کا وقت ہے لہٰذا آپ اس وقت تشریف لے آئیں آپ نے اس کے جواب میں سلام کہلا کے بھیجا اور پیام دیا کہ یہی اللہ تعالیٰ کسی سے جو کچھ لے وہ بھی اسی کا ہے اور کسی کو جو کچھ دے وہ بھی اسی کا ہے الغرض ہر چیز ہر حال میں اسی کی ہے (اگر کسی کو دیتا ہے تو اپنی چیز دیتا ہے اور کسی سے لیتا ہے تو اپنی چیز لیتا ہے اور ہر چیز کے لیے اس کی طرف سے ایک مدت اور وقت مقرر ہے۔ (اور اس وقت کے آ جانے پر وہ چیز اس دنیا سے اٹھائی جاتی ہے) پس چاہیے کہ تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس صدمہ کے اجر و ثواب کی طالب بنو صاحبزادی صاحبہ نے پھر آپ کے پاس پیام بھیجا اور قسم دی کہ اس وقت حضور ضرور ہی تشریف لے آئیں۔ پس آپ اٹھ کر چل دیئے اور آپ کے اصحاب میں سے سعد بن عبادہ اور معاذ بن جبل اور ابی بن کعب اور زید بن ثابت اور بعض اور لوگ بھی آپ کے ساتھ ہو لیے پس وہ بچہ اٹھا کر آپ کی گود میں دیا گیا اس کا سانس اکھڑ رہا تھا اس کے اس حال کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اس پر سعد بن عبادہ نے عرض کیا: حضرت یہ کیا؟ آپ نے فرمایا کہ:۔ رحمت کے اس جذب کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا ہے اور اللہ کی رحمت ان ہی بندوں پر ہوگی جن کے دلوں میں رحمت کا یہ جذبہ ہو (اور جن کے دل سخت اور رحمت کے جذبے سے بالکل خالی ہوں وہ خدا کی رحمت کے مستحق نہ ہوں گے۔)

(بخاری و مسلم)

(تشریح) حدیث کے آخری حصے سے معلوم ہوا کہ کسی صدمہ سے دل کا متاثر ہونا اور آنکھوں سے آنسو بہنا صبر کے منافی نہیں صبر کا مقتضیٰ صرف اتنا ہے کہ بندہ مصیبت اور صدمہ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت یقین کرتے ہوئے اس کو بندگی کی شان کے ساتھ انگیز کرے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور اس کا شاکی نہ ہو اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود کا پابند رہے۔ باقی طبعی طور پر دل کا متاثر ہونا اور آنکھوں سے آنسو بہنا تو قلب کی رقت اور اس جذبہ رحمت کا لازمی نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کی فطرت میں ودیعت رکھا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت ہے اور جو دل اس سے خالی ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ رحمت سے محروم ہے سعد بن عبادہ نے حضور کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر تعجب کے ساتھ سوال اس لیے کیا کہ اس وقت تک ان کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ دل کا یہ تاثر اور آنکھوں سے آنسو گرنا صبر کے منافی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)

بلاوا

خورشید پیر زادہ

مافوق الفطرت واقعات' قصے کہانیاں اور ان پر بنائی جانے والی فلمیں تاریخ کے ہر دور میں انسانی ذہنوں پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ زیر کہانی ایک خواب سے شروع ہوتی ہے جو آگے چل کر کئی نئے موڑ لے کر آپ کو حیران کرے گی۔

نئے افق کے تجسس پسند قارئین کے لیے بطور خاص ایک سنسنی خیز ناول

"ارے یہ کیا تھا؟" روہن نے اچانک ہی آس پاس کی گھنی جھاڑیوں سے اپنی جانب اچھل کر آتے گلہری نما جانور کو دیکھ کر تیزی سے ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔ گلہری نما جانور جس طرح سے اچھلا تھا اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا وہ ان پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔

"تو نے اس کے دانت دیکھے؟" پرکاش نے روہن کی طرف سراسیمگی کے عالم میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... مگر سمجھ نہیں آیا کہ یہ تھی کیا چیز؟"

دس فٹ لمبی چھلانگ لگاتے ہوئے وہ جانور دوسری طرف کی جھاڑیوں میں کھو گیا۔ دونوں کچھ پل کے لیے وہیں کھڑے ہو کر اس عجیب و غریب گلہری کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتے رہے۔ اور پھر سے اپنی انجان منزل کی طرف بڑھنے لگے۔

"اف کہاں لے آیا یار؟ کتنا سناٹا ہے یہاں۔ یہاں تو نہ آدم نہ آدم زاد۔ کتنا عجیب سا لگ رہا ہے یہاں سب کچھ۔ تجھے لگتا ہے کہ یہاں تیری نیرو مل جائے گی؟ دیکھ مجھے تو لگتا ہے کہ کسی نے تجھے الو بنایا ہے۔ کیوں بلاوجہ اپنے ساتھ میری بھی رات برباد کر رہا ہے۔ چل واپس چلتے ہیں۔" پرکاش نے یہ کہتے ہوئے حفاظت کے ارادے سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

"ایسی بات نہیں ہے یار وہ یہیں رہتی ہے آس پاس۔ دیکھنا کوشش کریں گے تو وہ ہمیں ضرور مل جائے گی۔ اگر وہ نہ ملی تو میں پاگل ہو جاؤں گا یار۔" روہن نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس کے آگے پرکاش بہت چوکنا ہو کر چل رہا تھا' چوکنا ہونا لازمی بھی تھا۔ جہاں اس وقت وہ تھے اس جگہ کے آس پاس کوئی شہر یا گاؤں نہیں تھا۔ ہر طرف سناٹے کی بھیانک چادر پھیلی ہوئی تھی۔ اس سناٹے میں اگر ان دونوں کے علاوہ کوئی آواز تھی تو وہ تھی جھینگروں اور مینڈکوں کے ٹرٹرانے کی اور رہ رہ کر جھاڑیوں کے اندر کچھ رینگنے کی۔ دور دور تک کسی بھی قسم کی روشنی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ بس آدھے چاند اور ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی مدھم سی روشنی تھی، جو انھیں راستہ دکھا رہی تھی۔

راستہ بھی ایسا جو نہ ہونے کے برابر تھا۔ کہیں اونچا، کہیں نیچا۔ بیچ بیچ میں گہرے گہرے گڑھے۔ اتنے گہرے کہ دھیان سے نہ چلا جائے تو اچانک آدمی ان میں غائب ہو جائے۔ راستے کے دونوں طرف چار چار فٹ اونچی جھاڑیاں تھیں۔

"یار راستہ صاف ہوتا تو گاڑی ہی لے آتے۔ تجھے کیا لگتا ہے؟ یہاں پر کوئی انسان رہتا ہوگا اور وہ بھی لڑکی...... سچ بتانا' خود تجھے ڈر نہیں لگ رہا یہاں کا ماحول دیکھ کر۔" پرکاش نے چلتے چلتے روہن سے سوال کیا۔

"ڈر لگ رہا ہے' تبھی تو تمہیں ساتھ لے کر آیا ہوں' نہیں تو میں اکیلا ہی نہ چلا آتا۔" روہن نے جواب دیا اور اچانک ہی اچھل پڑا۔ "پرکاش دیکھ آگے پکی سڑک دکھائی دے رہی ہے۔ میں نہ کہتا تھا' ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ آگے ضرور کوئی بستی ملے گی۔ دیکھ لینا۔"

"ابے بستی کے بچے! اس سے کوئی ڈھنگ کا راستہ بھی تو پوچھ سکتا تھا تُو۔ آخر وہ لوگ بھی تو شہر آتے جاتے ہوں گے؟" پرکاش کو بھی آگے کا راستہ پچھلے راستے کے مقابلے میں بہتر دیکھ کر کچھ امید سی بندھی۔

"یار کیا کروں' یہی ایک راستہ بتایا تھا اس نے۔" روہن نے تیزی سے پرکاش کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے کہا۔

"عجیب محبوبہ ہے تیری۔ ایک تو رات میں ملنے کی ضد کر بیٹھی اور اوپر سے راستہ بھی ایسا بتایا۔ چل دیکھ ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔ ادھر لائٹ دکھائی دے رہی ہے۔" پرکاش نے اپنی بائیں طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں بائیں طرف مڑے ہی تھے کہ اچانک ٹھٹک گئے۔

"یہاں تو پانی ہے یار۔" روہن نے اپنے قدم واپس کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہوں...... کوئی تالاب لگتا ہے۔ چل آگے سے راستہ ہوگا۔" پرکاش نے روہن سے کہا اور دونوں پھر سے سیدھے راستے پر چل پڑے۔ کچھ آگے جا کر ان کو ایک پگڈنڈی سی بائیں جانب جاتی دکھائی دی۔ دونوں نے اس راستے پر جانے پر اتفاق کیا اور تیزی سے اس طرف بڑھنے لگے۔

"ابے تیری...... یہاں تو کیچڑ ہے۔ چل واپس چل' یہ راستہ نہیں ہے۔" دل ہی دل میں پرکاش اس لڑکی کو سو صلواتیں سنا رہا تھا، جس کے پیار میں پاگل روہن اپنے ساتھ ساتھ اس کی بھی درگت بنا رہا تھا۔

"یار آدھا راستہ تو طے کر چکے ہیں آگے چل کر تالاب میں پیر دھو لیں گے۔" روہن نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "اب وہ لائٹ بھی نزدیک ہی دکھائی دے رہی ہے۔"

"چل سالے اگر پھر بھی لڑکی نہیں ملی تو دیکھ لینا۔ ایسی بکواس جگہ میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" بڑبڑاتے ہوئے پرکاش پھر سے روہن کے آگے آگے چلنے لگا۔

"دیکھی کیوں نہیں ہے۔ تُو تو ماسٹر ہے ایسے ٹھکانوں کا' آدھی زندگی تو تُو نے جنگلوں میں ہی گزاری ہے۔ مجھ پر احسان کرنے کے لیے بول رہا ہے کیا؟" روہن نے اس پر پھبتی کستے ہوئے کہا۔

"ہاں گزاری ہے۔ مگر ایسے تھوڑی ہی۔ پورے بندوبست کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ تُو تو مجھے ایسے لے آیا ہے جیسے ہم ان کے داماد ہیں اور ہمارے انتظار میں وہ کسی ایئر پورٹ پر پلکیں بچھائے کھڑے ہوں گے۔ خدا جانے کس گھڑی کون سا جانور باہر نکل آئے؟ وہ تو اچھا ہوا کہ میں کم سے کم اپنا ریوالور ساتھ رکھتا ہوں۔ کوئی بھروسا ہے ایسی سنسان جگہ کا۔" پرکاش سنبھل سنبھل کر پیر رکھتے ہوئے بولا۔ دونوں کی پینٹ کیچڑ کے چھینٹوں سے گھٹنوں تک خراب ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد انھیں زیادہ دیر تک چلنا نہیں پڑا۔ کچھ دور چلنے پر وہ ایک صاف ستھرے راستے پر پہنچ گئے۔ راستہ پرانے زمانے کی چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ وہ جگہ کوئی چوراہا لگ رہی تھی۔ پانی کا تالاب یہاں تک بھی پھیلا ہوا تھا۔

"چل پیر صاف کر کے آگے چلتے ہیں۔ اب وہ گھر بھی زیادہ دور نہیں لگتا۔" روہن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا' پھر دونوں نے تالاب کے پانی سے اپنے پیر دھوئے اور دوبارہ سے آگے بڑھ گئے۔

"یار یہاں گلیاں اور دیواریں تو اتنی دکھائی دے رہی ہیں، مگر گھر کہاں ہیں؟ کیا اس گاؤں میں وہ ایک ہی گھر ہے جہاں لائٹ جل رہی ہے۔" پرکاش نے حیرانی سے روہن کی طرف دیکھا۔

"میں نے پوچھا نہیں یار! کیا پتا ایک ہی ہو۔ چل تو چلتا رہ۔" روہن نے کھسیا کر بے تکا سا جواب دیا اور اپنے پیار کو پانے کی اُمید میں آگے بڑھتا رہا، پرکاش کے ساتھ ساتھ۔ دونوں کو بڑے ہی عجیب ماحول سے سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد بھی وہ روشنی ان سے اب تک اتنی ہی دور لگ رہی تھی۔ انہوں نے گلیاں بھی بدلیں، مگر ہر بار کچھ دور چلتے ہی پھر سے وہ روشنی ٹھیک ان کے سامنے آ جاتی۔ اور انہیں پھر سے اسی راستے پر چلتے رہنے کا احساس ہوتا۔

"دھت تیرے کی۔ . دیکھ روہن! مجھے تو یہ سب کچھ گڑبڑ لگ رہا ہے۔ بھلا ایسی جگہ پر بھی آج کل کوئی گھر بناتا ہے کیا...... وہ لڑکی سچ میں یہاں ہوگی؟" پرکاش تھک ہار کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے ہاں نا بھائی۔ تو میرا ... ارے ... دیکھ بچہ۔" روہن ایک دم اچھل پڑا۔ روہن کی بات سنتے ہی پرکاش کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"بچہ! رات کے گیارہ بجے...... گھر سے باہر۔ وہ بھی ایسی سنسان جگہ پر؟ آخر تم مجھے صاف صاف بات کیوں نہیں بتا دیتے کون ہے وہ لڑکی، یہاں آخر کرتے کیا ہوں گے اس کے گھر والے؟" پرکاش کا دماغ چکرانے لگا تھا، جو کچھ وہاں رونما ہو رہا تھا وہ سب اسے بالکل عجیب سا لگ رہا تھا اور ماحول کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس کرنا لازمی تھا۔

روہن نے کچھ بولے بغیر پرکاش کا ہاتھ پکڑا اور اس بچے کی طرف لپکا۔ دیوار کے ساتھ کھڑا وہ بچہ جھک کر کچھ کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں اس کے قریب پہنچے تو وہ پلٹ کر مسکرانے لگا۔ بڑا ہی معصوم سا بچہ تھا۔ تقریباً آٹھ سال کی عمر ہوگی اس کی۔ دونوں اس کی شکل دیکھتے ہی حیران رہ گئے۔ اس کے چہرے پر ایسا لگتا تھا جیسے کسی گھاؤ کا نشان بنا ہوا ہو، تازہ گھاؤ۔ اس کے ہونٹوں کے پاس سے خون رس رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری چمک تھی اور چہرے پر عجیب سا میلا پن۔ دونوں اس سے کچھ دوری پر ٹھٹک گئے۔ بچہ ان کی طرف پلکیں جھپکائے بغیر مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت کا کوئی تاثر تھا اور نہ کسی طرح کا خوف تھا، مگر آنکھوں کی تیز چمک میں بھی عجیب سے سونے پن نے انھیں چونکا دیا۔

پرکاش نے اس سے فاصلہ رکھتے ہوئے پوچھا ۔ "یہاں کیا کر رہے ہو بیٹا۔ اتنی رات کو؟"

"اپنے پیروں کی کیچڑ صاف کر رہا ہوں انکل۔" بچے نے بڑی ہی معصومیت سے جواب دیا۔ اس کی آواز اور بات کرنے کے ڈھنگ سے ان کو کہیں سے بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ اس کی عمر چار سال سے اوپر ہوگی۔ حالاں کہ قد کاٹھ کے حساب سے وہ سات آٹھ سال کا بچہ نظر آ رہا تھا۔

"یہاں کوئی تیرو رہتی ہے؟ بتا سکتے ہو کہ اس کا گھر کون سا ہے؟" روہن کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ یہاں تو سب کچھ عجیب ہی ہو رہا تھا۔

بچے نے انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں۔ ہم سب وہیں رہتے ہیں۔ اس حویلی میں۔"

"مطلب۔ مطلب وہ تمہاری کچھ لگتی ہے کیا؟" روہن کو رہ رہ کر جھٹکے لگ رہے تھے۔

"مگر اس حویلی کا راستہ کہاں سے ہے۔ ہم تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے ہیں اور تم گھر کیوں نہیں گئے اب تک یہاں کیا کر رہے ہو؟" پرکاش نے بچے سے سوال کیا۔

"میں کھو گیا ہوں انکل۔ مجھے بھی راستہ نہیں مل رہا، بہت عرصے سے ڈھونڈ رہا ہوں۔" لڑکے نے اتنی ہی معصومیت سے جواب دیا۔

"بہت عرصے سے؟ کیا مطلب؟ کب سے ڈھونڈ رہے ہو؟" بچے کے ہر جواب سے دونوں کے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

"...ے سال سے۔" بچے نے پر اسرار لہجے میں جواب دیا۔ روہن اور پرکاش کو ایسا لگا کہ اُن کے کانوں پر کوئی بم دھماکے سے پھٹا ہو۔ اُن دونوں کو ایسا لگا کہ ہوا میں ایک دم تیزی آ گئی ہے اور بہت سی سرگوشیاں اُن کے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ دماغ بھاری ہونے لگے تھے۔ اُنھوں نے چکراتے ہوئے دماغ کے ساتھ بچے کی جانب دیکھا وہ بڑے پر سکون انداز میں معصومیت سے اُنھیں تک رہا تھا۔ بچے کے جواب کی بازگشت بار بار اُن کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ پرکاش نے چیخنا چاہا مگر اس کے حلق میں کانٹے سے اُگ آئے تھے اور آواز کی چادر اُن کانوں میں اُلجھ کر تار تار ہو گئی تھی۔

"بھاگ پرکاش بھاگ ... نہیں تو مارے گئے۔" روہن نے بھاگنے کے لیے پرکاش کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، مگر نہ جانے کیوں پرکاش وہاں سے ہل نہیں پا رہا تھا۔ شاید گومگو کی کیفیت میں تھا۔

"تم کیوں مذاق کر رہے ہو تم کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟"

اس بار لڑکے کے چہرے پر شکنیں اور صدیوں پرانی تڑپ ابھر آئی۔ "میں مذاق کیوں کروں گا۔ مرے ہوئے لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔"

روہن کی گھگھی بندھ گئی۔ جس طرح کے حالات وہاں پیش آ رہے تھے اور جس طرح سے وہ بچہ انہیں ملا اور جو کچھ اس نے کہا۔ دونوں کے کلیجے باہر نکل آنے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ روہن کو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے یوں پاگل پن میں یہاں آ کر کتنی بڑی بھول کی ہے۔ وہ کھڑے پیر وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا، لیکن پرکاش کو وہاں چھوڑ کر کیسے بھاگے۔ وہ بس پرکاش کے اشارہ کا انتظار کر رہا تھا۔ جس نے گھبراہٹ میں اپنا ریوالور اس بچے پر تان لیا تھا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"کیوں؟" ننھے سے بچے کے چہرے سے نادانی اور معصومیت ٹپک رہی تھی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

"انکل آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں نا۔ مجھے گھر نہیں مل رہا ہے۔" بچے نے سادگی سے درخواست کی۔

اس بچے کی صرف یہ پیاری سی آواز ہی تھی، جو اب تک انہیں پیروں پر کھڑے رہنے کی ہمت دے رہی تھی، مگر آگے بڑھنے کی تو بات سوچنا بھی دشوار تھا۔ پرکاش نے روہن کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر وہ برق رفتاری سے اُلٹے پاؤں بھاگ لیے۔ بچہ اپنی جگہ ساکت وجامد کھڑا اُنھیں بھاگتے دیکھتا رہا۔ اُس نے اُن دونوں کے تعاقب میں آنے کی کوشش نہیں کی۔

کافی دور تک روہن اور پرکاش یونہی ہوشیاری سے پیچھے دیکھتے ہوئے بھاگتے رہے۔ جب بچہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تب جا کر روہن اور پرکاش نے سکون کی سانس لی۔

"راستہ یاد ہے نا بھائی؟" روہن نے پوچھا۔

"سیدھا چلتا رہ، ورنہ اپنی بک بک بند رکھ تھوڑی دیر۔" پرکاش نے غصے سے اسے جھڑک دیا۔

اس کے بعد انہوں نے کیچڑ والے راستے ...

ہوتے ہوئے سڑک پر جا کر ہی دم لیا۔ تب تک وہ سانس بھی گن گن کر لے رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اب مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ بھی اُنھیں بھوت نگری کے پراسرار سنگیت سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ جھاڑیوں میں ذرا سی بھی سرسراہٹ ہوتی تو دونوں کی سانسیں رکنے لگتی تھیں۔ وہ ہانپتے کانپتے آخرکار اپنی کار تک پہنچ ہی گئے۔ پیدل جاتے ہوئے جہاں انھیں ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگا تھا۔ واپسی میں آدھا گھنٹہ بھی نہیں لگا۔

"ابے کہاں موت کے منہ میں لے آیا تو مجھے۔" پرکاش نے گاڑی اسٹارٹ کر کے پسینے میں تر اپنا چہرہ پونچھا۔

"سوری یار۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ۔" روہن اب بھی ڈھنگ سے سانس نہیں لے پا رہا تھا۔

"سوری کے بچے یہ بتا آخر نیرو ہے کون؟ کیا چکر ہے تیرا اس کے ساتھ اور اس نے تجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟" پرکاش نے غصے سے کہا۔ اسے اس بات سے اطمینان ہو رہا تھا کہ وہ سلامت واپس لوٹ آئے تھے وہاں سے۔ گاڑی نے جیسے ہی رفتار پکڑی اس کو احساس ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے اور پھر گڑبڑ یہ ہوئی کہ گاڑی بری طرح سے لہرانے لگی۔

"ٹائر پنکچر ہو گیا ہے شاید اب کیا کریں؟" کہہ کر پرکاش نے گاڑی کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے اسے ایک سائیڈ میں روک دیا۔ روہن سہمی ہوئی نظروں سے پرکاش کو دیکھنے لگا۔

"سوری یار۔ میری وجہ سے۔"

پرکاش روہن کی بات پر دھیان دیئے بغیر گاڑی سے اترا اور ٹائر چیک کرنے لگا۔ چاروں ٹائر زمین سے لگے ہوئے تھے۔ سب کی ہوا نکلی ہوئی تھی۔

پرکاش دوبارہ گاڑی میں آیا اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "اب کیا کریں۔ ایک ٹائر پنکچر ہوتا تو اسپیئر ٹائر لگا لیتے مگر وہ تو چاروں ہی بیٹھ گئے ہیں! اگلا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟"

روہن اپنی نا سمجھی سے پرکاش کو پریشانی میں ڈال دینے کی وجہ سے شرمندہ تھا، وہ خفت آمیز لہجے میں بولا "ہوگا کوئی پانچ سات کلومیٹر دور... کیوں؟"

پرکاش اب کچھ سنبھل چکا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ غنیمت تھا کہ اس سے بھی برا جو ہونا تھا وہ نہیں ہوا۔ "وہاں تک لے چلو کسی طرح...... شاید وہاں کوئی پنکچر لگانے والا مل جائے۔"

"اتنی رات میں پنکچر والا؟"

"دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

ظاہر ہے اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پرکاش نے گاڑی دھیرے دھیرے چلانی شروع کر دی، ورنہ دھکا لگانے کی ہمت اُن میں نہیں تھی۔ کار کا سفر کچھوے کی رفتار سے طے ہو رہا تھا۔ کم از کم یہ بات اِن دونوں کے لیے باعث طمانیت تھی کہ وہ اُس آسیبی علاقے سے ہر لمحے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

گاؤں آتے ہی انہوں نے پہلے ہی گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ یہ گھر گاؤں سے باہر تھا۔ کچھ الگ ہٹ کر۔ گھر کے دروازے پر لگی مورتی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کسی ہندو کا گھر ہے۔

"یہاں پوچھتے ہیں۔ گاؤں میں کوئی نہ کوئی پنکچر لگانے والا تو ہوگا۔"

دونوں گاڑی سے اترے اور دروازے کے سامنے جا کر روہن نے دستک دی۔ تیسری دستک کے بعد اندر کچھ سرسراہٹ سی اُبھری اور پھر چپلوں کی پٹر پٹر سنائی دی، جو دروازے کے نزدیک آ کر رک گئی۔

"کون؟" گھر کے اندر سے کسی نے محتاط انداز میں

پوچھا۔ نہایت ہی میٹھی آواز نے اُن کے کانوں میں مصری سی گھول دی۔ آواز کسی نوجوان لڑکی کی لگتی تھی۔

"جی ہم مسافر ہیں۔ باہر سے آئے ہیں۔ تھوڑی مدد چاہیے۔" پرکاش نے روہن کے بولنے سے پہلے ہی جواب دے دیا۔

"بابا! وہ آ گئے۔" اندر سے اسی لڑکی کی وہی سریلی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

"وہ آ گئے؟" پرکاش نے حیرت پاش نظروں سے روہن کو دیکھا، جو بڑے گمبھیر انداز میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ یہاں اُنھیں رہ رہ کر جھٹکے لگ رہے تھے۔

پرکاش دھیرے سے بولا۔ "یہ تو ایسے کہہ رہی ہے جیسے اندر ہمارا ہی انتظار کیا جا رہا تھا۔" یہ کہہ کر دونوں ہوشیار کھڑے ہو گئے۔

"پرکاش! میں تو کہتا ہوں کہ اب بھی وقت ہے نکل چلتے ہیں یہاں سے۔ پتا نہیں آج یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔" روہن نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ چرررر کی دل دہلا دینے والی آواز کے ساتھ پرانا دروازہ کھلنے لگا۔ اس آواز میں نا جانے کیسی سریت پنہاں تھی کہ اُن دونوں کے قدم زمین میں گویا دھنس کر رہ گئے۔ ایسا لگا کہ زمین میں سے نادیدہ ہاتھوں نے انھیں جکڑ لیا ہے۔ دونوں کی سانسیں اُتھل پتھل ہو گئی تھیں اور وہ دھندلائی ہوئی نظروں سے دھیرے دھیرے کھلتے ہوئے دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

اس آواز نے انھیں ڈرا دیا تھا۔ کہتے ہیں نا دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ دروازہ کھلا تو اندر سے ہلکی پیلی روشنی کی موٹی سی لکیر باہر پڑنے لگی۔ دروازے کا پیدا ہونے والا خلا ایک انسانی وجود سے بھر گیا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ وہ کوئی لڑکی نہیں بلکہ تقریباً ساٹھ سال کا آدمی تھا۔

بوڑھے آدمی نے اوپر سے نیچے تک دونوں کو دیکھا اور بولا۔ "تم پرانے ٹیلے سے آئے ہو نا؟"

"جی کیا مطلب؟ پرانا ٹیلا...... ہم کچھ سمجھے نہیں؟" روہن نے نا سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

دونوں کی حالت دیکھنے لائق تھی۔ روہن دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ رات کسی طرح سے گزر جائے بس۔

"تمہارے پیروں میں یہ کیچڑ لگی ہے نا۔ اس لیے پوچھا۔ یہ وہیں کی کیچڑ ہے۔" بڈھے نے پیروں کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں نے ایک ساتھ ہی اپنے پیروں کو دیکھا۔ "ہاں مگر۔"

"تم خونی تالاب کے پاس سے گزر رہے ہو بیٹا! آ جاؤ اندر آ جاؤ۔" بڈھے نے تھوڑے پیچھے ہو کر اُن دونوں کے اندر آنے کے لیے راستہ بنایا۔

"جی... جی نہیں۔ شکریہ...... وہ...... ہمیں بس یہی پوچھنا تھا کہ یہاں کوئی پنکچر لگانے والا ہے ہماری گاڑی۔" روہن کے لیے ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔

"آ جاؤ اندر آ جاؤ۔" بڈھے نے روہن کا بازو پکڑا اور ہلکے سے اندر کھینچ لیا۔

روہن میں جیسے مدافعت کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ بے جان کھلونے کی طرح اس کے ساتھ اندر چلا آیا۔ اب پرکاش کے پاس بھی کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔ وہ روہن کو یوں چھوڑ کر کیسے بھاگ جاتا۔ یوں تو اب تک اس کی اپنی حالت بھی پتلی ہو چکی تھی۔ وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔

"آؤ... بیٹھو یہاں آ جاؤ۔ ارے بھائی شرما کیوں رہے ہو آؤ بیٹھو نا۔" بڈھے نے ان کو کمرے

میں لے جاتے ہوئے پوری شرافت کے ساتھ ان پر میزبانی کا حق جتایا۔ مگر شرافت اور معصومیت کے پیچھے چھپی ہوئی ہلاکت خیزی وہ گھنٹہ بھر پہلے ہی محسوس کر چکے تھے۔ اس لیے دونوں کے دل میں اُتھل پتھل جاری تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور پوری ہوشیاری برتتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگے پلنگ پر جا کر بیٹھ گئے۔ ان کی پیٹھ کے پیچھے صرف ایک سپاٹ دیوار تھی۔ وہ وہاں اس لیے بیٹھے تھے، تاکہ کمرے میں ہونے والی ہر حرکت پر نظر رکھ سکیں۔

"شروتی بیٹا! ذرا کچھ پانی لے آؤ۔ اتنی دیر کیوں لگا رہی ہو؟" بڈھے نے ان دونوں کے سامنے بیٹھتے ہوئے آواز لگائی۔

"ابھی لائی بابا۔" دوسری طرف سے وہی سریلی آواز دونوں کے کانوں میں پڑی۔

"ہاں تو...... وہاں کیا کرنے گئے تھے تم لوگ، شہری معلوم ہوتے ہو۔" بڈھے نے بڑے ہی اطمینان سے دونوں سے پوچھا۔

"جی ہم راستہ بھٹک گئے تھے۔" پرکاش نے بات کو گول مول کرتے ہوئے جواب دیا۔ یہ بتانا اس کو قطعی مناسب نہیں لگا کہ وہ کسی لڑکی کی تلاش میں اپنی ایسی تیسی کرانے گئے تھے۔

"ہوں! تم دو ہی گئے تھے یا کوئی وہیں رہ گیا؟" بڈھے نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مطلب۔ ہم دو ہی تھے بس۔" اس بار بھی پرکاش نے ہی جواب دیا۔ روہن تو چپ چاپ ہی ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ یہاں سے کب نکلیں گے۔

"بڑی بات ہے کہ تم دونوں صحیح سلامت واپس آ گئے۔" بڈھے نے گہری سانس لیتے ہوئے بیڑی سلگائی۔ "پیتے ہو کیا؟" کہہ کر بڈھے نے بیڑیوں کا بنڈل ان کی طرف بڑھایا۔

"جی نہیں شکریہ۔" پرکاش نے منع کرتے ہوئے کہا۔

اچانک روہن پلنگ سے لگ بھگ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پرکاش نے چونکتے ہوئے پہلے روہن کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے نگاہیں دروازے پر جما دیں۔

"کیا ہوا بیٹا۔ تم کھڑے کیوں ہو گئے؟" بڈھے نے روہن سے پوچھتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر ہنس کر بولا۔ "یہ میری بیٹی ہے۔ شروتی۔ آجاؤ بیٹی۔"

روہن کی سانسیں اس کے حلق میں ہی اٹکی ہوئی تھیں ابھی تک۔ دروازے سے اندر آنے والی لڑکی نیرو ہی تھی۔ وہی نیرو جس کے لیے روہن پاگل ہوا جا رہا تھا۔ خوب صورتی کی انوکھی مثال تھی وہ۔ سر سے لے کر پاؤں تک۔ چھریرا لانبا بدن، تقریباً گول سے گورے چہرے پر انوکھی کشش لیے ہوئے لمبی کجراری آنکھیں۔ گلابی رسیلے ہونٹ، صراحی دار لمبی گردن۔ اور خیر یوں کہیں کہ خوب صورتی کا رس اس کے بدن میں صرف دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا بلکہ ٹپک رہا تھا۔ اس کی معصومیت سے اس کے شرمیلے پن سے اس کے انداز سے اس کی ہر ادا سے۔ ایک بار بھی پلکیں اٹھائے بنا شروتی نے ان کے سامنے میز پر پانی رکھا اور واپس جانے لگی۔

"بیٹی کھانا بنا دینا۔ جانے کب سے بھوکے ہوں گے بے چارے۔"

"جی بابا۔ میں نے بھاجی رکھ دی ہے۔" نظریں جھکائے ہوئے ہی اس نے مڑ کر اپنے لرزتے ہونٹوں سے بات کہی اور باہر نکل گئی۔

"جی نہیں۔ ہمیں بھوک نہیں ہے۔ ہم اب بس واپس جانا چاہتے ہیں۔ آپ صرف کسی ٹائر پنکچر والے کا گھر بتا دیں۔" پرکاش نے کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔ دراصل روہن کو اس طرح چونکتے دیکھ کر پرکاش کے دماغ میں کئی سوالات اُبھر رہے تھے اور وہ جلد سے جلد باہر نکل کر ساری بات صاف کر لینا چاہتا تھا۔

"نہیں! ایسے کیسے جانے دوں گا تمہیں۔ یہ بھی کوئی جانے کا وقت ہے۔ اور اس گاؤں میں کوئی ٹائر پنکچر لگانے والا بھی نہیں ہے۔ ابھی آرام سے کھانا کھا کر سو جاؤ۔ صبح دیکھ لینا۔" بڈھے نے پرکاش کا ہاتھ پکڑ کر اس کو واپس پلنگ پر بٹھا دیا۔ پرکاش نے روہن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ اس کو اپنی منزل مل گئی ہے۔

"ٹھیک ہے انکل جی۔ جب آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو یہی صحیح۔ آپ کا یہ بڑا احسان ہوگا ہم پر۔" روہن کو جیسے منہ مانگا مل گیا۔

"اس میں احسان کی کیا بات ہے بیٹا۔ آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ کسی بات کی فکر مت کرو۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔" بڈھے نے بڑے ہی پیار سے مسکراتے ہوئے کہا۔

بڈھے کی باتوں نے دونوں کو تسلی سی دی۔ کم سے کم یہاں اب تک کچھ ایسا ویسا نہیں ہوا تھا جس سے انہیں یہاں بھی کچھ عجیب و غریب ہونے کا ڈر رہے۔

"بابا جی۔ یہ خونی تالاب کا کیا چکر ہے۔" پرکاش نے ہچکچاتے ہوئے بات چلا ہی دی۔ پرکاش کے ذکر کرتے ہی بڈھے کی آنکھیں کچھ یاد کرنے کے انداز میں سکڑ گئی تھیں۔

"اس کے بارے میں ہم گاؤں کے لوگ کسی کو بتاتے نہیں بیٹا۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ دوبارہ کبھی اس طرف بھول کر بھی مت جانا۔ اور نا ہی کسی سے اس کا ذکر کرنا۔ تم صحیح سلامت واپس آ گئے اس کے لیے بھگوان کا شکر ادا کرو۔"

"ہم کسی سے نہیں کہیں گے۔ لیکن بتانے میں حرج ہی کیا ہے۔ کچھ تو بتائیے؟" پرکاش اور روہن نے اصرار کرنے والے انداز میں پوچھا۔ وہ اُمید بھری نظروں سے بڈھے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ہوں! کسی سے بھول کر بھی اس بات کا ذکر مت کرنا۔ ہمارے بڑے کہتے تھے کہ پرانے ٹیلے کی روحیں باہر کے لوگوں سے نفرت کرتی ہیں۔ ایک بار کوئی انگریز تمہاری طرح بھٹک کر وہاں چلا گیا تھا۔ صبح اس کی لاش تالاب کے کنارے پر ملی تھی۔ اتنے بڑے بڑے کیڑے چل رہے تھے اس کی اَدھ کھائی ہوئی لاش میں۔" بڈھے نے کیڑوں کا سائز بتانے کے لیے اپنی انگلیوں کو سیدھا کر دیا۔ "لاش کا سر تو بالکل ہی غائب تھا۔ اس کے پیٹ کو چیر سا دیا گیا تھا اور دل چھاتی سے باہر لٹک رہا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس کی موت کی وجہ جاننے کے لیے انگریزوں نے وہاں ڈیرا ڈال دیا۔ بہت کوشش کی، پر کسی کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ مگر اس کے بعد اموات بہت ہوئیں۔ اور یہ ساری اموات باہر کے لوگوں کی تھیں۔ اس لیے اب ہم کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔ پڑھے لکھے لوگ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے نا۔ پھر کوئی وہاں کا راز جاننے جائے گا اور خواہ مخواہ اپنی جان سے جائے گا۔ کیا فائدہ۔" یہ کہہ کر بڈھا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

"ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے انکل جی۔ کسی سے کچھ بھی نہیں کہیں گے۔ بتائیں نا اور ایسا کیا ہے وہاں پر اور وہ خونی تالاب۔" پرکاش کا تجسس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"تم اب مانو گے نہیں پوچھے بنا۔ دراصل وہ تالاب بہت پرانا ہے۔ ہزاروں سال پرانا۔ اس کا پانی کبھی بھی نہیں سوکھتا، مگر جو وہاں سے تمہاری طرح بچ کر واپس آ جاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ رات کو تالاب کا پانی لال ہو جاتا ہے۔ خون کے جیسا لال۔ اس لیے ہم اس کو خونی تالاب کہتے ہیں۔ روحوں کے عذاب سے بچنے کے لیے گاؤں والے وہاں لگے پیپل کے پیڑ کے پاس چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ رات بھر پیڑ پر روشنی رہتی ہے۔ مگر رات میں آج تک کوئی اس کے پاس پہنچ نہیں پایا ہے۔ یا جو پہنچا ہوگا وہ مارا گیا ہوگا۔ سنا ہے وہاں ایک چھوٹے بچے کی روح بھی بھٹکتی رہتی ہے۔"

"ہاں۔" روہن بچے کے بارے میں بولنے ہی والا تھا کہ پرکاش نے اس کا ہاتھ دبا دیا اور اس نے اپنی بات پلٹ دی۔ "ہاں روحیں ہوتی ہیں۔ میں نے بھی سنا ہے۔"

"سنا کیا ہے بیٹا۔ گاؤں والوں نے تو اس بچے کو دیکھا بھی ہے۔ بتاتے ہیں کہ وہ بچہ وہاں جانے والے لوگوں کو اس کے گھر چھوڑ آنے کا کہتا ہے۔ پیپل کے پیڑ پر۔"

"مگر وہ روحیں آخر ہیں کس کی؟ اور باہر والے لوگوں سے ہی نفرت کیوں کرتی ہیں۔" بڈھے کے ہر خلاصے کے ساتھ پرکاش کا تجسس فزوں تر ہوتا جا رہا تھا۔ سب کچھ جان لینے کے لیے۔ حالانکہ وہ روحوں کے چکر کو نہیں مانتا تھا۔ مگر آج رات کا نظارہ اس کو ان کے بارے میں جاننے اور سننے کو بے تاب کر رہا تھا۔

"اب سچائی تو بھگوان ہی جانتا ہے بیٹا۔ ہمارے پاس تو سنی سنائی باتیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پیپل کے پیڑ کی جگہ پہلے کسی راجہ کا محل ہوا کرتا تھا۔ تین رانیاں تھیں اس کی۔ تینوں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت تھیں۔ پھر کسی دوسرے راجا نے اس راجہ کو ہرا کر رانیوں کے سامنے ہی اسے گھوڑوں کے قدموں تلے کچل کر مروا دیا اور اس محل کو اپنا حرم بنا لیا۔ تینوں رانیوں سمیت محل کی تمام عورتوں کو اپنی کنیزیں بنا کر رکھا۔ جو کچھ وہ ان رانیوں اور عورتوں کے ساتھ کرتا تھا وہ بتانے لائق نہیں ہے۔ تم میرے بیٹوں کے جیسے ہو۔ مگر ہاں۔ ہر صبح ایک میت اٹھتی تھی محل سے یہ سلسلہ تب تک جاری رہا جب تک کہ محل میں ایک بھی عورت بچی۔ کہتے ہیں کہ یہ روحیں اسی راجا اور انہی رانیوں کی ہیں۔"

"اوہ۔" پرکاش نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ تبھی شروتی کھانا لے آئی اور اس کو میز پر سجانے لگی۔

روہن مسلسل اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا تھا، اس تاک میں کہ شروتی اس کی طرف دیکھے اور وہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے اپنا پن ڈھونڈ سکے، مگر بدقسمتی سے ایسا ہوا نہیں۔

شروتی نے نظریں اوپر ہی نہیں اٹھائیں اور کھانا لگا کر بولی۔ "آپ کے لیے بھی لے آؤں بابا۔" آواز میں اتنی مٹھاس تھی کہ روہن اس کے منہ سے اپنے لیے کچھ سننے کو ترس گیا۔ اگر بابا نہ ہوتے تو وہ کب کا اس کو ٹوک چکا ہوتا۔

"نہیں بیٹی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی تو کھایا تھا۔ تم جاؤ۔ جا کر سو جاؤ۔ میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔"

"اچھا بابا۔ میں کنڈی نہیں لگاؤں گی۔ آپ آ کر بند کر لینا۔" شروتی نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر واپس مڑ گئی۔

"آپ کے گھر میں اور کون کون ہیں انکل جی۔" روہن کی دلچسپی صرف نیرو کے بارے میں جاننے کی ہی تھی۔

"بس ہم دو جان ہی ہیں بیٹا۔ بیوی اس کو جنم دیتے ہی گزر گئی تھی۔ سو اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ کچھ دن بعد تو میں اکیلا ہی رہ جاؤں گا۔" بڈھے نے جواب دیا۔

"وہ کیوں۔" کھانا کھاتے ہوئے روہن نے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کی شادی نہیں کروں گا کیا بیٹا۔ لڑکی تو ہوتی ہی پرایا دھن ہے۔" بڈھے نے ہنستے ہوئے بتایا۔

روٹی کا ٹکڑا روہن کے حلق میں ہی اٹک گیا۔ "کک کب کر رہے ہیں شادی؟"

"ابھی تو یہ مان ہی نہیں رہی ہے۔ کہتی ہے۔ پڑھائی پوری کرنے کے بعد ہی سوچوں گی۔ نادان اور بھولی ہے مگر ضدی بھی بہت ہے۔ جو سوچ لیا وہ سوچ لیا۔ پھر کسی کی نہیں سنتی یہ۔"

"اوہ۔" روہن کی جان میں جان آئی۔ پہلے اس کو لگا تھا کہ کہیں شادی پکی نہ ہو گئی ہو اس کی۔ کھانا کھانے کے بعد بڈھے نے برتن اٹھائے اور ان کو صبح ملنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی روہن نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھا۔

"کیوں۔ کیسی لگی؟"

"یہی ہے وہ؟" پرکاش کو شک تو تھا، مگر تعجب اس سے کہیں زیادہ تھا۔

"ہاں یہی ہے۔ جس کے لیے آج ہم یہاں ہیں مقدر میں ملنا تھا مل گئی۔" روہن خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ عجیب سی خماری میں اس نے تکیے کو اپنی چھاتی کے نیچے دبا لیا اور پیٹ کے بل لیٹ گیا۔

"مگر اس کا نام تو شروتی ہے۔ تُو تو نیرو کہہ رہا تھا؟" پرکاش نے دوسرے پلنگ پر لیٹتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

"نام میں کیا رکھا ہے یار۔ بس اتنا جان لے۔ جس کے لیے میں آیا تھا۔ مجھے مل گئی ہے۔ میں تیرے اس احسان کا بدلہ کبھی نہیں چکا پاؤں گا۔ میں نہ کہتا تھا میری نیرو مجھے ضرور ملے گی۔" روہن پر عشق کا بھوت سوار تھا۔

"ابے یار! اس نے تجھے دیکھا تک نہیں اور تُو ایسے اچھل رہا ہے۔ کہیں تجھے بھول نہ گئی ہو۔ کتنے

عرصہ پہلے ملی تھی؟" پرکاش اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"یہ سب میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ مگر تم یہ تو بتا دو کہ تمہیں کیسی لگی؟"

"ہاں ہے تو بہت پیاری۔ سچ بولوں تو اس کے جیسی کوئی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اگر یہ نیرو نہ ہوتی تو میں اس کے بارے میں اپنے لیے سوچ رہا تھا اور اب بھی کیا پتا...... یہ شروتی ہی ہو۔ تمہاری نیرو کی ہم شکل۔ تمہاری نیرو تو تمہیں وہیں ملے گی۔ پرانے ٹیلے پر۔ ہی ہی ہی۔" پرکاش نے شرارتی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

"ایسی بات مت کر یار۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" روہن نے منہ بنا کر کہا۔

"مذاق کر رہا ہوں بھائی۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" پرکاش کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

"وہ کیا؟" روہن بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اس نے تمہیں وہاں کیوں بلایا تھا؟ اور بلایا بھی تو وہاں ملنا چاہئے تھا۔ اب کس کو پتا تھا کہ ہماری گاڑی پنکچر ہو جائے گی اور ہم واپس آ کر اسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اگر ہم سیدھے نکل جاتے تو شاید ہی کبھی دوبارہ آتے یہاں پر۔" پرکاش کی بات میں دم تھا۔

"ہاں یار وہ تو ہے۔ جب بات کرے گی تو ضرور پوچھوں گا یہ بات۔" روہن نے جواب دیا۔

"اچھا اب یہ تو بتا دو کہ یہ تمہیں کہاں ملی؟ کیسے ملی؟ اور کیسے پٹی؟" پرکاش جاننے کے لیے بے چین تھا۔

"ایک بار بات ہونے دے پھر سب کچھ بتا دوں گا۔ ہمارا ملنا انکل جی کی بھوت والی کہانی سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ مجھے خود یقین نہیں تھا کہ میں اس سے مل پاؤں گا۔"

"ابھی بتا دے نا۔ ابھی کیا دقت ہے؟" پرکاش نے اس بار زور دے کر کہا تھا۔

"نہیں ابھی نہیں۔ بہت دلچسپ ہے۔ مگر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلے اس سے بات کر لوں۔" روہن نے کہا اور واپس لیٹ گیا۔ "چل اب سو جا۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ لوگ مطلب نکل جانے کے بعد کس طرح رنگ بدلتے ہیں۔ یہ میں دیکھ رہا ہوں۔ چل اچھا ہے۔ میں انتظار کروں گا۔ تیری اس سے بات ہونے تک۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ بھائی۔ گڈ نائٹ۔" روہن نے کہا اور سر کے نیچے سے تکیہ نکال کر دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر سینے پر رکھ لیا۔

رات کے تقریباً سوا دو بج رہے تھے جب روہن دروازے پر قدموں کی آہٹ سن کر چونک گیا۔ اس کی امید کو پوری طرح پنکھ لگے بھی نہ تھے کہ کمرے میں روشنی چھا گئی۔ ہلکی سی ناراضگی جتاتی ہوئی نیرو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی۔ ہولے ہولے چلتی ہوئی وہ اس کے پاس آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"یہ کون ہے؟" نیرو نے جھکتے ہوئے دھیرے سے پرکاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا دوست ہے۔ میرے لیے بھائیوں جیسا ہے۔ کیوں؟" روہن نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"اس کو کیوں لے کر آئے ہو۔ میں نے اکیلے آنے کا بولا تھا نا۔" ناراضگی اب بھی نیرو کی ناک پر بیٹھی تھی۔

"کمال کرتی ہو۔ ایسی خطرناک جگہ پر اکیلے۔ جان لینے کا ارادہ ہے کیا؟" روہن نے لیٹے ہی لیٹے جواب دیا۔

"جان تو میں تمہاری لوں گی ہی۔ ایک بار وقت آنے دو۔" یہ کہہ کر نیرو قاتل ادا سے مسکرانے لگی۔ اس کی اسی ادا کا تو روہن دیوانہ تھا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ تمہاری یہ بات مان لیتی ہوں۔ اس کو لے کر آ جاؤ۔ مگر اس کو دور ہی کھڑا کر دینا۔ مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔ جانے کب سے تمہارے لیے تڑپ رہی ہوں۔ تمہیں تو احساس بھی نہیں ہوگا میری محبت کا۔"

"تمہاری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ کہتی ہو مجھ سے پیار کرتی ہو۔ مگر آج تک کبھی چھونے کی اجازت نہیں دی۔ میں بھی تمہارے لیے پاگل ہو رہا ہوں۔ پلیز ایک بار۔ بس ایک بار مجھے تمہیں چھو کر محسوس کر لینے دو۔ کتنی پیاری ہو تم۔ تمہارے لیے میں یہاں تک بھی آ گیا ہوں۔ ایک بار میری آغوش میں آ جاؤ نا۔ پلیز۔" روہن اس کے جوان بدن کی حرارت کو اپنے اندر تک محسوس کرنے کے لیے تڑپ اٹھا۔

"میں بھی تو اتنی ہی تڑپ رہی ہوں دیو۔ تمہیں کیا پتا۔ میرا ایک ایک پل کیسا بیت رہا ہے۔ اس پل کے لیے جب میں اور تم "ہم" ہوں گے۔ یہ فاصلے کتنا تڑپاتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ بس انتظار کرو۔" نیرو کی آنکھوں سے اس کے لیے بے انتہا جذبات جھلک رہے تھے۔

"کتنی بار بتاؤں کہ میں روہن ہوں۔ اگر تم کسی دیو کے دھوکے میں میرے پیچھے پڑی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ مگر پھر بھی یہی کہوں گا کہ اب میں تمہارے بنا رہ نہیں پاؤں گا۔ تمہارے پیار نے تم نے مجھے جیسے پاگل سا کر دیا ہے۔"

"دنیا کے لیے چاہے تم کچھ بھی ہو۔ مگر میرے لیے تو میرے دیو ہی ہو۔ مجھے تمہارا یہی نام اچھا لگتا ہے۔ میں تو یہی کہوں گی۔" آنکھوں میں گہرا پیار اور محبت کا احساس لیے نیرو اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

"تم مجھے پوری طرح پاگل بنا کر ہی چھوڑو گی۔ مجھ روہن کو تم دیو کہتی ہو اور اپنا نام نیرو بتا رہی ہو جبکہ تمہارے پتا جی تمہیں شروتی کہتے ہیں۔ میں کیا سمجھوں اور کیا نہیں۔" روہن نام کے چکر سے ابھی تک بھی نہیں نکل پایا تھا۔

"وہاں آؤ گے تو سب سمجھ آ جائے گا۔ اب یہاں میں تمہیں کیا بتاؤں۔" نیرو نے بے بس نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"عجیب لڑکی ہو۔ یہاں میرے سامنے بیٹھی ہو۔ اس وقت تم نے نظر اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ اور اب یہ چھوٹی سی بات بتانے کے لیے مجھے وہاں بلا رہی ہو۔ اتنی خطرناک اور ڈراؤنی جگہ میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" روہن کے چہرے پر اس عجیب و غریب جگہ کی ڈراؤنی یادوں کی ٹیس چھا گئی۔

"کیا؟ تم وہاں گئے تھے۔ مگر میں نے تمہیں بارہ بجے کے بعد آنے کا کہا تھا نا۔ رکے کیوں نہیں وہاں پر۔" نیرو کچھ تیز لہجے میں بولی۔

"کیسے رکتے۔ ہم وہاں گئے تو ہمیں وہاں ایک بچہ ملا۔ اتنا خوفناک منظر تھا کہ میری تو جان ہی نکل گئی ہوتی۔ اور تمہیں پتہ بھی ہے۔ وہاں بھوت رہتے ہیں۔ تمہارے پتا جی نے ہی بتایا ہے۔" روہن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"مرے ہوئے لوگوں کو بھوت کہہ کر ان کا مذاق مت بناؤ دیو۔ تمہیں ان کی پیڑاؤں کا احساس نہیں ہے۔ ہر پل کیسے درد کی بھٹی میں تڑپتے رہنا پڑتا ہے۔ یہ تمہیں کیا معلوم۔ تم تو آزاد ہو۔ کہیں بھی آ جا سکتے ہو۔ مگر وہ ہر طرح سے ایک ہی دائرے میں بندھے ہیں۔ ہر پل اسی دردناک منظر کو آنکھوں میں لیے تڑپتے رہتے ہیں۔ جس گھڑی زندگی نے بڑی بے دردی سے ان کے سر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ ہر

بل اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ کب کوئی رہنما آئے گا اور ان کو وہاں سے۔ اس جہنم سے نجات دلائے گا۔ آجاؤ نا دیو۔ صرف ایک بار آجاؤ۔ میں ہر پل تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ ایک بار وہاں آجاؤ میری جان۔ مجھے نرک سے نکال کر سورگ میں لے چلو۔" نیرو بولتے بولتے بے بس ہو کر گڑگڑا رہی تھی۔

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔ مجھ سے تمہاری یہ بے چینی دیکھی نہیں جاتی۔ مگر ایسا کیا ہے جو یہاں نہیں بتا سکتیں۔ وہیں جانا کیوں ضروری ہے نیرو۔"

"وہاں جانا ضروری نہیں ہے دیو۔ مگر مجھے ڈر ہے۔ میں نے یہاں بتا دیا تو تم وہاں شاید کبھی نہیں آؤ گے۔" مایوس نیرو کی آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں میرے پیار پر بھروسہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کچھ ایسا ضرور ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ جب تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتی ہو تو میں تم پر کیوں کروں؟" روہن بات جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

"تمہارے اندر کے دیو پر مجھے پورا اعتماد ہے۔ مگر باہر کے روہن پر نہیں۔ وقت جانے کتنی کروٹیں بدلتا ہے۔ اس درمیان جانے تم کتنی بار بدلے ہو گے۔ میں اس لیے ڈر رہی ہوں۔" نیرو نے اپنا ہاتھ بڑھا کر روہن کے چہرے کو چھونا چاہا مگر کچھ یاد آتے ہی فوراً ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"دیکھو نیرو یا شروتی۔ تم جو بھی ہو۔ تم نے اپنے پیار میں تو مجھے پاگل کر ہی دیا ہے۔ اب اصلیت میں پاگل ہونا نہیں چاہتا۔ پہیلیاں مت بجھواؤ۔ اور اتنا جان لو کہ جب تک تم مجھے سب کچھ سچ سچ نہیں بتاتیں۔ میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ ہرگز نہیں۔" روہن نے دوٹوک جواب دیا۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہو دیو۔ کیا میں یونہی تڑپتی رہوں گی۔ تم میری بات سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ آجاؤ نا۔" نیرو کی حالت غیر ہو چلی تھی۔

"میں تو سب سمجھ رہا ہوں۔ اگر سمجھتا نہیں تو یہاں تک آتا ہی کیوں۔ اچھا چلو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم ابھی سب کچھ بتا دو گی تو تم جہاں کہو گی وہاں آنے کے لیے تیار ہوں۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد نیرو بولی۔ "یہ روہن کا وعدہ ہے یا پھر دیو کا۔"

روہن جھلا اٹھا۔ "کیا ہے یار۔ دیو! روہن۔ دونوں کا وعدہ رہا۔ دیو کا بھی اور روہن کا بھی۔ اب تو بتا دو۔"

"سوچ لو۔ دیو کے وعدے سولی پر جا کر بھی نہیں ٹوٹتے۔" نیرو کو کچھ امید سی بندھی۔

"سوچ لیا۔ وعدہ رہا۔ دیو کا۔" روہن نے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا مگر نیرو کی طرف سے ایسی کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ نیرو نے لمبی سانس بھرتے ہوئے چھت کی طرف دیکھا۔ اور اچانک ہی بولنا شروع کر دیا۔

"وہ بچہ۔ جس کی تم بات کر رہے ہو۔ میرا چھوٹا بھائی ہے۔"

"کیا؟" روہن نیرو کی اس بات کو ہضم نہیں کر پایا اور نیند میں ہی اندر تک کانپ گیا۔ ہڑبڑا کر لگ بھگ چیختے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے چیختے ہی پرکاش ایک پل میں اٹھ کر پلنگ سے کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہوا؟"

"یہ لائٹ کیوں بند کر دی۔ نیرو کہاں گئی۔" روہن کا سر چکرا رہا تھا۔ بند آنکھوں میں جہاں اس کو اجالا ہی اجالا دکھائی دے رہا تھا آنکھیں کھولتے ہی اندھیرے کے سوا اس کو کچھ نظر نہیں آیا۔ وہاں تو پہلے سے ہی اندھیرا تھا۔ اجالا تو نیرو سپنے میں ساتھ لے کر آئی تھی۔

"نیرو یہاں۔ ابے تم پاگل ہو گئے ہو کیا۔ لگتا ہے کوئی سپنا دیکھ رہا تھا۔" پرکاش نے روہن کو کندھے سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

روہن نے جیسے تیسے خود کو سنبھالا۔ "ہاں بھائی۔ سپنا ہی تھا۔ سوری۔ سو جا۔"

"اب تھوڑی بہت رات بچی ہے۔ اس میں تو چین سے سو لینے دو یار۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ بتاؤ نا۔ تم کھل کر کیوں نہیں بتاتے۔" پرکاش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے پوچھا۔

"کچھ نہیں یار۔ سو جا۔ صبح بات کریں گے۔" کہتے ہوئے روہن منہ ڈھک کر لیٹ گیا۔

"دیکھو۔ کوئی بات دل میں نہیں رکھنی چاہیے۔ گانٹھ بن جاتی ہے۔ اور پھر مجھ سے چھپا کر تجھے ملے گا کیا۔ باقی تیری مرضی ہے۔ صبح کا انتظار کروں گا۔" پرکاش نے کہا اور دوسری طرف کروٹ لے کر سو گیا۔

روہن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پچھلے قریب دو مہینے سے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام تھا۔ اور وجہ تھی نیرو۔ ہر رات کو وہ اس کے سپنوں میں آتی اور دن بھر وہ اس کے سپنوں میں کھویا رہتا۔ زندگی اچانک کتنی بدل گئی تھی اس کی۔ ہمیشہ مست قلندر کی طرح جینے والا روہن شروع میں تو ان سپنوں کا مزا لیتا رہا اور رات کو اس کے پاس آ کر اس کو پکار رہی اس حسینہ کے بارے میں دن بھر سوچ کر لذت اٹھاتا رہتا۔ پرکاش کی بات سچ تھی۔ نیرو جیسی پیاری لڑکی اس نے کبھی آج تک نہیں دیکھی تھی۔ مگر جلد ہی یہ مزا بے چینی میں اور پھر وہ بے چینی ایک انجانے سے لگاؤ میں بدل گئی۔ آخر یہی لڑکی روز اس کے سپنوں میں کیوں آتی ہے۔ کیا رشتہ ہے اس لڑکی کا اس کے ساتھ۔ لڑکی کا صرف سپنے میں آنا ہی ہوتا تو الگ بات تھی۔ مگر وہ تو دونوں کے پیار کی دہائی دیتی تھی۔ اپنے پاس بلاتی تھی۔ سپنے میں اس کی آواز یوں لگتی تھی جیسے کسی گہری کھائی سے بول رہی ہو۔ رک رک کر کہی گئی اس کی باتوں کی بازگشت بار بار اس کے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ رات بھر۔ دن بھر۔ اپنے مست انداز کا مالک روہن دوستوں میں اپنے ہنسی مذاق اور لڑکیوں کو لفٹ نہ دینے کی وجہ سے ہمیشہ چھایا رہتا تھا۔ مگر اچانک ہی وہ گم صم سا رہنے لگا۔ پوچھنے کی کوشش بہتوں نے کی۔ مگر بتاتا بھی تو کیا بتاتا۔ آخر جب اس کی بے چینی اور اپنے آپ کو نیرو کہنے والی لڑکی کے ساتھ اس کا لگاؤ آخری حدوں کو چھونے لگا تو اس نے ایک دن اس کے پاس جانے کی ٹھان لی۔

مگر نیرو کی ایک شرط نے اس کو پرکاش کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا۔ ایک تو صرف رات کو ہی مل پانے کی بے بسی اور دوسرا اس کے پاس آنے کے لیے بتائے گئے راستے کا نقشہ۔ پرکاش اس کے سب سے نزدیکی دوستوں میں سے ایک تھا۔ وہ انجانی جگہوں پر جانے گھومنے پھرنے اور دور دراز کے علاقوں میں جا کر وہاں کے لوگوں کی بود و باش جاننے کا شوقین تھا۔ یعنی ایڈونچر اس کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ روہن نے پرکاش کو ایک بناوٹی کہانی سنائی۔ اس کو یقین تھا کہ اگر سپنے والی بات اس کو بتائے گا تو وہ ساتھ دینا تو دور۔ الٹا دوستوں میں اس کی کرکری کرنے میں بھی کسر نہیں چھوڑے گا۔ اس نے پرکاش کو بتایا کہ بہت پہلے ایک لڑکی سے وہ ملا تھا اور اب اس کو پتا چلا ہے کہ وہ لڑکی اس سے بے انتہا پیار کرتی ہے۔ اور اس کو ملنے کے لیے بلا رہی ہے۔ پہلے پہل تو پرکاش نے اس کو ان خواہ مخواہ کے چکروں سے دور رہنے کی ہدایت دے کر صاف منع کر دیا۔ لیکن جب اس کو کئی دنوں تک لگاتار روہن کا چہرہ اترا ہوا دکھائی دیا تو ایک دن اس نے خود ہی روہن کو ٹوک دیا۔

"کہاں ہے وہ لڑکی۔ چل ملا لاتا ہوں۔"

"یار اس کا گھر گاؤں سے دور ہے۔ کافی آگے

چل کر۔" روہن اس بات کو کھا گیا کہ لڑکی نے اس کو بتایا تھا کہ اس کو کافی دور پیدل چلنا پڑے گا۔

"اچھا۔ تو تم ڈر رہے ہو۔ اس لیے مجھے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ ہے نا۔ نہیں تو تم مجھے بتاتے بھی نہیں کہ تم مجنوں بن گئے ہو آج کل۔" پرکاش نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی سمجھ لے یار۔ مگر مجھے اس سے ایک بار مل کر آنا ہے۔"

"ہوں۔ چل پھر کل ہی چلتے ہیں۔" پرکاش تیار ہو گیا اس کے ساتھ جانے کو۔ لیکن جو کچھ بھی آج رات کو انہوں نے دیکھا اس نے اس کی بے چینی کم کرنے کی بجائے اور بڑھا دی تھی۔ خاص طور سے تب جب اس نے سپنوں میں روز آنے والی لڑکی کو پورے پیکر کے ساتھ اپنی نظروں کے سامنے دیکھا۔ شروتی کے روپ میں۔ اس وقت تک تو ٹیلے سے واپس آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب محض اس کے دماغ کا فتور ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن اب۔ اب تو وہ قطعی ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کے سپنوں کی رانی تعبیر کا روپ لیے اس کے روبرو آ چکی تھی۔ بھلے ہی اس کا انداز بے رخا ہو۔ بھلے ہی اس کا نام شروتی ہو۔ کچھ نہ کچھ تو بات ضرور ہے۔ ورنہ اسی گاؤں کی لڑکی اس کے سپنے میں کیوں آتی۔ مگر اب آج رات کے سپنے کو وہ کیسے لے۔ کہیں نیرو سچ میں کوئی بھوت تو نہیں۔ اس نے ٹیلے پر ملنے والے بچے کو اپنا بھائی بتایا تھا۔ چکر کیا ہے؟ اور پھر بھوت تو ڈراتے ہیں۔ پیار تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ پھر بھوت بھی مانے تو کیسے مانے۔ لڑکی تو زندہ روپ میں اس کے سامنے بھی تھی۔ روہن کو لگ رہا تھا جیسے وہ بھی اس لڑکی کے پیار میں بری طرح جکڑا جا چکا ہو۔ وہ پھر سے اس کو اپنے سپنے میں لانا چاہتا تھا۔ اپنے ان گنت سوالوں کا جواب لینے کے لیے۔ اس سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ یہ جاننے کے لیے۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ کب سو گیا اور کب خود کو نیرو بتانے والی شروتی دوبارہ اس کے سپنے میں آ گئی اس کو پتہ ہی نہیں چلا۔

"کیا ہو گیا تھا۔ تم چلے کیوں گئے تھے بیچ میں ہی۔" نیرو وہیں بیٹھی تھی۔ اس کے پیروں کے پاس۔

"میں کہاں گیا تھا۔ چلی تو تم گئی تھیں۔ میرے سپنے سے۔" روہن نیند میں بڑبڑایا۔

"ہاں مگر سپنا تو تمہارا ہی تھا نا۔ تم نے وہ کیوں توڑ دیا۔ مجھے جانا پڑا۔"

"تم سپنے میں ہی کیوں آتی ہو۔ اٹھ کر آ جاؤ نا۔ برابر والے کمرے میں ہی تو ہو۔" روہن نے جواب دیا۔

نیرو نے یہیں پر اس کو سب کچھ بتانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس کے دیو نے وعدہ جو کیا تھا۔ اس جنم میں اس کا ساتھ دینے کا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو دیو۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ وہ تو شروتی ہی ہے جسے تم اپنے سامنے بیٹھے دیکھ رہے ہو۔ میں دیو کی پریا درشنی ہوں اور اس جنم کی تمہاری نیرو۔"

روہن کسی طرح اپنے آپ پر قابو پائے رہا۔ اس کو سب کچھ جان لینا تھا۔ آج ہی۔ "مطلب ہمارا پچھلے جنم سے کوئی رشتہ ہے؟"

"پچھلے جنم کا نہیں۔ پچھلے کئی جنموں کا۔ پریا درشنی کے ہر جنم میں میں نے تمہارا انتظار کیا۔ مگر میں تمہیں اسی جنم میں ڈھونڈ سکی۔" نیرو نے جواب دیا۔

"لیکن تم مجھے پہلے بھی تو ڈھونڈ سکتی تھیں۔ میرا مطلب ہے پچھلے جنموں میں۔" روہن نے اسے ٹوک دیا۔

"ہاں اور میں نے بہت ڈھونڈا بھی۔ مگر میری

ایک حد ہے۔ ہم ایک دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ دو مہینے پہلے تم اس گاؤں کے پاس سے گزرے اور میں نے تمہیں پہچان لیا۔ تب سے میں اس بات کا انتظار کر رہی ہوں کہ تم کب آؤ گے میرے پاس۔ اپنی نیرو کے پاس۔ ہمارا ملن کب ہو گا۔ اسی وجہ سے میں نے اس گھر میں رہنے والی لڑکی کا روپ چرایا۔ تاکہ تمہیں اس کے سراپا میں بندھ کر اپنے پاس لا سکوں۔ کیونکہ اس سے خوب صورت کوئی اور لڑکی مجھے آس پاس دکھائی نہیں دی۔" نیرو لگاتار بول رہی تھی کہ روہن نے اسے ٹوک دیا۔

"لیکن اگر تم روح ہو تو ہم کیسے مل سکتے ہیں؟ بتاؤ۔"

"نہیں میں روح نہیں ہوں۔ میں بھی جنم لے چکی ہوں۔ کئی بار۔ اس بار بھی۔ نیرو کے روپ میں۔ صرف اس کا دل محل میں موجود اس لاکٹ میں اٹکا ہوا ہے جو دیو نے پریا درشنی کو دیا تھا۔ یعنی تم نے مجھے۔ پیار کی پہلی اور آخری نشانی کے روپ میں۔"

"اب یہ لاکٹ کا کیا چکر ہے؟" روہن نے اس کو پھر ٹوکا۔

"وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ہمارے پیار کی۔ ہمارے ملن کی اور ملن پورا ہونے سے پہلے ہی ہماری جدائی۔ کبھی فرصت میں بتاؤں گی۔" نیرو اب اس کا جواب سننے کے لیے بے چین تھی۔ روہن کو کچھ کچھ پلے پڑ رہا تھا۔ لیکن بہت کچھ نہیں۔

"اور اب اصلی نیرو کو کون ڈھونڈے گا۔ کہاں کہاں بھٹکوں میں۔ اور کیوں بھٹکوں۔"

"تمہیں بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر جنم میں وہ میرے اندر ہی رہی ہے۔ آخر میں بھی اس کا حصہ ہوں۔ عمر کوٹ کے ایک قصبے میں رہتی ہے وہ۔ گورنمنٹ کالج کے پاس گھر ہے اس کا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ ہر جنم میں وہ انجانے میں ہی سہی لیکن کنواری ہی رہی۔ تمہارے علاوہ میں نے کسی کے بارے میں سوچا تک نہیں دیو۔ تمہارے علاوہ مجھے کوئی چھو بھی نہیں پایا۔" نیرو کی آواز رندھ گئی۔

"اوہ..... اور میں؟" روہن کو اس کی عجیب مگر میٹھی سی کہانی میں مزا آنے لگا تھا۔

"تمہارا مجھے نہیں پتا اور اس جنم کی کہانی تو تم خود ہی جانتے ہو گے۔" نیرو نے اس کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گی۔" روہن کے دل میں سوالوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

"بس یہی ایک مسئلہ ہے۔ اس کے لیے تمہیں اس کو وہیں لانا ہو گا۔ محل میں۔" نیرو کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔

"اب یہ محل کا کیا چکر ہے؟" سوالوں میں سے ہی اتنے سوال نکل رہے تھے کہ پرانے سوال روہن بھولتا جا رہا تھا۔

"جہاں تم گئے تھے۔ وہاں پیپل کا ایک پیڑ ہے۔ اس کے نیچے ہمارا محل ہے۔ تمہیں نیرو کو وہیں لے کر آنا ہو گا۔"

"ایک منٹ..... ایک منٹ۔ جو لڑکی مجھے جانتی نہیں، پہچانتی نہیں اس کو میں کیسے لا سکتا ہوں۔ اور وہ بھی ایسی جگہ پر جہاں کے بچے بھی اتنے خطرناک ہیں۔" روہن کا سر چکرانے لگا تھا۔

"اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن اگر تم اس کے دل میں پیار جگاؤ گے تو وہ آ سکتی ہے تمہارے ساتھ۔ تمہیں اس کا پیار بھی جیتنا ہو گا اور بھروسہ بھی۔ یہ کام تمہیں اپنے طریقے سے کرنا ہو گا۔"

"مجھے نہیں پتا کہ لڑکیوں کا دل کیسے جیتا جاتا ہے۔ اس معاملے میں میں ایک دم اناڑی ہوں۔ تم ہی

کچھ بتاؤ۔" روہن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"تم جب دیو تھے۔ تب بھی تم ایسے ہی تھے۔ شرمیلے اور جھینپو۔ لیکن تمہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔" نیرو اپنے دیو کی یادوں میں کھو کر مسکرانے لگی۔

"سوری نیرو۔ یہ سب میں نہیں کر سکتا۔ کسی انجان لڑکی سے میں نے آج تک بات بھی نہیں کی ہے۔ اور تم اس کو یہاں لانے کو کہہ رہی ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر اس کو بھی رات کو ہی لانا ہوگا۔ ہے نا؟"

"ہاں دیو۔ یہ میری مجبوری ہے۔"

"شٹ۔ ناممکن۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور پھر تم ہی بتاؤ۔ میں تمہاری باتوں پر کیوں یقین کروں اور یقین کر بھی لوں تو میں اتنی بڑی ٹینشن کیوں مول لوں؟ یہ جاننے کے بعد کہ تم کوئی بھٹکی ہوئی روح ہو۔ میرے دل میں تمہارے لیے ہمدردی کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن پھر بھی میں معافی چاہتا ہوں۔ میری زندگی سے نکل جاؤ۔ تم نے میری ہنستی کھیلتی زندگی برباد کر دی ہے۔ میں پاگل سا ہو گیا ہوں۔ تمہاری بات کو سچ مان بھی لوں تو مجھے اب کچھ یاد نہیں ہے۔ پھر میں تو کسی بھی لڑکی سے پیار کر سکتا ہوں۔ شادی کر سکتا ہوں۔ سچ بولوں تو میں صبح شروتی کے باپ سے اپنے رشتے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی ہی لڑکی کے سپنے دیکھے ہیں۔ جس کا چولا پہنے ابھی تم میرے سامنے بیٹھی ہو۔ مجھے اس سے پیار ہو گیا ہے تو کیوں نہ میں نیرو کے آگے پیچھے بے وجہ چکر لگانے کے شروتی پر ہی ڈورے ڈال لوں۔ پلیز میرا پیچھا چھوڑ دو۔ آج کے بعد میری زندگی میں مت آنا۔ میں تنگ آ گیا ہوں تمہاری باتیں سن کر۔ میں اور کچھ جاننا نہیں چاہتا۔" روہن نے سیدھے اور بے رحم لفظوں میں اپنی بات کہہ دی۔ نیرو کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ روہن کو اس بار پا کر بھی کھو دینے کے صدمے اور غصے سے وہ کانپنے لگی۔

"دیو! تمہارے وعدے کا کیا ہوگا؟" نیرو کے منہ سے کہتے ہی سسکی نکلی۔

"بھاڑ میں گیا وعدہ۔ مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ مجھے مرنا نہیں ہے ابھی جینا ہے۔ اپنے لیے۔ گھر والوں کے لیے۔"

نیرو کھڑی ہو گئی۔ "ٹھیک ہے دیو۔ میں جا رہی ہوں۔ آئندہ کبھی نہیں آؤں گی۔ میں نے تو یہ سوچ کر تمہیں کبھی خود کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا کہ میرا دھارا ہوا یہ روپ کسی اور کا ہے۔ اس کو ہاتھ لگوا کر میں تمہیں ناپاک کر کے خود کو پاپ کا بھاگیدار نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اگر تمہیں یہی پسند ہے تو لو۔ نوچ ڈالو بھی اس کو۔ کر لو اپنی ہوس پوری۔"

یہ کہتے ہوئے نیرو نے غصے سے گلے سے پکڑ کر اپنی قمیص کھینچ کر تار تار کر دی۔ شروتی بنی نیرو نیم برہنہ حالت میں نظریں جھکائے سسکیاں لے رہی تھی۔ روہن کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ اس کو یوں نظریں جھکاتے دیکھ کر نیرو نے کھڑے کھڑے ہی بولنا شروع کر دیا۔

"کاش تمہیں احساس کروا سکتی کہ تم کیا تھے۔ کاش تمہیں دیو اور پریادرشنی کی محبت سے روبرو کروا پاتی۔ تمہیں دیو کے وعدے کی قیمت کا احساس ہوتا تو تم کبھی ایسا نہ کہتے۔ جان پر کھیل جاتے اپنی نیرو کو اپنے گلے سے لگا کر اس کو کم سے کم اس جنم میں مکمل عورت بنانے کے لیے۔ بے شک اس کے پاس پریادرشنی کا دل نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے دیو سے کیا وعدہ ہر جنم میں نبھایا ہے۔ بے شک وہ تمہارا انتظار نہیں کرتی۔ مگر کسی کا بھی انتظار نہیں کرتی وہ۔ اس جنم میں بھی ایسے ہی جائے گی اور میرا کیا ہے؟ کاش مجھے تمہارے دیئے گئے لاکٹ سے بھی اتنی ہی محبت نہ ہوتی جتنی کہ تم سے ہے تو میری روح میرے دل کو بھی ساتھ لے کر نکل جاتی۔ یوں نہ تڑپتے رہنا پڑتا مجھے۔ جنم جنم تمہارے آنے کے انتظار میں۔" نیرو نے بھرائے ہوئے گلے سے کہا اور چپ چاپ سسکیاں لیتی روہن کے سپنے سے غائب ہو گئی۔ اگلی صبح بڈھے نے آ کر روہن اور پرکاش کو اٹھایا۔ روہن کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ رات کے سپنے کی باتیں اس کے دماغ پر اب بھی ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھیں۔

"کیا بات ہے......؟ تو ٹھیک تو ہے نا۔" پرکاش نے اس کو اس طرح سر پکڑ کر بیٹھے دیکھا تو پوچھ لیا۔

"نہیں بھائی۔ سب ٹھیک ہے۔ بس ایسے ہی سر میں درد ہو رہا ہے۔" روہن نے پرکاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو اب چلیں یا تیری نیرو سے ملنے کی تمنا ہے۔" بڈھے کے واپس جاتے ہی پرکاش نے روہن کو چھیڑا۔

"یار اس کا نام بھی مت لے میرے سامنے۔" روہن پھٹ پڑا۔

"ارے میں تجھے فون کر کے ٹیلے پر بلانے والی لڑکی کی بات نہیں کر رہا۔ میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ شروتی کی۔ ملی تو یہی تھی نا تم سے۔ کافی پہلے۔ تم نے ہی تو بتایا تھا۔" پرکاش نے اس کو کھنگالنا شروع کیا۔

"ابھی کچھ مت بول یار۔ پلیز۔ میرے سر میں درد ہے۔" روہن اب بھی اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ "چلو چھوڑو۔ تم ٹینشن کیوں لے رہے ہو۔ ابھی نکلتے ہیں میں بس یہاں سے۔" روہن نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔ "میں فریش ہو کر آتا ہوں یار۔ ٹوائلٹ کدھر ہے۔ پچھتا بیڈ یا ہے۔" روہن کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"باہر نکل کر دائیں طرف سیدھا چلا جا۔"

"تھینکس۔" کہہ کر جیسے ہی روہن باہر نکلنے کو ہوا۔ ان کے لیے چائے بنا کر لا رہی شروتی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"اوہ سوری۔" روہن ٹھٹک گیا۔

شروتی اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ کیا غضب کی مٹھاس تھی اس کے چہرے پر۔ شرم کے مارے وہ اپنی آنکھیں جھکائے کھڑی تھی۔ جب کافی دیر روہن یونہی خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا تو اسے بولنا ہی پڑا۔ "جی چائے۔"

"اوہ اندر رکھ دو۔ میں آتا ہوں ابھی۔ شکریہ۔" کہہ کر روہن اس کو راستہ دے کر باہر نکل گیا۔ شروتی چائے لے کر اندر گئی اور میز پرکاش کی طرف کھسکا کر چائے اس پر رکھ دی۔ مڑ کر جیسے وہ باہر جانے کے لیے پلٹی۔ پرکاش نے اس کو ٹوک دیا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

شروتی کے قدم وہیں جم گئے۔ شرمیلی تھی لیکن پاگل نہیں تھی۔ اس کے بابا نے کتنی ہی بار اس کا نام لیا تھا ان کے سامنے۔ وہ سمجھ گئی کہ لائن مارنے کے چکر میں ہے۔ وہ دو پل کے لیے رکی اور پھر سے آگے بڑھنے لگی۔

"نیرو...... یہ بھی تمہارا ہی نام ہے نا۔" پرکاش نے اس کے بڑھتے قدموں پر پھر سے روک لگائی۔

"جی...... جی نہیں۔" شروتی نے جواب دیا۔

"روہن تمہارے لیے ہی یہاں آیا ہے۔ کوئی تمہارا نام لے کر اس کو یہاں بلا رہی تھی۔ تم ملے ہو نا پہلے۔"

شروتی کو پرکاش کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی۔ بنا پلٹے بنا رکے وہ باہر نکل گئی۔

"عجیب لڑکی ہے۔" پرکاش بڑبڑایا۔ اور اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔

شروتی نے پرکاش کی آخر میں کہی گئی باتوں کو سن لیا تھا۔ کچھ دیر بعد روہن واپس آیا تو بڈھا وہیں بیٹھا تھا۔ روہن آتے ہی ٹھنڈی ہو چکی چائے اٹھانے لگا تو

بڈھے نے اس کو روک دیا۔ "رہنے دو بیٹا۔ ٹھنڈی ہوگئی ہے۔ شروتی کہہ رہی تھی کہ وہ اور بنا کر لا رہی ہے۔"

"ارے انکل جی۔ کیا ضرورت تھی پریشان ہونے کی۔" روہن نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ شروتی وہاں حاضر ہوگئی۔ ٹرے میں ایک کپ چائے لے کر۔ پرکاش نے آنکھوں ہی آنکھوں میں روہن کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ "کیا بات ہے۔ تم پر تو بڑی مہربان ہے۔"

اس بار شروتی سیدھی آ کر روہن کے سامنے کھڑی ہوئی اور ٹرے اس کی طرف بڑھا دی۔ روہن نے چہرہ اٹھا کر اس کی نظروں میں جھانکا۔ اس بار وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ روہن اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہی گنگ سا رہ گیا۔ اپنی آنکھوں میں دنیا بھر کی خوشیاں سموئے وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ جب کافی دیر تک روہن نے ٹرے نہیں پکڑی تو شروتی کو کہنا ہی پڑا۔ "چائے لیجیے۔"

روہن نے چونکتے ہوئے کہا۔ "اوہ ہاں۔" روہن جھینپ سا گیا۔ شروتی کے بابا وہاں نہیں بیٹھے ہوتے تو پرکاش کوئی نا کوئی جملہ ضرور کستا ان کے آنکھیں چار کرنے کے انداز پر۔

"اچھا انکل جی۔ اب ہم نکلنے کی تیاری کرتے ہیں۔ بتا سکتے ہیں کہ پنکچر لگانے والا کہاں مل سکتا ہے۔"

"ارے جلدی کیا ہے بیٹا۔ کھانا وانا کھا کر نکل جاتے۔" بڈھے نے مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں انکل جی، پہلے ہی آپ۔ ویسے بھی ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔ پنکچر بھی لگوانا ہے۔ جانے کہاں ملے گا۔ ہمیں اب اجازت دیجیے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ جیسے تمہاری مرضی۔ پنکچر کی ایک دکان اگلے گاؤں میں ہے۔" بڈھے نے بتایا ہی تھا کہ باہر سے شروتی کی آواز آئی۔

"ذرا باہر آنا۔"

"ایک منٹ۔" بڈھا یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

روہن کے کپ رکھتے ہی وہ دونوں بھی یونہی باہر نکل کر گاڑی کے پاس آ گئے۔

"پرکاش! یہ کیسے ہوا؟ تم نے رات کو ٹھیک سے دیکھا تھا نا۔" روہن اچھل پڑا۔

"کیا ہوا؟"

"ہوا تو دیکھ ٹائروں کی۔" روہن جیسے چلا سا رہا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ کمال ہے۔ ہاں میں نے موبائل کی لائٹ جلا کر دیکھا تھا۔ تب تو کسی ٹائر میں ہوا نہیں تھی۔ حد ہوگئی یار۔ یہاں بھی؟"

"کیا ہوا بیٹا؟" روہن کی چیخ سی سن کر بڈھا لگ بھگ بھاگتا ہوا باہر آیا۔

"انکل جی۔ یہ ہوا۔ رات کو تو بالکل غائب تھی۔ اب کہاں سے آ گئی؟" روہن نے ٹائروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بڈھے کے چہرے پر شکن تک نہیں آئی "ہم ایسی باتوں کے عادی ہو چکے ہیں بیٹا۔ آج رات ہی۔ شروتی صبح اٹھی تو اس کی قمیص گلے سے پھٹی ہوئی تھی۔ نیچے تک۔ برا مت ماننا۔ اگر کمرے کی کنڈی بند نہ ہوتی تو میں تم لوگوں کے بارے میں کیا کیا سوچتا۔ مگر یہاں کسی بھی وقت۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

پرکاش نے حیرت سے ایک بار پھر روہن کی طرف دیکھا۔ وہ رات کو سپنے میں آئی ہیرو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سن کھڑا تھا۔

"چلیں ٹھیک ہے انکل جی۔ اب ہم چلتے ہیں۔" پرکاش سب کچھ بھول کر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

"شہر کی طرف ہی جاؤ گے نا بیٹا۔" بڈھے نے نہایت عاجزانہ لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں۔ شہر سے ہو کر ہی گزریں گے۔ کیوں؟" پرکاش نے جواب دیتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں۔ کچھ خاص بات تو نہیں تھی۔ لیکن وہ شروتی کو بھی شہر ہی جانا ہے۔ کالج میں۔ اگر تم لوگ لیٹ نا ہو رہے ہوتے تو وہ بھی ساتھ ہی چلی جاتی۔ بس کے انتظار میں بہت وقت خراب ہو جاتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔" بڈھے نے کہا۔

روہن دل ہی دل میں اچھل پڑا۔ خوشی سے لیکن خوشی کو دل میں دبا کر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ ویسے ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے اب تو پنکچر بھی نہیں لگوانا۔ جتنی دیر کہیں ہم رکنے کے لیے تیار ہیں۔"

"اچھا بیٹا۔ ویسے تو اس کا کالج ابھی دو تین گھنٹے بعد ہے۔ لیکن میں اس کو کہہ دیتا ہوں۔ وہ جلدی سے تیار ہو جائے گی۔" بڈھا خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"نہیں انکل جی۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم تب تک ایک کام کر آتے ہیں گھنٹے میں آ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ جیسے تم کہو۔ میں شروتی کو بول دیتا ہوں۔" بڈھا بہت خوش لگ رہا تھا۔

"ہم بس گھنٹے بھر میں آتے ہیں انکل جی۔" پرکاش یہ کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ روہن بھی اس کے ساتھ بیٹھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ پرکاش آخر جا کہاں رہا ہے۔ پرکاش نے بڈھے کے اندر جاتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر کے گھما دی۔

"کیوں بے۔ اب تو خوش ہو جا۔ تیرے دل کی خواہش پوری ہوگئی۔ جی بھر کر بات کر لینا۔ مجھ سے تو بات کی نہیں ڈھنگ سے۔" کہہ کر پرکاش نے بتیسی نکال دی۔

"لیکن ابھی تم واپس کہاں جا رہے ہو؟" روہن نے پوچھا۔

"پرانے ٹیلے پر۔ دیکھیں تو سہی آخر کیا ڈرامہ ہے وہاں۔" پرکاش نے گاڑی کی اسپیڈ تیز کر دی۔

"تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ مجھے نہیں جانا وہاں۔" روہن لگ بھگ اچھلتے ہوئے بولا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ کوئی دم ہے بڈھے کی باتوں میں۔ مجھے تو بہت بڑا ناٹک لگ رہا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ بڈھا بھی اس ناٹک میں شامل ہے۔ دیکھا اس کو گاڑی میں اپنے آپ ہوا بھر جانے پر بھی حیرت نہیں ہوئی۔ الٹا کہانی بنانے لگا۔ بیٹی کی قمیص پھٹ گئی رات کو۔ ہونہہ اور اب دیکھ۔ کیسے اپنی بیٹی کو ہم جوان مسٹنڈوں کے ساتھ بھیج رہا ہے۔ بھلا اتنا بھی نادان ہے کیا کوئی آج کی دنیا میں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ شروتی ہی ہیرو بن کر تجھے فون کرتی ہوگی۔ کچھ نہ کچھ چکر تو ضرور ہے پیارے۔ کہیں یہ تیری ہمدردیاں سمیٹنے کا تو نہیں سوچ رہے۔ تمہیں الو بنا کر۔" پرکاش بولتا ہی جاتا اگر روہن اس کو بیچ میں ہی نہ ٹوکتا۔

"چپ ہو جاؤ یار۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ سب محض اتفاق ہے۔ تم گاڑی واپس موڑ لو۔" روہن جھلایا۔

"گاڑی تو اب خونی تالاب پر ہی جا کر رکے گی بیٹا۔ مجھے وہ پیپل کا پیڑ دیکھنا ہے اور اس بچے کو بھی ڈھونڈنا ہے۔ تمہیں اترنا ہے تو اتر جاؤ۔ روکوں کیا۔"

روہن کچھ بھی نہیں بولا۔ سوچتا ہوا گاڑی کے باہر دیکھنے لگا۔

"لیٹ نہیں ہو جائیں گے کیا۔۔۔ اب پیدل چلنا پڑے گا۔" روہن نے آگے راستے پر گہرا گڑھا دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے گاڑی کو راستے سے نیچے اتار کر لے جانا ہے کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد زیادہ دقت نہیں آئے گی۔ شاید نکل جائیں۔ چلو یہاں سے تو پار ہوئے۔ اب تم

بتاؤ کیا چکر ہے تیرا شروتی کے ساتھ۔ اب تو مجھے لگ رہا ہے کہ آج تم کنوارے نہیں رہو گے۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟" وہ گاڑی سمیت دھیرے دھیرے چلتے ہوئے بڑھتے جا رہے تھے۔

"کچھ نہیں لگتا بھائی۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔ اب میں تمہیں کیسے بتاؤں۔" روہن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔ مجھے نہیں بتائے گا تو کس کو بتائے گا۔ ابے دوست ہوں میں تیرا۔ بھائی ہوں۔" پرکاش نے اس پر بتانے کے لیے زور ڈالا۔ "اگر آج تم نے سب کچھ نہیں بتایا تو سمجھ لے۔ پھر تیرا میرا معاملہ یہیں ختم ہے۔"

"تو یہ تالاب ہے وہ۔ اس میں تو اچھا خاصا صاف ستھرا پانی ہے۔ رات کو لال کیسے ہو جاتا ہوگا۔"

پرکاش تالاب کو دیکھتے ہی روہن سے کچھ بھی پوچھنا بھول گیا اور گاڑی روک کر وہیں اتر گیا۔ روہن بھی ساتھ ہی نیچے آ گیا۔

"چل نا یار۔ واپس چلتے ہیں۔"

"ارے کیوں ڈر رہے ہو۔ بڈھے کی بات مان بھی لیں تو دن میں تو یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ چل آ جا۔" کہہ کر پرکاش ایک راستہ دیکھ کر دائیں طرف بڑھ گیا۔

"یہ بات نہیں ہے یار۔ لیکن میرا دل نہیں کر رہا آگے چلنے کا۔ موڈ آف ہے۔" روہن اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

"کمال ہے یار۔ اب تو کیچڑ بھی نہیں ہے۔ لگتا ہے ہم دوسرے راستے آئے ہیں آج۔"

روہن کچھ نہیں بولا۔ اس کے دماغ میں نیرو کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اگر سپنے میں کچھ سچائی ہے تو وہ اس کو دیکھ رہی ہوگی ضرور۔ کم سے کم اس کو پتا تو چل ہی گیا ہوگا کہ میں آیا ہوں۔ سوچ کر ہی روہن چوکنا ہو گیا۔ چلتے ہوئے وہ تالاب کے پار جا کر اسی جگہ کھڑے ہو گئے جہاں کل رات وہ اس بچے سے ملے تھے۔ سونا پن وہاں اب بھی ویسا ہی موجود تھا لیکن وہ سونا پن اب دن کی روشنی میں بھیانک نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے برعکس عجیب سا سکون پھیلا ہوا تھا۔ ہولے ہولے چلتی ہوئی ہوا ماحول کو اور بھی دلفریب بنا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ پہلے یہاں کوئی گاؤں بستا ہوگا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ سوائے پرانی اینٹوں کی گلیوں کے۔ ٹوٹی پھوٹی آدھی گری ہوئی دیواروں اور کچھ آوارہ جانوروں کے۔

"کہاں مل سکتا ہے وہ بچہ۔ سالے نے رات کو خوب الو بنایا۔ سچ میں ڈر گیا تھا میں۔" پرکاش ایک جگہ جا کر کھڑا ہو گیا۔

"میں بھی۔" روہن کے منہ سے نکلا۔

"میرا خیال ہے وہ کسی خانہ بدوش قبیلے کا ہوگا۔ یہ لوگ ایسی ہی جگہوں پر جا کر رہتے ہیں۔" پرکاش بچے کے بارے میں خیال پیش کرنے لگا۔

"تمہیں وہ خانہ بدوش لگتا ہے۔ کتنا پیارا تھا دیکھنے میں۔ کیا پتا وہ بھی کوئی روح ہی ہو۔" روہن دھیرے دھیرے اس کو لائن پر لانا چاہتا تھا۔ تاکہ جب وہ اس کی کہانی سنے تو ہنسے نہیں۔

"اب تم بھی شروع ہو گئے بڈھے کی طرح۔ خانہ بدوش خوب صورت نہیں ہو سکتے کیا۔ کیا پتا کسی اچھے گھرانے کے آدمی کا ٹانکا فٹ ہو گیا ہو خانہ بدوش عورت کے ساتھ۔ ہوتا ہے یار۔ لیکن اب کہاں گئے وہ؟" پرکاش چاروں طرف گھوم گھوم کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"کون؟" روہن نے پوچھا۔

"خانہ بدوش یار۔ اور کون ملے گا یہاں۔ ارے دیکھو وہی پیپل کا پیڑ جس کے بارے میں وہ بڈھا بات

کر رہا تھا آ۔" پرکاش درخت کی طرف بڑھنے لگا۔

"رہنے دے اب۔ چل واپس چل۔ لیٹ ہو رہے ہیں۔" روہن وہاں کھڑے کھڑے بولا۔ دل ہی دل میں نیرو کی یاد اور اس کی بتائی گئی وہ جگہ روہن کو عجیب سا احساس دلا رہی تھی۔ اس کا دل نہیں کر رہا تھا ایک پل بھی وہاں کھڑا رہنے کو۔

"ابے آ نا۔ دو منٹ میں کچھ نہیں ہوتا۔" پرکاش نے واپس آ کر روہن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچ لیا۔ "ویسے بھی دیر کس بات کی۔ ہم کو آج تو کالج بھی نہیں جانا ہے۔ تم سے تو آج وہ ملے گی۔ پیار بھری باتیں کرے گی۔ سچ میں بہت پیاری ہے۔ اگر اس کی طرف سے کوئی سازش نہ ہوئی تو تم بے شک اس سے شادی کر لینا۔" یہ کہہ کر پرکاش ہلکا سا ہنس پڑا۔

"مجھے نہیں جانا یار آگے۔ تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔" روہن اپنا ہاتھ چھڑا کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

نیرو کی باتیں اب اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح بجنے لگی تھیں۔ اس کا سر بھاری سا ہونے لگا۔ "میں یہیں رک جاتا ہوں۔"

"ارے ڈرپوک۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم۔ چلو ٹھیک ہے تم یہیں رک جاؤ۔ میں ابھی آیا۔ دیکھوں تو سہی کیسا پیڑ ہے اور کتنے واٹ کا بلب ٹنگا ہوا ہے اس پر جو ساری رات اس پر روشنی رہتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے پرکاش روہن کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ روہن اب اکیلا رہ گیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں اس کو ہوا کی سائیں سائیں میں سے چھن چھن کرتا رہی کچھ عجیب سی ہلچل سنائی دے رہی تھی۔ وہ سچ میں ہی ماننے لگا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو ضرور گڑبڑ ہے اس کی زندگی میں۔ نیرو کی رات کو کہی گئی باتیں رہ رہ کر اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ بے شک روہن کو وہاں ڈر نہیں لگ رہا تھا لیکن دماغ میں لگاتار عجیب و غریب طریقے سے رات کی یادوں کا بھنور اس کے دل و دماغ کو بے چین سا کر رہا تھا۔ اچانک روہن کو محسوس ہوا کہ کسی نے پیچھے سے اس کو چھو لیا ہے۔ گھبرا کر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

"شٹ۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" روہن دل ہی دل میں بڑبڑایا اور واپس مڑ کر پرکاش کی راہ دیکھنے لگا۔ پرکاش پیڑ کے پاس ہی کھڑا تھا۔ تبھی چھوٹی سی دیوار پر رکھا پتھر وہاں سے لڑھک کر نیچے گر گیا۔ اتفاق سے روہن ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اپنے آپ ہی روہن کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے اس نے دیوار کی دوسری طرف جھانکا۔ مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ سب کچھ عجیب تھا۔ لیکن روہن کو اب وہ سب عجیب نہیں بلکہ ایک اشارہ لگ رہا تھا۔ نیرو کی طرف سے اس کے وہاں پر ہونے کا۔

"تم۔ یہیں ہو کیا؟" روہن نے دھیرے سے کہا۔ مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ "نیرو۔ نیرو۔ اگر تم یہاں ہو تو جواب دو۔" روہن نے پھر پکار کر دیکھا۔ اگر کوئی ہوتا تو جواب ملتا۔ تبھی اس کو پرکاش اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ روہن چپ ہو گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ تم یہاں آؤ گے۔" پرکاش آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"ہاں۔ میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن تم زبردستی لے آئے۔ چلیں اب۔" روہن نے گھومتے ہوئے جواب دیا اور چلنے لگا۔

"یعنی تم میرے لیے یہاں نہیں آئے۔" پرکاش وہاں کھڑا ہو گیا۔

"اب چل یار۔ تیرے لیے ہی تو آیا ہوں۔ ورنہ تم منہ پھلا لیتے۔ اور مجھے اگلی بار کام پڑتا تو نخرے دکھاتے۔ چل اب۔" روہن واپس آ کر اس کے پا

ہن کھڑا ہو گیا۔
"لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ میرا کیا ہوگا۔" پرکاش اپنی جگہ سے ہلا نہیں وہیں کھڑا بولتا رہا۔
"کیا اناپ شناپ بک رہا ہے۔ اب چل بھی۔" روہن جھلا اٹھا۔ اس کو وہاں سے نکلنے کی جلدی تھی۔
"تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے دیو۔" پرکاش کے منہ سے "دیو" نکلتے ہی روہن اچھل پڑا۔
"کک..... کیا..... کیا کہا تم نے؟"
"میرا کیا ہوگا دیو۔ تمہارے وعدے کا کیا ہوگا۔ بولو۔"
اوہ مائی گاڈ۔ نیرو۔" روہن کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔
"ہاں دیو! میں اب بھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم نیرو کو لے آؤ یہاں۔ مجھے مکتی دے دو۔ پھر جو دل میں آئے کرنا۔ میں کب سے تمہارے انتظار میں تڑپ رہی تھی۔ کم سے کم مجھے یہاں سے نکال تو دو۔" کہتے ہی پرکاش دھڑام سے پیٹھ کے بل گر پڑا۔
"دیو۔ مجھے واپس لے چلو پیپل کے پاس۔"
"پرکاش کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" روہن نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کا سر اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ سب کچھ پلٹتا دکھائی دیا اس کو۔ زمین گھومتی سی لگنے لگی تھی۔
"مجھے واپس لے چلو دیو۔ دھوپ میں مجھے ان فیکشن ہو جاتا ہے۔ اس کا زہر تمہارے دوست کی رگوں میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے۔ مجھے جلدی سے وہیں لے چلو۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔" پرکاش اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔ اس کی سانسیں پھولتی جا رہی تھیں۔ روہن کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے پرکاش کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور پیپل کی طرف دوڑ پڑا۔
"ہاں۔ یہیں لٹا دو۔ پیڑ کے پاس۔" روہن نے ویسا ہی کیا۔
"مجھے مکتی دلانا دیو! اس کو لے جاؤ یہاں سے۔" کہتے ہوئے پرکاش کی آنکھیں بند ہو گئیں اور روہن نے ویسا ہی کیا جیسے اس کو ہدایت ملی تھی۔ وہ پہلے کی طرح کندھے پر اٹھا کر تیزی سے چلنے لگا۔
"ارے مجھے کندھے پہ کیوں اٹھا رکھا ہے الو کی دم۔ اتار نیچے۔ پرکاش کے بولتے ہی روہن کی جان میں جان آئی اور اس نے پرکاش کو کندھے سے اتار کر کھڑا کر دیا۔ پرکاش کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہت لمبی دوڑ لگا کر آیا ہو۔
"کیا تھا یہ۔ کہاں اٹھا کر لے جا رہا تھا مجھے۔"
"تمہیں معلوم بھی ہے تم کہاں ہو؟" روہن نے اس کا ہاتھ پکڑ کھینچ لیا اور آگے بڑھنے لگا۔
"بتا تو کیا ہوا؟" پرکاش کی سانسیں اب اعتدال پر آنے لگی تھیں۔
"چل باہر چل کر بتاتا ہوں۔" روہن نے کہا اور کچھ دیر بعد ہی وہ گاڑی کے پاس تھے۔
"تمہارے اندر بھوت سما گیا تھا۔" روہن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاہاہا..... تجھے پتا نہیں..... میں اب بھی بھوت ہی ہوں۔ خوفناک بھوت۔" پرکاش نے غرا کر کہا اور پھر بولا۔ "چپ بے۔ مجھے ایسے مذاق ایک دم گھٹیا لگتے ہیں۔ چل گاڑی میں بیٹھ۔" کہہ کر پرکاش ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔
"تمہیں یقین نہیں آ رہا نا۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ میں تمہیں کہاں سے لایا ہوں۔" روہن اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتا ہوا بولا۔
"ہاں پتا ہے۔ میں پیڑ کے پاس لیٹا ہوا تھا جب تم نے مجھے اٹھایا۔" پرکاش نے گاڑی اسٹارٹ کر کے جواب دیا۔

"کیوں۔ کیوں لیٹے ہوئے تھے تم وہاں۔" روہن نے پھر سوال کیا۔
پرکاش ایک پل کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر روہن کے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔ "پتا نہیں۔ کمال ہے یار۔ اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ کیا نیند آ گئی ہو۔ چھاؤں دیکھ کر۔"
"ہوں۔ ہو سکتا ہے۔" روہن نے بات کو بڑھانا نہیں چاہا۔ اس کو پرکاش کی فطرت کا پتا تھا۔ اگر وہ ابھی پرکاش کو وہ باتیں بتا دیتا جو ابھی تھوڑی پہلے ہوئی تھیں تو پرکاش دوبارہ وہیں جا کر چھان بین شروع کر دیا۔
"اب تو سیدھے چل رہے ہیں نا شروتی کے گھر۔"
"آئے ہائے۔ کیا بات ہے میری جان! تم تو بڑے بے چین ہو رہے ہو۔ فکر مت کرو۔ آج سارا دن وہ تمہارے ساتھ رہے گی۔ بس ہلکا سا اشارہ کر دینا اس کو۔" پرکاش شرارتی انداز میں بولتے ہوئے مسکرانے لگا۔
"تمہیں وہ کیسی لگتی ہے۔" روہن نے پرکاش سے پوچھا۔
"کیا مطلب؟"
"بس ایسے ہی۔ بتا نا..... کیسی لگتی ہے۔" روہن نے پھر زور دیتے ہوئے کہا۔
"پیاری سی ہے۔ خوب صورت ہے۔ شرمیلی ہے۔ یہ سارے نمبرز ملا کر میری بھابھی بننے کے لائق ہے وہ۔ لیکن اگر ٹیلے پر بلا کر ڈرانے کی سازش میں اس کا یا اس کے باپ کا کچھ ہاتھ ملا تو میں ان کو چھوڑوں گا نہیں۔ پہلے بتا رہا ہوں۔ مجھے دھوکے بازی سے سخت نفرت ہے۔" پرکاش نے سامنے آ گئے گدھے کو دیکھ کر گاڑی نیچے اتار دی۔
"میں کیا پوچھ رہا ہوں اور تم کیا جواب دے رہے ہو۔" روہن نے کہا۔
"ابے دے تو دیا جواب۔ پٹاخہ ہے ایکدم۔ آج بانہوں میں لے ہی لینا۔ ہاہاہا۔" پرکاش نے مسکرا کر کہا۔
"اور اگر مجھے کسی اور سے پیار ہو تو۔" روہن نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ارے بھائی اپنے ساتھ میری مٹی بھی کیوں پلید کروا رہا ہے۔ کتنی معشوقائیں ہیں تیرے پاس۔ کل شروتی کے لیے مرا جا رہا تھا اور اب مجھے مت بتانا کہ وہ نئی لڑکی کون ہے۔ سمجھا۔" پرکاش نے جھلا کر بناوٹی غصے سے اس کی طرف دیکھا۔
"میں تو مذاق کر رہا ہوں یار۔" روہن نے ہچکچاتے ہوئے بات کہی اور باہر دیکھنے لگا۔ گاؤں قریب آ گیا تھا۔
"مذاق کر رہا ہوں۔ ہونہہ۔" پرکاش نے عجیب سی شکل بنا کر اس کی نقل اتاری اور گھر کے سامنے گاڑی روک کر ہارن بجانے لگا۔
بڈھا لگ بھگ بھاگتا ہوا باہر آیا۔
"وہ تیار ہو گئی کیا انکل جی۔" پرکاش نے گاڑی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں بیٹا۔ وہ تو تیار ہے۔ تم کھانا تو کھا لو۔ شروتی نے بنا کر رکھا ہے تم دونوں کے لیے۔" روہن کچھ بولنے ہی والا تھا کہ پرکاش نے پہلے ہی بول دیا۔
"ٹھیک ہے انکل جی۔ ایک بار اور سہی۔"
اس کے بعد دونوں گاڑی سے اتر کر بڈھے کے ساتھ اندر آ گئے۔ اندر جاتے ہوئے' کھانا کھاتے ہوئے اور پھر باہر آتے ہوئے روہن نہایت باریک بینی سے رات کو بیتے ہوئے واقعے سے جڑے کسی بھی سراغ کی تلاش میں رہا۔ لیکن کچھ ہوتا تو ملتا۔ آخر کار چاروں گھر سے باہر نکل آئے۔ شروتی کے لیے

روہن نے پچھلا دروازہ کھول دیا اور وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"اچھا بابا۔ میں چار بجے تک آ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے بیٹی۔" اور پھر پرکاش سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "اچھا بیٹا۔ آرام سے جانا۔ اور اس کو بس اڈے پر اتار دینا۔ وہاں سے چلی جائے گی اپنے آپ۔"

"آپ کیوں فکر کرتے ہو انکل جی۔ ہم کالج ہی چھوڑ جائیں گے۔ اچھا اب اجازت دیں۔"

"بھگوان تمہارا بھلا کرے بیٹا۔" بڈھے کے اتنا کہتے ہی پرکاش نے کار آگے بڑھا دی۔

وہاں سے روانہ ہونے کے بعد جب روہن اور شروتی میں سے کوئی کچھ نہیں بولا تو مجبوراً پرکاش کو ہی اپنا منہ کھولنا پڑا۔ "جا روہن پیچھے بیٹھ جا۔"

"میں...... کیوں؟" روہن ہکلا سا گیا۔

پرکاش نے بیک ویو مرر کو سیٹ کر کے شروتی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ لگتا تھا اس پر پرکاش کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ یا شاید اس کا دھیان ان پر تھا ہی نہیں۔ اپنی لمبی کالی زلفوں کو بار بار کانوں کے پیچھے لے جانے کی کوشش کرتی ہوئی وہ باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ ایک دم پرسکون تھا۔ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح' نہ تو مسکان تھی اس کے چہرے پر اور نہ ہی کوئی شکن۔

"ارے تم نہیں تو کیا میں جاؤں گا۔ سیٹنگ تمہاری ہے یا میری؟" اس بار پرکاش نے جان بوجھ کر تیز لہجے میں کہا تھا۔ یہ سنتے ہی شروتی ایک جھٹکے کے لیے چونک سی گئی اس نے اچانک نظریں گھما کر پرکاش کو دیکھا اور اپنی گردن جھکا لی۔

"بھائی تم گاڑی چلاتے رہو نا۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔" روہن نے کھسیا کر جواب دیا۔ اس کا شروتی سے بات کرنے کا دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ ہوتا بھی تو انجان لڑکی سے کیا بات کرتا۔ اب تو ساری بات صاف ہو ہی چکی تھی۔ کم سے کم روہن کے دماغ کی حد تک۔

"عجیب قسم کے آدمی ہو تم۔ دو دن سے مجھے گدھے کی طرح ہانک رہے ہو اور اب کہتے ہو کہ دیکھ لے۔ اگر تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہے تو میں شروع ہو جاتا ہوں۔" پرکاش اپنی بات کا مطلب آنکھوں ہی آنکھوں میں روہن کو سمجھاتا ہوا بولا۔ اس کو اس طرح کی باتیں کرتے دیکھ کر شروتی کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ کچھ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ جب اس سے رہا نہ گیا تو وہ ان کی طرف دیکھ کر دھیان سے سننے لگی۔

"تم چلتے رہو نا بھائی۔ بتا تو رہا ہوں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ میری غلط فہمی تھی۔ تم جو سمجھ رہے ہو یہاں وہ مسئلہ نہیں ہے۔" روہن نے اس کو چپ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر یہ تیرا معاملہ نہیں ہے تو پھر میں اسے اپنا معاملہ بنا لیتا ہوں۔ اب بیچ میں مت بولنا۔" شہر نزدیک آتے دیکھ کر پرکاش نے اچانک نہر کے ساتھ بنے کچے راستے پر گاڑی موڑ دی۔ شروتی کانپ اٹھی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ یہ کہاں لے کر جا رہے ہیں آپ۔ گاڑی روکیے۔"

"فکر نہ کریں نیرو جی۔ یہ راستہ شارٹ کٹ ہے سیدھا وہیں جاتا ہے جہاں آپ جانا چاہتی ہیں۔ ہا ہاہا۔" کہہ کر پرکاش نے سیٹی بجانی شروع کر دی۔ شروتی بدحواسی میں کار کے شیشے پیٹنے لگی۔

"مجھے اتار دو۔ میں چلی جاؤں گی اپنے آپ۔"

روہن کو پرکاش کی اس حرکت پر تعجب ہو رہا تھا۔ اتنی بچکانہ حرکت پرکاش بھی کر سکتا ہے روہن کو قطعی امید نہیں تھی۔

"کیا کر رہا ہے یار۔ یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔ سمجھا

کر۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

پرکاش نے روہن کو دیکھتے ہوئے اپنی دائیں آنکھ دبائی' مجبوراً روہن کو چپ ہو جانا پڑا۔ جانے کیا کرنا چاہتا ہے یہ پرکاش۔

"آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں مجھے۔ کار روکیں پلیز۔" شروتی گڑگڑانے لگی۔

پرکاش نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ گاڑی اسی رفتار سے آگے دوڑتی رہی۔

"ہم نے سنا ہے کسی نے تمہاری قمیص پھاڑ دی تھی رات کو۔ کون عاشق تھا بھلا۔"

شروتی کو اس کی باتوں سے زیادہ اپنی جان کی فکر ہو رہی تھی۔ "مجھے نہیں پتا۔ آپ گاڑی روکیں پلیز۔"

"بتائیے تو سہی۔ پھر میں آپ کو واپس چھوڑ آؤں گا۔ وعدہ رہا۔ ویسے کسی کا بھی قصور نہیں ہے۔ آپ ہیں ہی اتنی خوب صورت کہ آپ کے ساتھ زبردستی کرنے کا موقع ملے تو کوئی پھانسی کی بھی پروا نہیں کرے گا۔ کیوں روہن؟"

روہن نے اس کی طرف دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔ اسے شروتی پر بہت رحم آ رہا تھا۔

"گاڑی روکیں پلیز۔ واپس لے چلیں۔ میں۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" بیچ میں ہی شروتی ہاتھ جوڑ کر رونے لگی تھی۔

"دیکھیں مس۔ مجھ پر آنسو اثر نہیں کرتے۔ لڑکیوں کا تو شکاری ہوں میں۔ چار پانچ ریپ کیس بھی ہیں مجھ پر۔ اس لیے سلامتی اسی میں ہے کہ آپ وہ بولنا شروع کر دیں جو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ ورنہ۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی عادت نہیں ہے۔ اور آپ کے معاملے میں تو میں رعایت دینے کے موڈ میں قطعی نہیں ہوں۔" پرکاش نے فلمی لہجے میں ڈائیلاگ بولتے ہوئے کہا۔

شروتی کا گلا سوکھ رہا تھا پرکاش کی باتیں سن کر۔ دھیرے دھیرے اپنی سسکیوں پر قابو پاتی ہوئی بولی۔ "کیا؟"

"کیا یہ سچ ہے کہ رات کو کسی نے آپ کی قمیص پھاڑ دی تھی۔" پرکاش نے پوچھنا شروع کیا۔

شروتی کا سر شرم کے مارے جھک گیا۔ لیکن اس نے اپنی گردن ہاں میں ہلا ہی دی۔ پرکاش نے حالانکہ اس کا ہلتا ہوا سر دیکھ لیا تھا۔ لیکن پھر بھی بولا۔ "بولو۔"

"ہاں۔" بڑی مشکل سے شروتی کے گلے سے آواز نکلی۔

"کس نے؟" پرکاش کا اگلا سوال تھا۔

"پتا نہیں۔" شروتی نے سر جھکائے ہوئے ہی جواب دیا۔

"مطلب کسی نے آپ کے کپڑے پھاڑ دیے اور آپ کو پتا بھی نہیں چلا۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں آپ کی اس بات پر یقین کر لوں گا۔"

"وہ ہمارے گاؤں میں اکثر کچھ بھی عجیب ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں عادت ہو گئی ہے۔" شروتی نے جواب دینے میں ہی بھلائی سمجھی۔

"عادت...... کپڑے پھاڑنے کی؟"

شروتی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سسکنے لگی۔ اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

"چلیں چھوڑیں۔ یہ بتا دیں کہ میرے یار سے آپ کب ملی تھیں۔" پرکاش نے اپنا لہجہ کسی قدر نرم کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی؟" شروتی کچھ نہیں سمجھی۔

"اس سے۔ روہن سے۔ آپ کی ملاقات کب ہوئی تھی۔" پرکاش نے روہن کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

"میری۔" وہ حیرت سے بولی۔ "میں نے تو اب سے پہلے ان کو کبھی دیکھا بھی نہیں۔" اگرچہ شروتی کا سسکنا اب کم ہو گیا تھا لیکن انجانے ڈر سے وہ اب بھی کانپ رہی تھی۔

"اچھا۔ تمہیں پتا نہیں کہ یہ تمہارا کتنا دیوانہ ہے۔ تمہارے پاس جانے کے لیے یہ مجھے رات کو اس ویرانے ٹیلے پر لے گیا۔ اتنا پاگل ہو چکا ہے یہ۔ اور تم کہتی ہو کہ اس سے پہلے تم کبھی ملی ہی نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" پرکاش نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

شروتی نے حیرانی سے روہن کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ لیکن کبھی ایک بار بھی کہیں اسے دیکھ لینے کا احساس اپنے دل میں نہیں لا پائی۔

"میرا یقین کیجیے۔ میں نے ان کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔ میں تو اس شہر کے علاوہ کبھی کہیں گئی ہی نہیں۔"

"میں کہہ تو رہا ہوں یار کہ یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔ مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ وہ کوئی اور ہے۔" روہن سے چپ بیٹھا نہیں گیا۔

"تم چپ ہو جاؤ بس۔ آج کے بعد تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنی مجھے۔ اب کون سے ٹیلے پر لے جانے کی سوچ رہا ہے مجھے۔ تمہارا دماغ تو خراب ہو ہی گیا ہے۔ مجھے بھی پاگل کر کے چھوڑو گے۔ لیجیے مس شروتی آپ کا کالج آ گیا۔ یہی ہے نا۔"

سنتے ہی شروتی کی خوف کے ماری سکڑی ہوئی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ اپنا چہرہ اٹھا کر اس نے چونک کر باہر کی طرف دیکھا۔

"ہاں......آپ......اوہ......لیکن آپ کو کیسے پتا میرے کالج کا۔" دروازہ کھولنے کی کوشش کرتی وہ بولی۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔

"اس شہر میں یہی ایک کالج ہے میرے خیال سے۔ خیر معاف کرنا میں کچھ جاننا چاہتا تھا اس لیے مجھے آپ کو ڈرانے کے لیے گھٹیا باتیں کہنی پڑیں۔ پچھلے دروازے کا لاک کھولنا روہن۔"

شروتی کچھ نہ بولی۔ اس کا من اب بھی اچھل رہا تھا۔ بچنے کی کم ہی امید تھی اس کو۔ دروازہ کھلتے ہی وہ تیزی سے باہر نکلی اور بنا کچھ بولے روڈ پار کرنے لگی۔

"یہ سب کیا بکواس تھی پرکاش۔ چل اب۔" روہن کی آنکھیں کالج کے گیٹ کی طرف بڑھتی ہوئی شروتی کا پیچھا کر رہی تھیں۔

"ارے رک تو سہی۔" پرکاش بھی بڑے غور سے شروتی کو دیکھے جا رہا تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر شروتی ٹھٹکی اور پیچھے مڑ کر دیکھا 'کار' کی طرف۔ پرکاش مسکرانے لگا اور اس کی طرف اپنا ہاتھ ہلا دیا۔ شروتی اپنی نظریں جھکاتی ہوئی مڑی اور سیدھی آگے بڑھ گئی۔

"یہ کیا تھا بھائی۔ تم ایسے بھی ہو گیا؟ کیا کر رہے تھے تم۔" روہن نے شروتی کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی پوچھا۔

"ایک تیر سے دو شکار۔" یہ کہہ کر پرکاش روہن کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور گاڑی چلا دی۔

"کیا مطلب؟" روہن اس کی بات سمجھ نہیں پایا۔

"تم اب میری باتوں کا مطلب پوچھنا چھوڑو اور اپنے اس واہیات ناٹک کی کہانی بتا۔ پہلے تم ضد کر کے مجھے وہاں لے گئے جہاں آدمی تو کیا آدمی کی ذات بھی نہیں رہتی۔ پھر واپس آتے ہوئے تمہیں وہ لڑکی مل بھی گئی۔ اب اس لڑکی نے انکار کر دیا تو تم کہہ رہے ہو کہ وہ یہ نہیں کوئی اور ہے۔ مطلب کیا ہے تیری ان باتوں کا۔ بے وقوف سمجھا ہوا ہے کیا؟" پرکاش اس کی طرف گھورتا ہوا بولا۔

"نہیں بھائی میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔ ہمیشہ میں نے تمہیں بڑے بھائی کی طرح مانا ہے۔

لیکن سچ میں۔ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب آخر ہو کیا رہا ہے۔ یہ باتیں سوچ سوچ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ تم ہی بتاؤ میں کروں تو کیا کروں۔" روہن نے سیٹ سے سر ٹکا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"ہوں۔ مگر تم کس وجہ سے کہہ رہے ہو کہ وہ لڑکی کوئی اور ہے۔ پھر اس کا فون آیا تھا کیا؟" پرکاش نے اس سے پوچھا۔

"ہ ہاں۔" روہن نے یونہی کہہ دیا۔

"دفعہ کر ان باتوں کو۔ یہ لڑکی بھی پٹاخہ ہے بالکل۔ تم کہو تو اس کو تمہارے لیے پٹا لوں۔ چلے گی نا؟" پرکاش نے ساری باتیں چھوڑ کر شروتی کی بات پکڑ لی۔

"کیسے؟" روہن آنکھیں بند کیے ہوئے ہی بولا۔

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ صرف یہ بتاؤ کہ اس کے بعد تو تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مطلب تمہارے دماغ کا فتور دور ہو جائے گا نا۔" پرکاش نے گاڑی روک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

روہن کچھ دیر چپ بیٹھا رہا، پھر بولا "نہیں یار۔ مجھے اس سے ملنا ہے ایک بار۔ اس کے بعد تم جو کہو گے میں کر لوں گا۔"

"اس لڑکی کو دیکھا ہے تم نے۔" پرکاش نے سوال کیا۔

"نہیں۔" روہن نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہی بات۔ اسی بات پر اتنا غصہ آتا ہے مجھے۔ کیوں اپنی اچھی خاصی زندگی کو گدھے پر لادنا چاہتا ہے۔ تم نے اس کو دیکھا تک نہیں ہے۔ پھر کیوں اس کے پیچھے پاگل ہوئے جا رہے ہو۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ لڑکی شرطیہ شروتی سے خوب صورت نہیں ہو سکتی۔ کبھی اس کو نظر بھر کر دیکھا ہے۔ کتنی ٹھنڈک ملتی ہے کلیجے کو۔" پرکاش نے کہتے ہوئے دل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"بھائی اگر تمہیں ٹھنڈک ملتی ہے تو تم ہی لے آؤ نا اسے۔" روہن اس کی باتوں سے تنگ آ گیا۔ اس کا دماغ تو اب وہیں گھوم رہا تھا۔ "عمر کوٹ" میں۔

"تم کیا سمجھتے ہو آج بھی میں اس لیے چپ رہا کہ یہ تیری ہے۔ ورنہ میں تو بلو کے گھر کا ٹکٹ کٹا کر ہی رہوں گا۔ کم سے ایک بار۔" پرکاش نے یقین کے ساتھ کہا۔

"ہونہہ۔ بڑے چپ رہے تم آج۔ باتوں ہی باتوں میں تم نے تو جان ہی نکال دی تھی اس بیچاری کی۔ اور کہہ رہے ہو کہ میں چپ تھا۔ اپنے ساتھ میری بھی بے عزتی کروا دی اس کے سامنے۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ اب وہ لڑکی تمہاری طرف دیکھنا بھی پسند کرے گی؟" روہن نے قدرے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"تم نے مجھے کیا اپنی طرح الو سمجھ رکھا ہے۔ ایک ایک دن میں دو دو لڑکیاں پٹائی ہیں میں نے۔ اور یہ تو بیچاری بہت نادان ہے۔ یہ تو گھنٹے بھر کا بھی کام نہیں ہے۔ لڑکیوں کی سائیکولوجی۔ بائیوگرافی' کیمسٹری سب جانتا ہوں میں۔" پرکاش نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

روہن پرکاش کی اس بات پر ہنسے بنا نہیں رہ سکا۔ پرکاش نے غلط نہیں کہا تھا۔ روہن کی فطرت کے عین برعکس وہ ایک دم ٹی ٹوئنٹی اسٹائل کا کھلاڑی تھا۔ جس لڑکی پر دل آ گیا' اس کو پٹانا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی تھی۔ اور پھر وہ دوسرے میچ کی تیاری شروع کر دیتا۔ بس اسی بات پر روہن اور پرکاش میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"چلو جو تمہاری مرضی ہو کر لینا۔ مگر میرا بھی تو کچھ خیال کرو۔"

"اب وہ لڑکی کہاں ملے گی؟" پرکاش فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"عمر کوٹ میں۔" روہن نے بھی فوراً ہی جواب دیا۔

"کس کا کوٹ؟" پرکاش نے شاید نام ڈھنگ سے نہیں سنا تھا۔

"کسی کا کوٹ نہیں۔ عمر کوٹ۔ تھرپارکر۔ اور ہم کبھی ملے بھی نہیں ہیں۔" روہن نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"یہ لو۔ تو کیا خواب دیکھا تھا؟" پرکاش نے مذاق میں کہا۔

"سچ بتاؤں یا جھوٹ؟" روہن نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"اب بھی جھوٹ بولے گا تو دوں گا ایک کان کے نیچے۔ سمجھا کیا ہے مجھے۔ چلو شروع ہو جاؤ۔" پرکاش نے اس کو پیار سے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"ہاں خواب آیا تھا۔" روہن نے بنا رکے کہہ دیا۔

"کیا؟" پرکاش کو اس کی بات مذاق لگی تھی۔

"خواب دیکھا تھا بھائی۔ تمہاری قسم۔" روہن کو آخر کسی نہ کسی سے تو اپنا یہ مسئلہ شیئر کرنا ہی تھا۔ اس لیے اس نے اپنے سب سے اچھے دوست سے شیئر کرنا ہی بہتر سمجھا۔

"لگتا ہے تمہارے دماغ میں گرمی چڑھ گئی ہے۔ چلو کولڈ ڈرنک پیتے ہیں بعد میں بات کریں گے۔" پرکاش نے ہنستے ہوئے کہا۔

☆☆☆

"یہ سب کیا ہے یار۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تمہیں اس لڑکی کو نہیں بلکہ کسی اچھے ماہر نفسیات کو تلاش کرنا چاہیے۔" ساری بات سننے کے بعد پرکاش نے اپنا قیمتی مشورہ اسے دیا۔

دونوں ایک ڈھابے پر بیٹھے کولڈ ڈرنکس پی رہے تھے۔

"تم ایسا بول سکتے ہو بھائی۔ کیونکہ تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ اگر یہ سب میرے دماغ کا فتور ہوتا تو بتاؤ وہی لڑکی جو مجھے خوابوں میں دکھائی دیتی ہے وہ اصلیت میں کیسے مل گئی۔ جبکہ ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں ہے۔ پھر انکل جی نے جو کچھ پرانے ٹیلے کے بارے میں بتایا۔ اس لڑکی نے بھی تو مجھے وہیں بلایا تھا۔ ہماری گاڑی کے ٹائروں کی اپنے آپ ہوا نکل گئی۔ صبح اپنے آپ بھر گئی۔ خواب میں اس نے میرے سامنے اپنی قمیص پھاڑ دی اور صبح وہ بھی سچ تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ میں نے تمہارے منہ سے بھی نیرو کی آواز سنی ہے۔ جب ہم ٹیلے پر گئے تھے۔ کیا اب بھی تم کہو گے کہ یہ سب محض وہم ہے۔" روہن نے اپنی بات کو پختہ کرنے کے لیے پھر سے ان باتوں کو دوہرایا۔

"ہوں۔ تبھی تو مجھے لگ رہا ہے کہ اس میں باپ بیٹی کی سازش کی بو آ رہی ہے۔ تمہارے ہر خواب کا اسی لڑکی سے تعلق ہے۔ اور جس نے کہانی سنائی وہ اس کا باپ ہے۔ ٹیلا بھی ان کے گاؤں کا ہی ہے۔ بچہ وہ کھڑا کر سکتے ہیں وہاں۔ اور ٹائروں کی ہوا بھی نکال سکتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یقین ہوگا کہ واپس آتے ہوئے ہم ان کا ہی دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ صبح ہمارے جاگنے سے پہلے ٹائروں میں ہوا بھی بھر سکتے ہیں وہ لوگ۔ تمہیں یاد ہے جب ہم نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو شروتی نے کیا کہا تھا۔ بابا وہ آ گئے۔ کیا مطلب ہے اس کا؟ یہی نا کہ وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ انہی کی سازش ہے۔ تم مانو یا نہ مانو۔" پرکاش نے ان تمام باتوں کا نچوڑ نکالتے ہوئے کہا۔

"اور تم جو مجھے دیو۔ دیو کہہ کر پکار رہے تھے وہ؟" روہن اس کی ساری بات سننے کے بعد بولا۔

"اب تمہاری دماغی حالت ہی ایسی ہو گئی ہے تو یہ

تمہارا وہم بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے تو یہی یاد آ رہا ہے کہ پیپل کے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر ایک بار لیٹنے کا دل ہوا تھا۔ پھر تم مجھے وہاں سے کندھے پر اٹھا کر بھاگ لیے۔" پرکاش اب بھی روہن کی پچھلے جنم اور روح والی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"تم سے اس بارے میں بات کرنا ہی بیکار ہے۔ اسی لیے تو میں نے اتنے دنوں تک تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ صرف روی کو ہی بتایا تھا مگر وہ ڈر گیا اور ساتھ آنے سے انکار کر دیا۔" کچھ رک کر روہن نے پھر بولنا شروع کیا۔ "چلو تمہاری بات میں مان لیتا ہوں۔ مگر ایک بار عمر کوٹ جا کر اس لڑکی کا پتا لگانے میں کیا حرج ہے۔ اگر کوئی نیرو وہاں مل گئی تو پھر تو تمہیں یقین ہو جائے گا نا۔" روہن اس کو سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا۔ مگر پرکاش اس کو اب بھی کوئی سازش سمجھ رہا تھا۔

"دیکھو اول تو کوئی لڑکی تمہیں وہاں ملنی نہیں ہے۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ بس تم ایک بار یہاں تک آ جاؤ۔ اس کے بعد شرافت اور نزاکت کا چولا پہن کر شروتی تمہیں پھنسا ہی لے گی۔ لیکن اگر کوئی لڑکی وہاں مل بھی گئی تو کون سی بڑی بات ہے اتنا بڑا ناٹک کرنے والوں کے لیے۔ بول نا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں بیٹھی نیرو بھی اس سازش میں شامل ہو۔"

"مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ خواب تو خود مجھے ہی آتے ہیں نا۔ اب میرا خواب بھی کیا کسی سازش کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ یا کہیں تمہیں یہ بھی تو نہیں لگ رہا کہ میں بھی اس سازش میں شامل ہوں اور جھوٹ بول رہا ہوں خواب کے بارے میں۔" روہن نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تم سازش کا حصہ کیسے ہو سکتے ہو۔ اگر کوئی سازش ہے تو تمہارے ہی خلاف ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ خواب سازش کا حصہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں

ہما اسلم — احمد پور سیال
اے دوست نہ کبھی بھول سکی میں میلہ تیری بستی کا
میں تجھ سے کیسے دور رہوں تو حصہ میری ہستی کا
اے لوگو نہ اصرار کرو وہ مجھ سے مل نہ پائے گا
وہ چاند زمیں پہ کیوں اترے وہ عادی ہے کب پستی کا

عرفان احمد ملانا .... میانوالی شیخاں
پاؤں میں رشتوں کی زنجیریں ہیں، دل میں خوف کی
ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے گھروں میں قید ہیں

حنا، وینا شاہ — کراچی
مکان و لامکاں میں لائق حمد و ثنا تو ہے
فقط ہے بندگی تیری، جہانوں کا خدا تو ہے
اندھیرے میں اُجالے میں ہے جو بھی، دیکھتا تو ہے
تصور میں نہیں آتا تصور سے ورا تو ہے

کسی نیورولوجسٹ سے بات کرنی پڑے گی۔" پرکاش نے ایک اور منطق جڑ دی۔

"شٹ۔ یار تم بات کو بار بار وہیں لا کر چھوڑ دیتے ہو۔ آخری بات یہ ہے کہ کسی کو اور خاص طور سے ان باپ بیٹی کو میرے خلاف سازش سے ملے گا کیا؟" روہن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔

"تمہاری بے تحاشہ دولت۔ تمہیں پیار کے جال میں پھنسا کر یہ شروتی یا وہ نیرو تم سے شادی کر سکتی ہیں۔ اور پھر آدھی جائیداد کی مالک بن سکتی ہیں۔ اس میں کسی اور کا حصہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی خاص دوست یا رشتے دار کا۔ کیونکہ اتنی بڑی پلاننگ صرف ان باپ بیٹی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمیں اس کی جڑ ٹٹولنی ہے۔ کوئی نہ کوئی تو ضرور ہے اس سب کے پیچھے اور میں آج ہی پتا لگا کر رہوں گا۔" پرکاش نے بوتل خالی کرتے ہوئے کہا۔

روہن نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ "اچھا آج ہی پتا کر

لے گا۔ پوچھ سکتا ہوں کیسے؟" روہن پوچھ بیٹھا۔
"ٹائم کیا ہوا ہے۔" الٹا پرکاش نے پوچھا۔
"ڈیڑھ بجنے والا ہے۔ کیوں؟"
"شروتی آتے ہوئے بول رہی تھی کہ وہ چار بجے تک آئے گی گھر۔ بس سے جانے میں اس کو ڈیڑھ گھنٹہ تو لگتا ہی ہوگا۔ جلدی سے ایک ایک بوتل اور منگوا لے۔ پھر کالج کے سامنے چلتے ہیں؟" پرکاش نے ویٹر کو اشارہ کیا۔
"آخر کیا کرنے کا سوچ رہے ہو بھائی؟" روہن عجیب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"شروتی کو سب کچھ بتانا ہی پڑے گا۔"
"تو کیا پھر سے شروتی کو زبردستی گاڑی میں ڈالنے کا سوچ رہے ہو بھائی؟" روہن نے حیرت سے پوچھا۔
"شش۔" پرکاش نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔
یہ سوچ کر ہی روہن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "اور اگر وہ بے قصور نکلی تو۔"
"تو کیا۔ صبح اس کو واپس کالج چھوڑ دیں گے۔ ہمیں کون جانتا ہے۔" پرکاش نے بے پروائی سے کہا۔ جیسے کسی لڑکی کو اٹھانا کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔
"تمہاری گاڑی کا نمبر؟" روہن کسی طرح اس کو اس حرکت سے باز رکھنا چاہتا تھا۔
"میں نے آج تک اپنی گاڑی پر اوریجنل نمبر پلیٹ لگائی ہے کیا۔" پرکاش نے اپنی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔
"میرا خیال ہے اب ہمیں گھر چلنا چاہئے۔ ممی بھی فکر مند ہو رہی ہوں گی۔"
روہن اس کے خرافاتی چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔
"یہ تو اور بھی اچھا رہے گا۔ ویسے بھی مجھے آج تمہیں واپس بھیجنا ہی تھا گاڑی دے کر۔ مگر اب تو تمہیں ٹیکسی کرنا پڑے گی۔" پرکاش نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
"یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ بس تم دھیان رکھنا۔ اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرنا۔ بیچاری بہت معصوم ہے۔" روہن نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"تم چپ ہی رہو یار۔ میں کون سا کسی برے مقصد سے اسے اغوا کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ پوچھنا ہی تو ہے۔ ہاں۔ اگر وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ سیٹ ہو جاتی ہے تو پھر تم کوئی اعتراض مت کرنا۔ ٹھیک ہے نا۔" پرکاش ہنستے ہوئے بولا۔
روہن نے کوئی جواب نہیں دیا وہ چپ چاپ پرکاش کی طرف دیکھتا رہا۔ بے شک پرکاش نے کوئی غلط کام نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس کو زبردستی رات بھر روکے رکھنا بھی تو اغوا ہی کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ کتنی نازک اور کمسن ہے بیچاری۔ سوچ کر ہی روہن کا دل کر رہا تھا کہ وہ پرکاش کو نہ جانے دے۔ مگر نیرو کی سچائی جاننے کی جستجو اس کو کچھ بھی کرنے یا کہنے سے روک رہی تھی۔ پرکاش نے اس سازش کو جاننے کے لیے جو راستہ دکھایا تھا اس کے دل میں اس بات کو لے کر کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔
"پھر بھی یار۔" روہن اب بھی پرکاش کی ضد کے خلاف تھا۔
"فکر مت کرو۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں دل کا برا نہیں ہوں۔" پرکاش نے روہن سے ہاتھ ملایا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

☆☆☆

پرکاش نے کچھ ضروری انتظامات کیے اور پھر

واپس آ گیا۔ کالج کے گیٹ پر گھنٹہ بھر انتظار کرنے کے بعد اس کو شروتی باہر آتی دکھائی دی۔
"او۔ آ گئی۔" پرکاش نے دل ہی دل میں کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے کی طرف لے گیا جہاں شروتی روڈ پار کر کے آنے والی تھی۔ شروتی نے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے ہی گاڑی پہچان لی تھی اور پرکاش کو بھی اپنی طرف تکتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور اسے نظر انداز سا کر کے کالج سے تھوڑا آگے گئی ہی تھی کہ پرکاش نے گاڑی اس کے برابر میں روک دی۔
"ہائے شروتی۔"
شروتی نے ترچھی نظروں سے پرکاش کو دیکھا اور بنا کچھ بولے آگے بڑھ گئی۔ پرکاش نے ایک پل بھی نہیں گنوایا۔ فٹافٹ گاڑی سے اترا اور تیزی سے چل کر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔
"میں بھی گاؤں ہی جا رہا ہوں آؤ نا۔ بیٹھ جاؤ۔"
شروتی نے آنکھیں اٹھا کر پرکاش کو گھورا۔
"مجھے جانے دو۔ میں بس میں چلی جاؤں گی۔ ہٹو میرے راستے سے۔"
"تم تو بے وجہ اس بات کو دل پر لے رہی ہو۔ وہ صرف ہلکا سا مذاق تھا۔ اگر میں سنجیدہ ہوتا تو تمہیں یہاں کیوں چھوڑتا۔ مان بھی جاؤ۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ گاؤں میں۔" پرکاش نے اس کو پیار سے منانے کی کوشش کی۔ پرکاش کو اپنا باتوں کا ہلکا سا اثر شروتی پر ہوتا ہوا دکھائی دیا اس کی آنکھوں کے جھک جانے سے۔
"تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو۔ یہ میرا کالج ہے۔ یہاں سب مجھے جانتے ہیں۔ کوئی کیا سوچے گا؟ پلیز ہٹ جاؤ اور جہاں جانا ہے چلے جاؤ۔ میں بس سے جا سکتی ہوں۔ روز ہی جاتی ہوں۔ پلیز مجھے جانے دو۔" کہتے ہوئے شروتی نے التجائی لہجے میں
پرکاش کو بھی اس کی باتوں سے بات بنتی دکھائی دی۔
"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے نازک دل کی ہو کہ ذرا سے مذاق کو بھی برداشت نہیں کر پاؤ گی۔ میں نے تو صرف اپنا مان کر مذاق کیا تھا۔ یونہی تمہارے اس پیارے سے چہرے پر غصہ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ کہو تو یہاں سب کے سامنے کان پکڑ کر مرغا بن جاؤں۔ مگر پلیز۔ معاف کر دو اور مان جاؤ۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ تمہاری قسم۔" اور پرکاش نے سچ میں ہی اپنے کان پکڑ لیے۔ شروتی شرمندہ سی ہو گئی۔ حالانکہ پرکاش کی کہی باتوں نے اس کا دل چھو لیا تھا۔ پھر بھی وہ وہاں سب کے سامنے

قابل غور

□ جو شخص دکھ پہنچائے اور پریشانی میں اضافے کا سبب بنے اس سے تعلق توڑ لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔
□ دوسروں کے چہروں پر مسرتوں کے دیئے روشن رکھنے کے لئے اپنی خوشیاں قربان کر دینا ہی حوصلے اور ہمت کا کام ہے۔
□ محبت سب سے کرو مگر اعتبار چند لوگوں پر۔
□ ماضی کی تلافی مستقبل سے کرو۔ پچھلے گناہوں کو نئی نیکیوں سے مٹاؤ۔
□ جو چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی خواہش فضول ہے۔
□ کبھی کبھی ہم دانستہ یا نادانستہ غلط راہوں پر نکل جاتے ہیں۔ کبھی خود کو آزمانے کے لئے کبھی کبھی دوسروں کو۔
□ اپنے علم دوسروں کو سکھاؤ تاکہ تمہاری معلومات کی بنیاد مستحکم ہو اور علم بھی سیکھتے رہو تاکہ تمہاری معلومات میں اضافہ ہو۔
(فوزیہ سحر کائنات' کراچی)

گاڑی میں بیٹھنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جانے کیا سوچ کر شروتی نے کہا۔

"تھوڑا آگے آ جاؤ پلیز۔ یہاں اس طرح میرا تماشہ مت بناؤ۔" یہ کہہ کر شروتی آگے بڑھ گئی۔

پرکاش خوشی سے اچھلتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا' اور پھر آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا رہا۔ بس اسٹینڈ آتے ہی شروتی کی چال دھیمی پڑ گئی تھی۔ شاید اس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا گاڑی میں بیٹھنے کا۔ یہ فیصلہ کرنے میں اس بات کا بھی اہم دخل تھا کہ صبح انہوں نے صحیح سلامت اسے کالج چھوڑ دیا تھا۔

"اب آ بھی جاؤ۔" پرکاش نے گاڑی اس کے برابر میں روکتے ہوئے کہا۔

شروتی نے جھجکتے ہوئے سڑک پار لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ کسی کی توجہ بھی اپنی طرف نہ پا کر وہ فٹ سے دروازہ کھول کر اندر آ بیٹھی۔

"جلدی چلو یہاں سے۔" ایک لمبی سانس لیتے ہوئے شروتی نے کہا اور آگے والی سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔

پرکاش نے موقع دیکھتے ہی آگے سے یوٹرن لیا اور اپنے پہلے سے دیکھے گئے ٹھکانے کی طرف کار دوڑا دی' قسمتی سے سر کو سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھی شروتی کو سمت بدلنے کی بھنک بھی نہیں پڑ سکی۔

"کون سا سال چل رہا ہے تمہارا۔" پرکاش نے شروتی کے ساتھ باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ دیر تک شروتی یونہی بن بولے بیٹھی رہی۔ پھر جب کافی دیر تک پرکاش کی طرف سے دوسرا سوال نہیں داغا گیا تو اس نے منہ کھول ہی دیا۔

"بیسواں۔"

"ہاہاہا۔ میں تمہاری عمر نہیں پوچھ رہا تھا۔ پھر بھی شکریہ۔ ویسے کالج میں کون سا ایئر ہے؟"

"جی فرسٹ ایئر۔" شروتی نے نظریں جھکائے ہوئے ہی جواب دیا۔

"شادی کب کر رہی ہو۔"

پرکاش نے پہلے سوال کا جواب ملتے ہی دوسرا سوال کر دیا لیکن شروتی نے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"کوئی لڑکا دیکھ رکھا ہے یا میں اپنے لیے کوشش کروں؟" پرکاش نے رومانٹک لہجے میں پوچھا۔

شروتی اس طرح کی باتیں سن کر شرما سی گئی۔ اس کو اس طرح کی باتوں کی عادت نہیں تھی شاید۔

"کیا بات ہے؟ ابھی تک ناراض ہو کیا۔" پرکاش کی اگلی بات بھی سوال ہی تھی۔

"گھر پہنچنے میں اور کتنا وقت لگے گا۔" شروتی نے بات پلٹ کر سوال کیا۔

وہ پرکاش کے بے ڈھنگے سوالوں کا رخ موڑنا چاہ رہی تھی۔ بے شک وہ اپنی مرضی سے کار میں بیٹھی تھی مگر ابھی تک بھی اپنے اس فیصلے پر اس کو حیرت ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کس ذہنی دباؤ کے تحت وہ پرکاش کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر شکن اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ اپنے آپ سے خوش نہیں تھی۔

"اتنا ہی جتنا تمہیں بس سے لگتا ہے۔" کچھ رکتے ہوئے پرکاش نے اپنی بات پوری کی۔ "اگر سب کچھ ٹھیک طریقے سے ہو گیا تو۔"

شروتی کا ماتھا ٹھنکا' اس نے فوراً چہرہ اٹھا کر بیک ویو مرر سے اس کی طرف دیکھا جہاں پرکاش سے نظریں ملائیں۔

"کیا مطلب؟"

"تم گھبرا بہت جلدی جاتی ہو۔ کبھی یہ بھی سوچا ہے ایسا ویسا

کیا نہیں ہے کیا؟" پرکاش کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ ابھر آئی۔ شروتی کو احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے گاؤں سے الٹی سمت میں کسی نامعلوم جگہ کی طرف جا رہے ہیں۔

"پلیز ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ جلدی سے مجھے گھر پہنچا دو۔" سچ میں وہ ڈری ہوئی تھی۔ بار بار اپنے رومال سے چہرہ پونچھتی ہوئی وہ دل ہی دل میں اپنے کار میں بیٹھنے کے فیصلے پر خود کو کوس رہی تھی۔

"کون سا گھر؟ پرانے ٹھیے والا۔" پرکاش نے اب کی بار تو اس کی جان ہی نکال دی۔

"ایسا مذاق نہ کریں۔ مجھے رونا آ جائے گا۔"

اس کی اس بات پر پرکاش نے عجیب لہجے میں قہقہہ لگایا۔ "پہلی رات تو ہر لڑکی روتی ہے۔"

شروتی کے چہرے پر کچھ خوف کی پرچھائیاں چھلکنے لگیں۔

"یہ یہ یہ کیا بکواس کر رہے ہیں آپ۔ میں نے آپ پر بھروسہ کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے کسی بھی بس اسٹینڈ پر اتار دو۔ میں اپنے آپ چلی جاؤں گی بس پکڑ کر۔" شروتی کے لہجے میں غصہ تھا۔ مگر اس کی زبان ڈر کے مارے لڑکھڑا رہی تھی۔

"ڈونٹ وری سویٹ ہارٹ۔ غلطی تو ہم نے کی تھی تم پر بھروسہ کر کے۔ روہن کے ساتھ تم نے جو کچھ کرنے کی کوشش کی۔ اب کیا اس کا بدلہ بھی نہ لیں۔ آج رات تم میرے ساتھ گزارو گی اور تمہاری قسم آج تک میں نے تمہاری جیسی خوب صورت لڑکی کے ساتھ رات نہیں گزاری۔ میرا تو سوچ سوچ کر ہی برا حال ہو رہا ہے۔ دم نکلا جا رہا ہے میرا۔" پرکاش بات بات پر ایک نئے انکشاف سے باز نہیں آ رہا تھا۔

شروتی کی حالت صبح کے جیسی ہی ہو گئی۔ پہلی بار

نعت شریف

یارب درِ نبیؐ پہ رسائی ہو کس طرح
رنج وغم والم سے رسائی ہو کس طرح
عکس جمال سرور کو نین کے بغیر
روح ودل ونظر کی صفائی ہو کس طرح
محبوب کبریا کا در پاک چھوڑ کر
اللہ تک کسی کی رسائی ہو کس طرح
قرآن میں جن کی شان بیاں خود خدا کرے
بندے سے ان کی مدح سرائی ہو کس طرح
صبح وشام جو نام محمدؐ لیا کرے
دل گیر وغمزدہ وہ فدائی ہو کس طرح
جب تک دکھائے راہ نہ سیرت حضورؐ
بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی ہو کس طرح
جب تک پرت پرت میں نہ عشق رسولؐ ہو
دل کی تہوں سے ختم برائی ہو کس طرح
فقیر صابر لنگاہ میں ہوں بندہ محبوب
غیروں کے در پہ ناصیہ سائی ہو کس طرح
(فقیر محمد بخش ۔۔ خانیوال)

اس نے گردن گھما کر باہر کا جائزہ لیا۔ سب راستے انجانا تھا۔ انجان راستے۔ انجان مرد۔ اور انجان صورت حال۔ شروتی اندر تک کانپ گئی۔

"کہاں جا رہے ہو تم؟ مجھے اتار دو پلیز۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اب اس کی آواز میں روکھا پن اور غصہ نہیں بلکہ بے بسی اور اور کپکپاتا ہوا لہجہ تھا۔

"اب تمہیں میرا مقصد جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا سویٹ ہارٹ۔ منزل بہت قریب ہے۔" پرکاش کے چہرے پر تیکھی مسکراہٹ تیر رہی تھی اور یہ مسکراہٹ شروتی کے لیے ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہی تھی۔

"مجھے نہیں چلنا تمہارے ساتھ۔ اس وقت جہاں

بھی ہوں۔ یہیں اتار دو۔ میرا بابا مر جائے گا اگر میں وقت پر گھر نہیں پہنچی تو۔" شروتی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا اور پرکاش کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آہ.......ہہ.......ہ۔ کتنا پیارا لمس ہے تمہارے ہاتھوں کا۔ کیا بات ہے تمہاری جوانی کی۔ میرے آفس میں نوکری کرو گی۔ دونوں کو رکھ لوں گا ساتھ میں۔ اور تو کوئی ہے نہیں تم باپ بیٹی کا۔ سوچ لو۔"

شروتی نے اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ بہت بڑے خطرے میں گھر چکی ہے۔ کم از کم اس کی جوانی اور عزت تو خطرے میں تھی ہی اس کو اس بات کا پورا یقین ہو چلا تھا۔

پرکاش نے گاڑی کو ہائی وے سے اتار کر چھوٹے کچے راستے پر ڈال لیا۔ شروتی کو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا سوائے سسکنے کے۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ چلانے کی کوشش بھی کرتی ہے تو بھی گاڑی کے تیز میوزک میں اس کی آواز گھٹ کر رہ جائے گی اور پھر اس کو پرکاش کے اور زیادہ غصے میں آنے کا بھی ڈر تھا۔ فی الحال اپنی ناسمجھی پر آنسو بہانے کے علاوہ اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اور وہ اس وقت یہی کر رہی تھی۔

اچانک گاڑی تیزی سے مڑی اور ہلکی سی چڑھائی چڑھ کر ایک پرانی سی عمارت میں گھس گئی۔

شروتی کا دل اونچے نیچے راستوں پر اچھلتے ہوئے بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ گاڑی عمارت میں کافی اندر جا کر بنے گیراج پر جا کر رکی۔ پرکاش فوراً گاڑی سے اتر گیا۔

"آ جاؤ میری جان۔ شرما کیوں رہی ہو؟" کہتے ہوئے پرکاش نے دروازہ کھول کر شروتی کو گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔

"آؤ۔" پرکاش شروتی کا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ بیچاری کسی معصوم جانور کی طرح اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی اس کے ساتھ ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔ بہت ہی تنگ اور بنا روشنی والے چھوٹے ٹکڑے کو پار کر کے پرکاش، شروتی کا ہاتھ پکڑے نیچے کی طرف جاتے ہوئے ایک زینے پر اترنے لگا۔ قریب قریب تیرہ چودہ گھماؤ دار پائیدانوں سے ہوتے ہوئے وہ دونوں ایک لابی میں آ گئے۔ جس کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ باہر سے کسی قدر پرانی نظر آنے والی عمارت کا یہ اندرونی حصہ کافی بہتر حالت میں معلوم ہو رہا تھا۔

"تم کو جو چاہئے میں دے دوں گی، جو پوچھو گے سب بتا دوں گی، پلیز مجھ کو ہاتھ مت لگانا۔" ساتھ چلتے ہوئے شروتی رہ رہ کر گڑگڑا رہی تھی۔ لیکن لگتا تھا اس وقت پرکاش کو باتیں کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لابی پار کر کے وہ دائیں طرف مڑا اور سب سے آخر میں جا کر ایک بڑے اور سجے سجائے کمرے میں آ کر رک گیا۔

"کسی بات کی فکر مت کرو۔ جب تک تم میرا کہا مانو گی، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن چالاک بننے یا نخرے دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو ان کا ہوا تھا۔" یہ کہتے ہوئے پرکاش نے کسی جگہ چابی گھمائی اور بیڈ روم کے اندر بنی دیوار کے ایک خاص حصے کو کھسکا کر آرام سے کھول دیا۔

"آہ.......ہ.......ہ۔" بدحواس سی آنکھیں پھیلاتے ہوئے شروتی صرف اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ بے ہوش ہو گئی۔ اس نے تو کمرے کے اندر پڑی پانچ چھ لڑکیوں کی برہنہ لاشوں کو ٹھیک طریقے سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ ان کے جسموں نے نکل کر کمرے میں پھیلی ہوئی تیز بو نے ہی اس کو اتنا لاچار کر دیا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی اور پرکاش کی بانہوں

میں جھول گئی۔ پرکاش نے اس کو بانہوں میں اٹھایا اور بیڈ پر لے جا کر پٹخ دیا اور پاس بیٹھ کر اس کے نازک گالوں ہونٹوں پر اپنی انگلی پھیرنے لگا۔ پرکاش حسن کی دولت والے ان چھوئے بدن میں سموئے بستر پر لیٹی شروتی کو دیکھ دیکھ کر بے حال ہو رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کر رہا تھا۔ مگر وہ صرف حسن کے اس جیتے جاگتے پتلے کو دیکھے ہی جا رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اسے چھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اچانک وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرہ بند ہونے کی آواز پر شروتی کسمسانے لگی اور دھیرے سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی شروتی نے گردن گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیکن کمرے میں پھیلا ہوا سناٹا ہی کسی کی موجودگی سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ شروتی کی آنکھوں کے سامنے لمحے بھر پہلے کا خوفناک منظر رہ رہ کر کوند رہا تھا۔ اس دیوار کی طرف دیکھنے کی ہمت تک نہیں کر پا رہی تھی وہ۔ پھر وہ اچانک اٹھی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن اس کی یہ تیزی رائیگاں گئی کیونکہ دروازہ باہر سے بند تھا۔

"ہائے بھگوان۔ اب میں کیا کروں؟" شروتی وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رونے لگی، اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

"ابھی آیا میم صاحب۔"

اچانک کمرے میں گونجتی مردانہ آواز نے لگ بھگ اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

"کک.......کون ہے؟" خوف کے مارے شروتی کا کلیجہ اور آنکھیں دونوں باہر نکلنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ مگر اس کے بعد کوئی آواز اسے سنائی نہیں دی۔

ان حالات میں تو بڑے سے بڑے تیس مار خان بھی تھرتھرانے پر مجبور ہو جاتے۔ شروتی تو پھر بھی ایک نازک سی لڑکی تھی۔ بدحواس سی کمرے میں ادھر ادھر دیکھتی وہ ایک دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی ہو کے ہانپنے لگی۔

اچانک دروازہ کھلا اور تقریباً پینتیس چالیس برس کا ایک بھدی شکل کا لمبا تگڑا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ شروتی دہشت کے مارے سمٹ کر کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

"کچھ چاہئے میم صاحب۔" اس آدمی کی آواز میں احترام پایا جاتا تھا۔ لیکن شروتی کے لیے اس وقت کوئی بھی آواز موت کی آواز سے کم نہیں تھی۔

"کون ہو تم؟ مجھے یہاں سے جانے دو پلیز۔" شروتی کونے میں چپکی کھڑی ہوئی ہی دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"میں بھگوان ہوں میم صاحب۔ بھگوان داس۔ صاحب کا غلام ہوں اور ان کے مہمانوں کا بھی۔ ابھی صاحب یہاں نہیں ہیں۔ کچھ چاہئے تو پھر سے مجھے آواز دے دینا۔ ابھی کچھ چاہئے کیا آپ کو؟"

"مجھے جانے دو پلیز۔ مجھے جانا ہے یہاں سے۔" شروتی گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

"مگر یہاں سے تو واپس جاتا ہی نہیں ہے کوئی۔ جب صاحب کا کام ہو جائے گا تو وہ آپ کو مجھے گفٹ کر دیں گے۔ ہی ہی ہی۔ تب تک آپ میری مالکن ہیں۔ اور میرے سامنے دوبارہ جانے کا ذکر مت کرنا میم صاحب۔ اگر آپ یہاں سے جانے کی کوشش کرو گی تو صاحب نے بتا رکھا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ہی.......ہی.......ہی۔" بھگوان داس یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا اور دروازے کی کنڈی لگا دی۔ شروتی کونے میں کھڑی سوکھے پتے کی طرح

کانپ رہی تھی۔ خوف کے مارے اس کا گورا چہرہ پیلا پڑنے لگا تھا۔ رہ رہ کر اس کو گھر میں اس کا انتظار کرتے اپنے پاپا کی یاد آ جاتی اور وہ سسکنے لگتی۔ اب وہ تو اس کے لیے فکر مند بھی ہونے لگے ہوں گے۔

"میم صاحب۔ کھانا۔" دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے بھگوان داس نے ایک ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

ایک پل کے لیے شروتی کے دل میں آیا کہ بھاگنے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کے قدموں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کو بھگوان داس کی بات یاد آ گئی۔ "اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو صاحب نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

سہمی ہوئی شروتی نے کھانے کی طرف دیکھا تک نہیں۔ بھگوان داس کے واپس جاتے ہی وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بستر پر جا کر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

"تو کیا بات ہوئی اس لڑکی سے؟" روہن پرکاش کے پاس اکیلے میں بیٹھا تھا۔

"کچھ خاص حاصل نہیں ہو پایا۔ اس کو گھر جانے کی جلدی تھی اور وہ گڑگڑانے لگی۔ مجھے اس پر رحم آ گیا اور میں نے اس کو جانے دیا۔ پھر ملنے کا وعدہ لے کر۔" پرکاش نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

"مجھے اب اور انتظار نہیں ہوتا میرے بھائی۔ میں کل صبح ہی عمر کوٹ جا رہا ہوں۔ چل نا میرے ساتھ۔ میں نے ممی پاپا سے بھی پوچھ لیا ہے۔" روہن نے پرکاش سے ساتھ چلنے کی فرمائش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بتایا تم نے انہیں؟ تمہیں خوابوں میں ان کی بہو مل گئی ہے۔" یہ کہہ کر پرکاش زور سے ہنسنے لگا۔

"میں پاگل ہوں کیا۔" روہن نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"تو......؟"

"بس بول دیا ایسے ہی کچھ۔ تم بتاؤ ساتھ چل رہے ہو یا نہیں۔" روہن نے پھر سے پوچھا۔

"کیوں؟ وہاں بھی بھوت ملنے کے چانس ہیں کیا۔" پرکاش پھر سے ہنسا۔

"میرا مذاق مت اڑاؤ یار۔ تمہیں پتا ہے کہ مجھ سے اتنی لمبی ڈرائیو نہیں ہوگی اور ڈرائیور کو میں ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔ چلو نا بھائی۔" روہن نے اصل وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ میرے پاس ایک دن سے زیادہ کا ٹائم نہیں ہے۔ تمہیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" پرکاش نے صاف منع کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو میں نے رویندر کو ساتھ چلنے کے لیے منا رکھا ہے۔ مگر جانا پڑے گا بس سے یا ٹرین میں۔"

"تو کون سا پہاڑ ٹوٹنے پڑے گا۔ چلا جا۔ ڈرائیونگ کا جھنجھٹ ہی ختم۔ اچھا ابھی میں چلتا ہوں۔ صبح جلدی اٹھ کر ایک کام نمٹانا ہے۔" پرکاش یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

روہن اس کو دروازے تک چھوڑ کر آیا اور واپس اپنے کمرے میں آ کر اپنے بستر میں دبک گیا۔

(باقی آئندہ)

فتنہ

راحیلہ تاج

ماہرین نفسیات آدمی میں پائی جانے والی ذہانت کو جب اعداد میں لکھتے ہیں تو اس کی معیاری سطح IQ کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ ایک گیارہ سال کے بچے کا ذہنی معیار IQ 185 میں ظاہر کیا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ یہ بچہ اپنی عمر کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین ہے۔ اگر IQ کے اعداد اس سے بھی اوپر ہو جائیں تو......!

ایک ایسے بچے کا المیہ جو [illegible] خاندان میں پیدا ہوا تھا

بلاشبہ کیلا فروش کے قتل کا معمہ پرکنس خاندان کے ان جڑواں بھائی بہن نے ہی حل کیا تھا جو ابھی پورے بارہ برس کے بھی نہ تھے۔ حقیقتاً ان کی عمریں گیارہ سال اور چند ماہ تھیں اور اس سوال کے جواب میں پیٹی پرکنس کا جواب عموماً یوں ہوتا تھا۔ "میری عمر گیارہ سال تین مہینے ہے اور میرا بھائی مجھ سے صرف دس منٹ چھوٹا ہے۔"

یہ پرکنس جڑواں بچے تقریباً ایک سو پچاسی آئی۔ کیو کے حامل تھے اور جان پہچان والوں میں انہیں سخت ناپسند کیا جاتا تھا۔ البتہ ماں باپ کا معاملہ اور تھا۔ یا پھر انہیں پسند کرنے والوں میں وہ کیلا فروش بھی شامل تھا جسے بھی مذاقاً "یونانی" کہہ کر پکارتے تھے لیکن پرکنس بچے البتہ اسے اس کے نام ڈی پولس ہی سے مخاطب کرتے تھے۔ اسی لیے وہ ٹھیلے والا انہیں پسند کرتا تھا۔ پھر ان بچوں نے اس پر ایک احسان بھی کیا تھا جس کی وجہ سے اس کی آمدنی خاطر خواہ بڑھ گئی تھی۔

اپنی اچانک موت سے قبل یہ کیلا فروش قرب و جوار کی اس آبادی میں جہاں درمیانی آمدنی والوں کے لیے ایک بڑے ہاؤسنگ پراجیکٹ پر کام ہو رہا تھا اپنے چرچراتے "مرمراتے" ٹھیلے پر کیلے بیچا کرتا تھا۔ یہاں کریم کلر کے مکانات بنے ہوئے تھے اور جب یہ کیلا فروش اپنے ٹھیلے کے ساتھ وہاں نمودار ہوا تھا تو بچوں میں بڑی گہما گہمی پیدا ہو گئی تھی۔ یہی تجسس پرکنس بچوں کو بھی اس کی طرف لے گیا تھا۔ کیلے والے نے انہیں دیکھ کر اپنی بگڑی انگریزی میں ان سے پوچھا تھا آیا انہیں کیلے درکار ہیں۔ اس کے لب و لہجے پر ڈینڈی پرکنس نے معنی خیز انداز میں اپنی بہن کو دیکھ کر کہا تھا۔ "ثقافتی سقم۔"

"درست کہا تم نے۔"

"میں ہمیشہ درست ہی کہتا ہوں۔" ڈینڈی نے جواب تھا۔ "ذرا کچھ اور باتیں کرو۔" پیٹی پرکنس نے ٹھیلے والے سے یوں کہا تھا جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ ٹھیلے والا ان کی باتوں پر خاصا کھسیانا ہوا تھا لیکن جلد ہی ان لوگوں نے اس کا ازالا ایک اور طرح کر دیا تھا۔

"تم کیلے کس حساب سے بیچتے ہو۔" پیٹی نے پوچھا تھا۔

جواب میں ٹھیلے والے نے اس تختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا جس پر اس نے بے ہنگم انداز میں کیلے کے نرخ لکھ رکھے تھے۔

"ایک درجن تیرہ سینٹ۔ دو درجن پچیس سینٹ۔"

"تمہیں اس میں کیا ملتا ہے؟" ڈینڈی نے سوال کیا۔

اس دوران ٹھیلے والا سمجھ گیا تھا کہ یہ دونوں بچے

دوسرے بچوں سے خاصے مختلف ہیں۔ اس نے جیب سے پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ جلائی اور دھواں اگلتے ہوئے انہیں دیکھا۔ ''سگریٹ لوگے؟'' اس نے ڈینڈی سے پوچھا تھا۔

''نہیں شکریہ۔'' ڈینڈی نے کہا۔ ''اس میں زہر ہوتا ہے۔ نکوٹین۔'' پھر کچھ اور باتیں ہوئی تھیں۔ کیلے والے ڈی پو پولیس نے انہیں بتایا تھا کہ واقعی اسے زیادہ نفع نہیں ملتا ہے۔

ڈینڈی پرکنس نے ایک کیلا چھیلتے ہوئے نرخ نامے کی طرف دیکھا تھا پھر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ناچ اٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں پر ایک موٹے سے چشمے والی عینک تھی۔ اس کی بہن بھی عینک پہنتی تھی۔ دراصل وہ بچپن ہی سے کئی بیماریوں کا شکار تھے اور اس کے دل کی حرکت بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ اسی بنا پر وہ اسکول کم ہی جاتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا تھا۔

یہ دونوں بچے جڑواں ہونے کے باوجود ہم شکل نہ تھے لیکن یہ دونوں ذہنی اعتبار سے بالکل ایک جیسے تھے اور عموماً سارے کاموں کو ایک ساتھ مل کر کرنے کے عادی تھے۔

''تم مسکرائے کیوں؟'' پیٹی نے ڈینڈی سے پوچھا تھا۔

''سامنے کی بات ہے۔'' ڈینڈی نے کہا تھا۔ ''بتانا تو! اس کے گاہکوں کا ذو ضعف اکل مشترک کیا ہوسکتا ہے؟''

''حماقت؟''

''نا۔'' ڈینڈی نے ہاتھ بڑھا کر نرخ والی تختی اٹھالی تھی۔ اور بولا تھا۔

''ایک درجن کے لیے تیرہ سینٹ اور دو درجن کے لیے پچیس سینٹ۔ ڈی پو پولس ذرا بتانا۔ دو درجن کے خریدار تمہیں کتنے مل جاتے ہیں؟''

''ایک ساتھ دو درجن کیلئے لوگ کم ہی خریدتے ہیں۔'' ٹھیلے والے نے کہا تھا۔ ''آج کل لوگوں کے پاس رقم زیادہ نہیں بچتی ہے۔''

''بے کار بات ہے۔'' ڈینڈی نے کہا تھا۔ ''کم بے تمہیں کار خریدنے کی کوئی امنگ نہیں۔''

پیٹی نے سوچتے ہوئے کہا تھا۔ ''میرا خیال ہے یہ ٹھیک کہتا ہے لوگ خرچ کرنے میں احتیاط کررہے ہیں۔''

''چلو چھوڑو۔'' ڈینڈی نے کہا تھا۔ ''گاہکوں کو پرچانے کا یہ طریقہ اب بہت پرانا ہوچکا ہے۔ لاؤ ذرا پینسل دو۔'' پھر جب یونانی نے اسے پینسل دے دی تو اس نے تختی کے دوسری طرف تیز رفتاری سے نئے نرخ لکھ دیئے تھے اور وہ یوں تھے۔

ایک درجن کیلئے تیرہ سینٹ۔

دو درجن کے لیے ستائیس سینٹ۔

لکھ کر اس نے اپنی بہن کی سمت دیکھا تھا اور اس کی بہن نے پسندیدگی کے ساتھ گردن ہلا دی تھی۔ ''تم واقعی جینئس ہو۔''

''نا یہ تو سامنے کی بات ہے۔'' ڈینڈی نے کہا تھا۔ دوسری طرف یونانی حیرت سے اس نئے نرخ نامے کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ بھلا کون احمق ان نرخوں پر دو درجن کیلئے خریدے گا؟''

''واقعی کم عقلوں کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' پیٹی نے کیلے فروش کے تبصرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا پھر اس نے وضاحت کی تھی۔ ''دیکھو ٹھیک ہے کہ ان بڑھے نرخوں پر دو درجن کیلے کوئی لینے نہیں آئے گا لیکن ایک درجن کیلئے خریدنے میں تو کوئی رکاوٹ مانع نہیں۔ اس کے عوض تمہیں تیرہ سینٹ ملیں گے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر ایک درجن کیلے خریدے گا اور پھر تمہیں وہ تیرہ سینٹ دے گا اب

دو درجن کے عوض تمہیں ملیں گے چھبیس سینٹ اس طرح خریدار سمجھے گا کہ اسے پورے ایک سینٹ کی بچت ہوئی ہے جبکہ اس طرح تم کو بھی پورے ایک سینٹ کا نفع مل جائے گا۔ کچھ سمجھے؟''

''سامنے کی بات ہے۔'' ڈینڈی نے کہا تھا۔

یونانی کیلے والے نے بھنویں سکیڑ کر چند لمحے سوچا تھا پھر جیسے آہستہ آہستہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ دوسرے لمحے اس نے تیزی سے پنسل لے کر پرانا نرخ نامہ کاٹ دیا تھا۔ اور اس نے نئے نرخ نامے کو ٹھیلے پر آویزاں کیا اور مسکرایا۔

''واقعی تم حیرت انگیز ہو۔'' اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ان بچوں کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔

''ہاں' فکر نہ کرو اب تم جلد کار کے مالک بن جاؤگے۔'' ڈینڈی نے کہا تھا اور ٹھیلے والے کی مسکراہٹ اور چوڑی ہوگئی تھی۔

اس کے پاس پہلے ہی سے کار موجود تھی۔

☆☆☆

یہ دو ماہ بعد کی بات ہے۔

ٹھیلے والے کی لاش ٹھیلے کے پاس ہی پڑی ملی تھی۔ یہ اگست کا مہینہ تھا اور دن گرم تھا۔ دونوں بچوں کو پولیس سائرن کی آواز نے چونکا دیا تھا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ پھر دونوں پرکنس مجمعے میں جا شامل ہوئے تھے۔ یہ جگہ ان کے گھر سے چند بلاک کے فاصلے پر تھی۔ سڑک کے ایک جانب ایک پولیس والا ان مزدوروں کے ساتھ کھڑا تھا جو تعمیراتی کام سے متعلق تھے۔ یہاں ایک اپارٹمنٹ ہاؤس موجود تھا جو ابھی تعمیراتی مراحل میں تھا۔ اس پولیس والے کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک دبی ہوئی تھی۔ جس میں وہ نوٹس لکھتا جارہا تھا۔ دوسری طرف یونانی کی لاش کے لیے ایمبولینس آچکی تھی۔ ایک اور پولیس مین اپنے ایک ہاتھ میں ایک اینٹ کو پکڑے...

کے ساتھ پکڑے کھڑا تھا جو وہیں گلی کے گٹر کے پاس سے ملی تھی۔ اس نے اسے احتیاط سے تھام رکھا تھا۔ تاکہ اس پر لگنے والے انگلیوں کے نشانات ضائع نہ ہوں۔ اسی اینٹ سے یونانی کو ہلاک کیا گیا تھا۔ یہ بات صاف تھی کیونکہ اس کے ایک سرے پر کچھ خون اور چند ٹوٹے ہوئے بال چسپاں تھے۔

یہ دونوں جڑواں بھائی بہن بھی مجمعے میں موجود تھے۔

''غریب ڈی پولس۔'' پیٹی نے سرسری لہجے میں کہا تو ایک پولیس والے نے اسے چونک کر دیکھا۔

''تم اس آدمی کو جانتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' پیٹی نے کہا۔ ''یہ ہمارے اچھے دوستوں میں تھا۔''

نوٹ بک والا پولیس مین آگے آگیا۔ ''ذرا اس کا نام لکھواؤ۔''

''اسٹوڈی پو پولس۔'' پیٹی نے آہستہ سے کہا۔ پھر مزید آہستگی سے اس نے نام کے ہجے بتانے شروع کیے کیونکہ کانسٹیبل غلط لکھ رہا تھا۔

''تمہیں پتا نہیں تھا؟'' ڈینڈی نے پوچھا۔

''گویا تمہیں اس کی شناخت کی ضرورت ہے؟'' ڈینڈی نے کہا پھر ایمبولینس کی طرف بڑھ گیا جہاں لاش اٹھائی جارہی تھی۔ ''ٹھیک ہے اسے جانے دو'' پولیس مین نے ڈینڈی کو ایمبولینس میں گھستے دیکھ کر کہا۔ ''یہ مقتول کو جانتا ہے۔''

اندر پہنچ کر اس نے چادر کھینچ کر اپنے پرانے شناسا کے چہرے کو غور سے دیکھا پھر وہ دوبارہ ایمبولینس سے نیچے آگیا۔

''ہاں یہ وہی ہے۔'' اس نے پولیس والے کو بتایا پھر تھوڑی دیر بعد پولیس کی ایک گاڑی اور آئی اور

...انہوں نے وہاں موجود چھ سات مزدوروں کو الگ۔

میں بٹھالیا۔ اس میں چار اطالوی تھے، ایک نیگرو تھا اور ایک انگریز۔

دونوں بچے اس کے بعد اپنے گھر کی طرف چل دیے۔ پیٹی گہری سوچ میں تھی۔ اسے علم تھا کہ پولیس ان بے چارے مزدوروں کے ذریعے اس موت کے معمے کو حل نہیں کرسکتی۔ اسے اس بات کا بھی مکمل یقین تھا کہ وہ ان مزدوروں کو نہ صرف بچا سکتی ہے بلکہ وہ اس قتل کے معمے کو حل بھی با آسانی کرسکنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ کام منطقی سوچ کے ذریعے ہوسکتا تھا۔ دوسری طرف ڈینڈی لاش کی گردن پر جمی ہوئی سرخی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سرخی خون کی نہیں کیونکہ وہ لاش پر جھکا تھا تو اس کی سانسوں سے یہ سرخی متحرک ہوگئی تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ دراصل کسی اینٹ کسی سرخ اینٹ کے ذرات ہیں۔

"تم ٹھیک سے کھاؤ۔" کھانے کی میز پر ڈینڈی کی ماں نے اس سے کہا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ بچہ کسی سوچ میں گم ہے۔

"میرا خیال ہے وہ ان مزدوروں سے تفتیش کا آغاز کریں گے۔" پیٹی نے بھائی سے کہا۔

"اور فضول۔"

"ارے تم لوگ کس چکر میں ہو۔" بچوں کی ماں نے پھر انہیں ٹہوکا دیا۔ ڈینڈی نے سنی ان سنی کردی اور بہن سے بولا۔ "زیادہ تر مزدور باہر کے ہیں شاید چند ایک پہلے کا مجرمانہ ریکارڈ بھی رکھتے ہوں۔ خواہ مخواہ پھنسیں گے بے چارے۔"

"مگر بعد میں سب چھوٹ جائیں گے۔ اور معاملہ ختم ہوجائے گا۔"

"کھانا کھاؤ۔" ماں نے پھر انہیں تنبیہ کی۔

"اس کیس میں مقصد قتل کا کوئی پتا نہیں۔ ویسے ممکن ہے مزدوروں میں سے کسی سے اس کی چخ چخ ہوئی ہو۔"

"ناممکن، یوں ہوتا تو دوسرے مزدور ضرور بتاتے۔"

"ہاں۔ بس انہوں نے اینٹ گرنے کی آوازیں سنی تھیں اور پولیس کو گرتے دیکھا تھا۔"

"معلوم نہیں کسی کو انہوں نے بھاگتے بھی دیکھا یا نہیں؟" پیٹی نے کہا۔ "ٹھیلا کارنر کے قریب ہی تھا۔ قاتل وار کرکے بھاگ سکتا تھا۔"

"اس کی تصدیق ہوئی ہے۔ کسی کو کسی نے بھاگتے نہیں دیکھا تھا۔" ڈینڈی نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ہم پھر وہیں کھڑے ہوئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ ویسے تم نے اینٹ کو دیکھا تھا نا؟"

"نہیں۔" پیٹی نے جواب دیا۔

"کون سی اینٹ؟" پہلی بار مسٹر پرکنس نے دریافت کیا۔

"وہی جس سے یونانی مرا تھا۔" ڈینڈی نے کہا۔ "میرا خیال ہے پولیس والے اس پر انگلیوں کے نشانات تلاش کریں گے۔"

"مشکل ہے۔ اس قدر کھردری سطح والی شے پر نشانات ملنے مشکل ہیں۔" پیٹی نے کہا۔

"اچھا ہوتا کہ میں اینٹ کو دیکھ لیتا۔"

"کیوں؟ اس سے کیا ہوتا؟" پیٹی نے پوچھا۔

ڈینڈی نے لمبی سانس لی۔ "ویسے اس کے بغیر بھی میں بات سمجھ رہا ہوں۔ تاہم اچھا ہوتا کہ وہ میری نظر سے گزر جاتی۔"

"تم نے کیا سمجھا ہے؟" پیٹی نے استعجاب سے پوچھا۔

"سامنے کی بات ہے۔" ڈینڈی نے کہا۔

"ارے تم لوگ کیا بک رہے ہو؟" ماں نے درمیان میں پھر مداخلت کی۔ "کھانا کھاؤ۔"

"تم مجھے تو بتاؤ۔" پیٹی نے بھنا تے ہوئے کہا۔

"بعد میں۔" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر وہ کھانے میں مشغول ہوگیا۔

☆☆☆

دوسری صبح کو وہ دونوں جڑواں بھائی بہن ایک بار پھر ادھر جارہے تھے جہاں واردات ہوئی تھی۔ مگر وہ جا رکے وہاں چند بالغ افراد کھڑے تھے۔ وہ لوگ اسی واردات کی باتیں کررہے تھے۔

"یہی وہ جگہ ہے۔" ایک نے دوسرے کو اشارہ کرکے وہ جگہ دکھائی جو قدرے نم سی نظر آرہی تھی جہاں لاش گری تھی۔

"غالباً یہ نشان خون کا ہے؟" کسی نے پوچھا۔

ڈینڈی نے آگے بڑھ کر زمین کو دیکھا جہاں ایک گولائی میں نمی سی تھی۔ اس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "کسی کتے نے پیشاب کیا ہے یہاں۔"

پیٹی اس عرصے میں گلی کے سامنے والی عمارت کو دیکھ رہی تھی۔ یہاں کام ہورہا تھا اور اپارٹمنٹ بن رہے تھے۔ کچھ مزدور کریم کلر کی اینٹیں ایک ٹرالی میں بھر کر اوپر لے جارہے تھے۔

"غالباً یہ مزدور نئے ہیں۔" پیٹی نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ چھ سات ابھی حوالات میں ہوں گے۔"

"بالکل۔" پیٹی نے ٹھہر کر اسے دیکھا۔ "اور وہ بات کیا ہے؟ وہی جو تم نے کھانے کے دوران نہیں بتائی تھی۔"

"وہ؟" ڈینڈی نے مسکرا کر کہا۔ "وہ... اچھا تم میرے ساتھ آؤ۔" پھر وہ پیٹی کو لے کر عمارت کے اس دروازے کی سمت بڑھا جو اس مقام سے قریب تر تھا جہاں یونانی مرا تھا۔

انہوں نے سیلف سروس لفٹ پکڑی اور اس کا بٹن دبا کر وہ چھٹی منزل کو چل دیے۔ دوسری منزل کے قریب ڈینڈی نے کہا۔ "تمہیں پتا ہے کہ یونانی ایک سرخ اینٹ کی چوٹ سے مرا تھا۔"

"اوہ۔" چونکتے ہوئے پیٹی نے اسے دیکھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا...؟"

"سامنے کی بات ہے۔" ڈینڈی نے کہا۔ "رش کے سر پر سرخ ذرات موجود تھے۔ پھر میں نے اینٹ بھی دیکھی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ اینٹ اوپر سے گرائی گئی تھی؟"

"ہاں۔"

اسی لمحے لفٹ رک گئی اور اس کا دروازہ کھل گیا۔ باہر نکل کر انہوں نے چند سیڑھیاں طے کیں اور چھت کے دروازے تک جا پہنچے جو زنگ سے چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے دھکیل کر کھولا اور اوپر کھلی چھت پر جا پہنچے۔

"وہ دیکھو۔" ڈینڈی نے کہا۔ پیٹی نے سامنے کی چھوٹی سی سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی چمنی کو دیکھا وہ پھر چھت کی نکڑ کے پاس گئے اور وہاں سے انہوں نے منسلکہ چھت کو دیکھا۔ وہاں بھی ویسی ہی سرخ چمنی بنی ہوئی تھی۔

"سب ایک جیسی ہیں۔" پیٹی نے کہا۔

انہوں نے چمنی کا بغور معائنہ کیا۔ ڈینڈی نے اینٹوں کی اوپری قطار کو ہاتھ سے چھوا۔ یہ قطار ڈھیلی سی تھی۔ اس نے ہنکاری بھری اور زور لگایا۔ ایک اینٹ قطار سے جدا ہوکر اس کے ہاتھ میں آگئی اس نے اینٹ کو دیکھا اور نیچے گرادیا۔ اینٹ نیچے گری اور اس میں سے سرخ برادہ سا جھڑ کر سطح پر پھیل گیا۔

پیٹی گھوم کر چمنی کے دوسرے حصے کی جانب گئی اور پکاری۔ "ارے دیکھنا یہاں سے ایک اینٹ غائب ہے۔"

"خوب۔" ڈینڈی نے یوں کہا جیسے وہ اس

اطلاع سے باخبر رہا ہو۔" اب تمہیں آلہ قتل کو دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی جگہ تمہارے سامنے ہے۔"

اسی لمحے انہوں نے سیڑھیوں پر کسی کے ہلکے لیکن تیز قدموں کی چاپ سنی اور وہ دونوں چوکنے ہوگئے پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ اٹھی۔

"قاتل جائے واردات پر پلٹ رہا ہے۔" پیٹی نے آہستہ سے کہا پھر دروازہ کھلا اور انہوں نے اپنے سامنے ایک لڑکے کو کھڑے دیکھا۔ اس کی عمر سات سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ وہ انہیں تیز دھوپ میں چندھیائی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ وہ تقریباً دروازے سے ادھر آچکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سرخ اینٹ دبی ہوئی تھی۔

"وہیں ٹھہرو۔" ڈینڈی نے اسے گھر کا۔

لڑکے نے تیزی سے متحرک ہونا چاہا لیکن دونوں جڑواں بچوں نے اسے چھاپ لیا۔ اس کا ایک ہاتھ موڑتے ہوئے پیٹی نے کہا۔ "یونہی کھڑے رہو۔"

"یہی ہے وہ" ڈینڈی نے کہا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" بچے نے کہا۔ وہ خاصا پریشان معلوم ہو رہا تھا مگر ان دونوں کے سامنے کمزور تھا۔

"تم نے ہی کیا ہے۔" پیٹی نے لڑکے کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"تم کیا جانو......؟" لڑکے نے کہا۔

"ہم سب جانتے ہیں۔" ڈینڈی نے اکڑ کر کہا۔ "ہم نے سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ ہمارے پاس دماغ ہے۔" ڈینڈی کے لہجے میں فخر تھا۔ "تم پریشان مت ہو۔" پیٹی نے ننھے بچے کو دلاسا دیا۔ "تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم ابھی بہت چھوٹے ہو نا۔ بس تم نے ایک اینٹ پر زور لگایا تھا اور وہ نیچے لڑھک گئی تھی۔ یہی بات ہے نا.....؟" بچے نے جلدی سے سر کو اوپر نیچے کیا۔

"خوب بس تم فکر نہ کرو۔" ڈینڈی نے کہا۔ "البتہ یہ بتاؤ اس اینٹ کو تم یہاں کیوں لائے ہو؟"

بچے نے دونوں کو گھور کر دیکھا پھر فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "میں گری ہوئی اینٹ کے رخنے کو بند کرنا چاہتا تھا۔"

ڈینڈی کی آنکھیں چوڑی ہوگئیں۔

"خوب۔" اس نے داد دی۔ "کافی ہوشیار لگتے ہو۔ تم نے اسے کسی اور چمنی سے نکالا ہوگا۔"

لڑکے نے سر ہلا کر ہامی بھری۔

"اور کسی دور کے مکان سے 'کیوں؟'" اس بار پیٹی نے پوچھا۔ لڑکے نے پھر سر ہلایا۔

"خوب صورت۔" پیٹی نے داد دی۔ "تم کافی دور تک سوچتے ہو۔ میرے ننھے سے دماغ۔ تاکہ پولیس اگر ادھر دیکھے تو انہیں کچھ نہ دکھائی دے۔ خوب بہت خوب۔"

"ٹھیک ہے۔" اچانک ڈینڈی نے کہا۔ "ویسے بچو، تمہیں اس کا معاوضہ بہر حال ادا کرنا ہوگا۔"

"معاوضہ؟" بچے نے چکرا کر اسے دیکھا۔

"تم کو گھر سے جیب خرچ تو ملتا ہی ہوگا؟" ڈینڈی نے پوچھا۔ بچے نے سر ہلا کر ہامی بھری۔

"کتنا؟"

"ہفتے میں پچاس سینٹ۔"

"یعنی سال میں پورے چھبیس ڈالر۔" پیٹی نے حساب لگایا۔

"نہیں یہ ٹھیک نہ ہوگا۔" ڈینڈی نے جلدی سے کہا۔ "ساری رقم لینی ٹھیک نہیں۔ بس آدھی رقم ٹھیک ہے۔"

"کم از کم پینتیس سینٹ تو لو۔" پیٹی نے حریصانہ انداز میں کہا۔

"کیوں بھائی، کیا کہتے ہو؟ یہ رقم ٹھیک ہے؟" ڈینڈی نے لڑکے سے پوچھا۔

"تم لوگ مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟" لڑکے نے جے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس بار اس کے چہرے پر ایک نئی چمک ابھر آئی تھی اور آنکھیں لمحہ بھر کے لیے کسی شرارے کی طرح دہکی تھیں۔

"ہاں۔ بلیک میل تو ہے۔" پیٹی نے تمسخر سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" لڑکے نے چھت کی منڈیر پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

"گڈ۔" ڈینڈی نے لڑکے کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "تو بات طے ہوگئی۔ اب ہم چلیں گے۔ اگلے ہفتے اسی دن اسی وقت ہماری ملاقات یہیں ہوگی۔ سمجھ گئے؟"

لڑکے نے بے دلی سے سر ہلا دیا۔ وہ اس معاملے میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

پھر دونوں بھائی بہن مسکراتے ہوئے سیڑھیوں سے اترے اور لڑکے کو وہیں چھوڑ کر لفٹ کے اوپر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

اوپر عمارت کی چھت پر تنہا لڑکا چند لمحوں تک کھڑا اپنے ہاتھ میں دبی اینٹ کو دیکھتا رہا پھر اس نے اس اینٹ کی سمت جھک کر اس اینٹ کو بھی اٹھا لیا اور چھت کی نکڑ کی سمت بڑھا۔ چھت کی منڈیر صرف دو فٹ اونچی تھی اس نے اس دیوار سے جھک کر نیچے کی سمت جھانکا۔ اس کا ذہن کسی کمپیوٹر مشین کی مانند بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"کیلے بیچنے والے نے یونانی کہنے پر مجھے پکڑ کر میرے کان کھینچے تھے۔ اور اب یہ گدھے۔" وہ بڑبڑایا۔ "گدھا اور گدھی۔"

اس نے ایک بار پھر نیچے گرنے کی رفتار اور زاویے کا حساب لگایا حالانکہ یہ اندازہ اسے اچھی طرح تھا۔ یکایک اس کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوگئیں۔ یہ اس کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ وہ پہلی بار ایک ساتھ دو اینٹیں نیچے گرانے جا رہا تھا۔

ٹھیک ہے اگر میں ناکام بھی رہا تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس نے سوچا۔ وہ ان دونوں سے کسی اور جگہ بھی نپٹ سکتا تھا۔ کسی بلند جگہ پر، کسی چبوترے پر، ریلوے پلیٹ فارم پر صرف ایک ہلکے سے دھکے کی بات تھی اور بس اور وہ تو صرف ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ معصوم بچہ۔ وہ مطمئن تھا۔ اس نے سوچا اگر اینٹوں نے کام نہ بھی دکھایا تو وہ یہ کام اور طرح بھی کر سکتا ہے۔

وہ وہیں رک کر ان جڑواں بچوں کا انتظار کرتا رہا کہ وہ نیچے گلی میں پہنچ کر عمارت کے صدر دروازے سے باہر آجائیں۔ ذہانت کو ہزار طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ "اس کے استعمال کے لاتعداد خوب صورت طریقے ہیں۔" اس کی ننھی سی کھوپڑی کے اندر رکھی ہوئی ایک سوچ چانو ے آئی۔ کیونکی مشین تیزی سے متحرک تھی۔ جوں ہی اس نے چھ منزل نیچے ان دونوں جڑواں بچوں کو دروازے سے نکل کر لمحہ بھر کے لیے رکتے دیکھا اس نے اپنی سانسیں روک لیں۔ اس نے عجلت سے گلی کے دونوں سروں پر نگاہ دوڑائی پھر اس کی انگلیوں کی نوک نے ایک نازک سی حرکت کے ساتھ منڈیر پر رکھی دونوں اینٹوں کو نیچے کی جانب گرا دیا۔

ڈراپ سین

اسرار احمد

ہوس زر کی بنیاد بننے والا لالچ کا زہر انسان کی رگ رگ میں سرایت کر کے ذہن کی مثبت سوچوں کو مفلوج اور نظروں کی حقیقت کو فریب کا روپ دے دیتا ہے۔ دوسروں سے چھیننا اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہے۔

ایک شاطر [illegible] کا فسانہ، ایک عمدہ کہانی

میری پرانے ماڈل کی کار کا ٹائر پنکچر ہو چکا تھا اور میں بڑی بے چارگی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سنہرے بالوں والی ایک اسمارٹ اور خوش جمال لڑکی اپنی خوب صورت چمچماتی کار میں پارکنگ شیڈ میں داخل ہوئی۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھ پر ترحم آمیز نظر ڈالی اور لہراتی بل کھاتی آٹھ منزلہ عمارت کی طرف بڑھ گئی۔

"سنیے مس" میں نے اسے آواز دی۔

"جی فرمایئے۔" خوب صورت لڑکی نے پلٹ کر پوچھا۔

"زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔" میں نے قدرے ہچکچا کر کہا۔ "کیا آپ میری مدد کرنا پسند فرمائیں گی؟ میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو چکا ہے اور جیک ٹوٹ گیا ہے۔ اگر آپ اپنا جیک مستعار دے سکیں تو میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔"

وہ چند لمحے میری موٹے شیشوں والی عینک اور کنپٹیوں کے سفیدی مائل بالوں کو بغور دیکھتی رہی پھر اس نے ایک گہرا سانس لے کر چابیوں کا گچھا میری طرف بڑھایا۔ "جیک ڈکی میں رکھا ہے۔ آپ خود ہی لے لیجیے۔"

میں نے ڈکی کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک فالتو پہیہ، گریس اور دھول میں اٹا ہوا ایک نقشہ اور چند اوزار پڑے ہوئے تھے مگر جیک نہیں تھا۔ جب میں ڈکی بند کر رہا تھا تو لڑکی شیریں لہجے میں بولی۔ "معاف کیجیے آپ کو زحمت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ ڈکی میں جیک موجود ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اس میں آپ کا قصور نہیں۔ اگر مجھے جیک مل جاتا تو آسانی ہو جاتی۔ اب مجھے تھوڑی سی پریشانی اٹھانی پڑے گی کیونکہ رات کافی بیت چکی ہے۔" ایک لمحہ توقف کر کے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے پروفیسر ڈیکن کہتے ہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔ یہاں میں ایک بیمار دوست کی عیادت کے لیے آیا تھا کیا آپ کا فلیٹ اسی بلڈنگ میں ہے مس... ؟"

"کورا ولسن۔" خوب صورت لڑکی نے میرا جملہ مکمل کر کے کہا۔ "جی ہاں میں اسی بلڈنگ میں رہتی ہوں۔"

"میں نے حماقت کی کہ اپنے دوست کی پرخلوص پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ اس نے مجھے آج رات اپنے ہاں قیام کرنے کے لیے کہا تھا مگر میں معذرت کر کے چلا آیا۔ اب دوبارہ جا کر اسے جگانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں؟ دراصل میں رات بھر کھلے رہنے والے کسی ورکشاپ سے کسی مستری کو بلوانا چاہتا ہوں۔ اس طرح میں آسانی سے گھر جا سکوں گا۔"

کورا چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد دلکش انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "آپ مجھے معقول آدمی لگتے ہیں

پروفیسر۔ آیئے میں آپ کو فون کروائے دیتی ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" میں نے اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں یہ بریف کیس ساتھ ہی لے جانا پسند کروں گا۔ اس میں میرے ایک اہم ذاتی منصوبے کے کاغذات ہیں جن پر میں ان دنوں کام کر رہا ہوں۔"

لڑکی کا چھوٹا سا فلیٹ جدید ترین خوب صورت فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری مجھے تھما دی اور میں اس کے اوراق پلٹنے لگا۔

"میرا خیال ہے یہ ورکشاپ مناسب رہے گا۔" میں نے ایک پیلے صفحے پر انگلی رکھ کر کہا۔ "میٹ لاک گیراج چوبیس گھنٹے سروس۔"

میں نے میٹ لاک گیراج سے رابطہ قائم کیا۔ اپنا تعارف کرایا۔ اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں کار کھڑی تھی اور اس جگہ کا پتا لکھوا دیا جہاں اس وقت میں موجود تھا۔

معاملہ طے کرنے کے بعد میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور کورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "وہ لوگ ایک آدمی کو بھیج رہے ہیں۔ وہ ٹائر بدلنے کے بعد یہاں آ کر مجھے مطلع کر دے گا۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اتنی زحمت کی۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے کام آ سکی۔" کورا نے اٹھلا کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کو آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ کیا آپ کچھ پینا پسند فرمائیں گے؟"

وہ میرے سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے دلفریب انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس فتنہ قیامت کو دیکھتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے اس کے دلکش اور جاں فزا جسم سے نگاہ ہٹانا دوبھر ہو رہا تھا۔ بہرحال میں نے بمشکل تمام نظریں نیچی کیں اور بولا۔ "جی نہیں۔ شکریہ میرا خیال ہے پینے پلانے کے معاملے میں میرے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں۔ میں بہت جلد بہک جاتا ہوں۔"

کورا شاید میری نظروں کو تاڑ چکی تھی۔ ایک ادائے خاص سے مسکرا کر بولی۔ "میرا خیال ہے آپ بغیر پیے بھی بہک جاتے ہیں پروفیسر۔ عورت کے معاملے میں بھی آپ کے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں۔"

میں نے خوشدلی سے مسکرا کر کہا۔ "میں آپ کی ذہانت اور مردم شناسی کی داد دیتا ہوں۔"

"مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "بہرحال میرا مطلب یہ تھا کہ ایک شریف النفس آدمی کو عورتوں سے کم ہی واسطہ پڑتا ہے کیونکہ وہ چھچھورے مردوں کی طرح عورتوں کے پیچھے دوڑا نہیں پھرتا۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ سمجھیں گے بھی نہیں۔" کورا نے پھر اٹھلا کر جواب دیا۔

"خیر چھوڑیے اس موضوع کو۔ یہ بتایئے آپ کیا کرتی ہیں۔"

"میں ہائی ہیٹ کلب میں گلوکارہ کے طور پر کام کرتی ہوں۔ کیا آپ واقعی کچھ نہیں پییں گے؟"

"تم بہت وضع دار لڑکی ہو۔" میں نے بے تکلفی سے آپ سے تم پر آتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارا اصرار ہے تو اسکاچ کا ہلکا سا گلاس بنا دو۔"

"میں ابھی لائی۔" کورا نے کھڑے ہو کر کہا۔

آدھا گھنٹہ ہم مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ کورا اس دوران میں مجھ سے خاصی بے تکلف ہو چکی تھی۔ میری باتوں میں بڑی دلچسپی لے رہی تھی۔ مزید دس منٹ بعد فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ کورا

دروازہ کھولنے کے لیے اٹھی۔ میں بھی اس کے عقب میں تھا۔ باہر دروازے پر سرخ بالوں اور تیکھے نقوش والا ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے مستریوں کا مخصوص میلا کچیلا لباس پہن رکھا تھا۔

"آپ ہی پروفیسر ڈیکن ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں فرمایئے؟" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

سرخ بالوں والے شخص نے اپنے ورکشاپ کی طرف سے جاری شدہ ایک سلپ میری طرف بڑھائی اور بولا۔ "آپ کی کار تیار ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ کام میں کچھ زیادہ دیر لگ گئی۔"

میں نے اسے ادائیگی کر کے سلپ جیب میں ڈالی اور بولا۔ "میرے حساب سے تو زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ کام کی نوعیت ..." دفعتاً میں کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سرخ بالوں والا مستری اپنی چمکدار آنکھوں سے باقاعدہ مجھے گھور رہا تھا۔

"میرا خیال ہے تم کسی الجھن میں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے پہلے آپ کے نام پر دھیان نہیں دیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ وہی پروفیسر ہیں نا جو یونیورسٹی میں ریاضی پڑھاتے ہیں اور غالباً آج کل چھٹی پر ہیں۔"

"یہ درست ہے مگر......"

"میں اخبارات میں آپ کے بارے میں پڑھتا رہا ہوں۔ سچ پوچھیے تو مجھے آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا شاید آپ کسی ایسے منصوبے پر کام کر رہے ہیں جس کے تحت اعداد و شمار کے مطابق آنے والے نتائج کی پہلے سے پیش گوئی کی جا سکے گی۔ آپ کے شاندار فارمولے کو جوئے کی مشینوں پر آزما کر مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکیں گے اور یہ ایک سائنٹفک فارمولا ہوگا۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟"

"مجھے خوشی ہے کہ تم میرے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ ـــــ"

"میں سمجھ گیا پروفیسر کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "مگر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی میں نے آپ کو صحیح پہچانا ہے؟" اس کی نظریں کورا پر مرکوز ہو گئیں لیکن مخاطب اس نے مجھے ہی کیا۔ "پروفیسر صاحب! میں آپ سے ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کچھ وقت مجھے دے سکیں گے؟"

"دیکھو میاں تم ــــ" میں نے کہنا چاہا مگر وہ دھڑلے سے فلیٹ میں داخل ہو گیا اور دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔

"میرا خیال ہے آپ میری طرح اخبارات غور سے نہیں پڑھتے۔" سرخ بالوں والے مستری نے کہا۔

میری طرح کورا کے ماتھے پر بھی بل پڑ گئے۔ وہ بپھر کر تحکمانہ لہجے میں بولی۔ "نکل جاؤ میرے فلیٹ سے۔"

"دھیرج' دھیرج۔" سرخ بالوں والے نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے ہم تینوں کو سکون سے بیٹھ کر دوستانہ انداز میں بات کرنی چاہیے۔ یہ موقع ہم سب کے لیے بہت شاندار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس میں ہماری بھلائی ہے۔"

کورا کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "دیکھو میاں تم کوئی بھی ہو میں تمہاری یہ غیر مہذبانہ بے تکلفی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں پہلے ہی اس نیک اور شریف لڑکی کا کافی وقت برباد کر چکا ہوں اور تم نے ابھی اس کا حکم بھی سن لیا تھا لہٰذا ــــ!"

سرخ بالوں والے نے ہاتھ کے اشارے سے

مجھے خاموش کر دیا اور پرسکون لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے یہ بہتر ہی ہوگا کہ میں اپنا تعارف کرا دوں۔ اس طرح ہماری گفتگو بھی آگے بڑھے گی۔ مجھے لیری جروم کہتے ہیں۔ عام طور پر لوگ ناموں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے ہیں۔"

کورا ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ میں نے جروم کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"ذرا دم لینے دیجیے ابھی بتاتا ہوں۔" وہ بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ کر بولا۔ "چھ دن پہلے لیسٹر نامی ایک قیدی جیل سے فرار ہوتے ہوئے محافظوں کی گولی کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے جیل میں سزا بھگتتے ہوئے صرف چار ماہ ہوئے تھے جبکہ اسے سزا سات سال کی سنائی گئی تھی۔ اسے ایک مسلح ڈکیتی کے جرم میں یہ سزا ہوئی تھی۔ اس واردات میں اس نے ایک سیونگ کمپنی سے ایک لاکھ ڈالر لوٹ لیے تھے۔" جروم نے ایک گہرا سانس لیا اور کورا پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پھر بولا۔ "اس ڈکیتی کے دو دن بعد ہی پولیس نے لیسٹر کو گرفتار کر لیا تھا مگر وہ ایک لاکھ ڈالر کی خطیر رقم برآمد نہیں کر سکی تھی اور آج تک اس رقم کا پتا نہیں چل سکا ہے۔" جروم نے رک کر مجھ پر نظر ڈالی اور بولا۔ "اسی لیے میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ آپ اخبارات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اس ڈکیتی کے بارے میں اور لیسٹر کے متعلق اخبارات نے بہت کچھ لکھا تھا اور اس میں لیسٹر کی خوب صورت محبوبہ کورا اولسن کی اطلاع بھی شامل تھی۔"

"یہ بکواس ہے۔ سب کچھ جھوٹ ہے۔" کورا اولسن نے غصے سے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

جروم نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "جھٹلانے کی کوشش مت کرو۔ یہ بات ریکارڈ میں موجود ہے۔"

"میرا مطلب ایک لاکھ ڈالر کی رقم سے تھا۔" کورا نے جلدی سے کہا۔ "یہ صحیح ہے کہ میں لیسٹر سے ملتی رہی تھی مگر اس نے ایک لاکھ ڈالر میرے حوالے نہیں کیے۔ مجھے اس وقت رقم کے متعلق کوئی علم نہیں تھا جب پولیس نے لیسٹر کو گرفتار کیا اور آج بھی مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ پولیس بھی میرے بیان سے متفق ہو گئی تھی۔ انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ اس ڈکیتی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔"

"زیادہ غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" جروم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "یہاں تم اکیڈمی ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے اداکاری نہیں کر رہی ہو۔ میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ یہ موقع ہم سب کے لیے بہت شاندار ثابت ہو سکتا ہے۔"

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"مگر اس خوب صورت لڑکی کو دلچسپی ہے۔ کیوں بے بی میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"نہیں مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" کورا نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"بہرحال میں اپنی تجویز تم دونوں کے سامنے ضرور رکھوں گا۔" جروم نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ "پروفیسر صاحب جوئے کے ایک منصوبے پر کام کر رہے ہیں یہ اور بات ہے کہ یہ اسے جوئے کا منصوبہ کہنا پسند نہیں کرتے لہٰذا ہم اسے ایک باعزت نام دینے کی غرض سے اعداد و شمار اور ممکنات کا منصوبہ کہہ سکتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کئی ماہ سے اس منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا منصوبہ آج کل میں مکمل ہونے ہی والا ہے۔"

میں نے مداخلت کرنی چاہی مگر جروم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اور لڑکی سے بولا۔ "لاس

ویگاس میں لاتعداد جوئے خانے ہیں اور وہاں ایک سے بڑھ کر ایک جواری موجود ہے۔ ہر جوا خانہ اپنی مشینوں سے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتا ہے جو کہ محض روایتی ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ہر جوئے خانے کی بے پناہ آمدنی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم وہاں تہلکہ مچا دیں گے کیونکہ ہمارے پاس ایک ٹھوس سائنٹفک فارمولا اور معقول رقم موجود ہوگی۔"

"مگر ہمارے پاس کوئی معقول رقم موجود نہیں ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"رقم موجود ہے۔" جروم نے بڑے وثوق سے کہا۔ "کم از کم اتنی رقم ضرور موجود ہے کہ ہم لاس ویگاس میں ایک جوا خانہ کھول سکیں' پھر ہم آپ کا اعداد و شمار والا فارمولا مشینوں میں ڈالیں گے تو جواریوں کی تمام تر ذہانت کے باوجود ہمیں بے پناہ آمدنی ہوگی۔"

"میں بتا چکی ہوں کہ میں ایک لاکھ ڈالر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" کورا نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو۔" جروم نے اسے گھورتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔ "تم کئی ماہ سے اس دولت پر سانپ بنی بیٹھی ہو۔ اس طرح وہ رقم بے مصرف ہو کر رہ گئی ہے۔ اس منصوبے سے ہمیں معقول منافع حاصل ہوگا۔ چند ہی ماہ میں تم دولت میں کھیلنے لگو گی۔ تم منافع میں ملنے والی رقم کو کسی کاروبار میں لگا کر کئی گنا بڑھا سکتی ہو۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ پروفیسر صاحب تمہیں مل گئے بلکہ میں بھی تمہاری مدد کے لیے آ پہنچی۔"

"از راہ کرم تم میری بات بھی سن لو اپنی ہی ہانکے جا رہے ہو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "مجھے لاس ویگاس یا کسی اور جگہ جوا خانہ کھولنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں اس منصوبے پر کسی اور مقصد کے لیے کام کر رہا تھا۔"

"آدمی ہر کام کسی نہ کسی فائدے کے لیے کرتا ہے پروفیسر صاحب۔" جروم نے مسکرا کر کہا۔ "آپ اطمینان رکھیے۔ کوئی بھی دوسرا منصوبہ آپ کو اس سے زیادہ فائدہ نہیں دے سکتا۔"

"میں نے کہہ دیا نا کہ مجھے اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ نوٹوں کی بارش کا تصور کریں تو آپ کو دلچسپی ہو جائے گی۔ ساری عمر ملازمت کر کے آپ کو کیا حاصل ہوگا؟ آپ کی بے مثال ذہانت کا بہت بڑا انعام ہونا چاہیے۔ کیا آپ کو اپنا مستقبل تابناک بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ اب کورا بھی میری طرف دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اچانک پوچھا۔ "آپ کس مقصد کے لیے اس منصوبے پر کام کر رہے تھے پروفیسر؟"

"میں اپنے منصوبے کو مثبت کاموں کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ منفی مقاصد کے لیے نہیں۔" میں مزید کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا مگر کورا نے توجہ جروم کی طرف مبذول کرائی۔

"جوئے خانے پر کتنا خرچ آئے گا اور منافع میں ہم سب کا کتنا حصہ ہوگا۔" کورا نے پوچھا۔

"اس منصوبے میں ہم تینوں برابر کے حصے دار ہوں گے۔" جروم نے مسکرا کر جواب دیا۔

کورا چند لمحے بغور اسے دیکھتی رہی پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "ٹھیک ہے میں اس منصوبے کو آزمانے کے لیے تیار ہوں مگر میں ابتدا میں آدھی رقم لگاؤں گی۔ اگر منافع معقول ہوا تو باقی رقم بھی لگا دوں گی۔"

جروم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "پچاس ہزار ڈالر کافی ہوں گے۔ میرے خیال میں اس کے بعد اور پیسوں کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ کیوں پروفیسر؟"

"ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔" میں نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔ "مگر میں تمہیں نظریہ بتا چکا ہوں۔"

"میں آپ سے کہہ چکا ہوں پروفیسر کہ ہر آدمی کسی نہ کسی فائدے کے لیے کام کرتا ہے۔" جروم نے میرے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہا۔ "از راہ کرم اپنا نظریہ تبدیل کر لیں۔ آپ نے بڑھاپے کی طرف سفر شروع کر دیا ہے۔ بہت جلد آپ کو ریٹائر کر دیا جائے گا اور پھر آپ اپنے فارمولے سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ آپ کو وہ پچاس ہزار ڈالر بھی میسر نہیں آ سکیں گے جو اس وقت ایک منافع بخش کاروبار کے لیے قدرت ہمیں کورا کے ذریعے مہیا کر رہی ہے۔"

میں نے کورا کی طرف دیکھا۔ پھر جروم کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔ میں عجیب الجھن میں پڑ گیا تھا۔ خاصی دیر غور و خوض کرنے کے بعد بالآخر میں نے کہا۔ "مجھے تمہارے منصوبے میں کوئی خاص دلچسپی تو محسوس نہیں ہو رہی بہرحال میں تم دونوں کا ساتھ دوں گا۔"

"بہت خوب۔" جروم نے مسکراتے ہوئے خوب صورت کورا سے کہا۔ "ہاں تو رقم کیسے آئے گی؟"

"رقم سیف ڈپازٹ میں محفوظ ہے۔ میں صبح لے آؤں گی۔" کورا نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ دوپہر کو ایک فلائٹ لاس ویگاس جاتی ہے۔ میں صبح پروفیسر صاحب سے ملوں گا اور ہم دونوں گیارہ بجے آ کر تمہیں ساتھ لے جائیں گے۔" جروم نے کہا اور میرا بازو تھام کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ "آیئے پروفیسر صاحب' میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

نیچے بلڈنگ کے کاریڈور میں پہنچ کر لیری عرف جروم نے پرجوش انداز میں میرا بازو بھینچا اور سرگوشی میں بولا۔ "میں نے تم سے کیا کہا تھا' بنکو' مانتے ہو نا؟"

میں نے اپنا بازو چھڑایا۔ موٹے شیشوں کی بے ہودہ عینک اتار کر آنکھیں ملیں اور برا سا منہ بنا کر بولا۔ "تم یہ معاملہ ذرا جلدی بھی ختم کر سکتے تھے۔ اف خدایا۔ اگر آدھا گھنٹہ مزید لگ جاتا تو اس عینک نے مجھے اندھا کر دینا تھا۔"

"اور اس وگ نے تمہیں زیادہ پریشان تو نہیں کیا؟" لیری نے میری سفید بالوں والی وگ کی طرف اشارہ کیا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی بولا۔ "میں تمہارا فون ملتے ہی ٹیکسی لے کر آ پہنچا تھا پھر میں نے تمہارے ٹائر میں ہوا بھروائی اور فلیٹ پر پہنچ گیا۔"

"ایک ٹائر میں ہوا بھرنے کا معاوضہ پچاس ہزار ڈالر برا تو نہیں ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ بائیں آنکھ دبا کر بولا۔ "پچاس ہزار ڈالر میں سے ساڑھے چودہ ڈالر مزید گھٹا دو جو میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا تھا۔"

ہم اپنی کار تک پہنچ چکے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور بولا۔ "چل یار معاملہ طے پا ہی گیا۔"

"خرچ بھی کافی آ گیا۔" لیری نے انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا۔ "مکینک کی یہ وردی خریدنی پڑی' جیک غائب کرنے کے لیے کورا کی کار کی ڈکی کے لیے چابی بنوانی پڑی۔ اس کی کار سے جیک میں نے ہائی ہیٹ کلب کے پارکنگ شیڈ میں اڑایا تھا۔ پھر اس وردی کو گندا کرنے کے لیے موبل آئل اور گریس بھی

خریدنا پڑا۔"

"اور اب میرا خیال ہے لڑکی کو بے ہوش کرنے کے لیے کلوروفارم بھی خریدنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں کلوروفارم تو خریدنا ہی پڑے گا مگر یہ طریقہ بہت اچھا رہے گا۔ ہمیں تشدد نہیں کرنا پڑے گا۔ شور بھی نہیں مچے گا اور وہ بڑے مزے سے بے ہوش ہو جائے گی۔ آؤ چلو کلوروفارم بھی خرید ہی لیتے ہیں۔" لیری نے کہا۔

لیری عرف جروم ایک ذہین و فطین شخص تھا۔ ہیرا پھیری کے معاملے میں اس کا ذہن خوب چلتا تھا۔ وہ لاس ویگاس کے ایک جوئے خانے میں ملازم تھا مگر اسے وہاں زیادہ تنخواہ نہیں ملتی تھی جبکہ اس کے عزائم اور خواہشات بہت بلند تھیں چنانچہ وہ لاس ویگاس چھوڑ کر ہالی وڈ آ گیا تھا اور یہ کام اس نے کورا ولسن کو شناخت کرنے کے بعد کیا تھا۔ کورا الیسٹر والے معاملے میں پولیس کو مطمئن کر کے سیاحت کر رہی تھی اور اس نے لاس ویگاس کے جوئے خانوں کو بے پناہ مالی فائدہ پہنچایا تھا۔ وہ بے چاری بہت اچھی جواری ہونے کے باوجود وہاں بری طرح ہارتی تھی۔ لیری نے وہیں اسے پہچانا تھا اور اس کا اندازہ تھا کہ کورا نے جوئے بازی میں کم از کم پچاس ہزار ڈالر گنوا دیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کورا نے آج ہمارے منصوبے میں شریک ہونے کے لیے صرف آدھی رقم کی پیش کش کی تھی۔ اس کے پاس اب دراصل پچاس ہزار ڈالر ہی رہ گئے تھے۔ بہرحال لیری نے اس معاملے کو بڑی ذہانت سے نمٹایا تھا اور کورا جیسی حرافہ کو جو پولیس کو بھی غچہ دے گئی تھی۔ اسے باآسانی شیشے میں اتار لیا تھا۔ لیری کے منصوبے میں انسانی نفسیات کو بھی بڑا دخل تھا۔ کورا لاس ویگاس میں پچاس ہزار ڈالر ٹھکانے لگا کر واپس ہالی وڈ آئی تھی اور اب رقم کو واپس لینے کے چکر میں مری جا رہی تھی۔

لیری نے کورا کی اس دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ اسے ہمارے نام نہاد سائنٹفک فارمولے کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا جس کے تحت جوئے کی مشینوں سے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کیے جا سکتے تھے۔ یقیناً یہ تصور اس کے لیے دل خوش کن اور جاں فزا ہوگا کہ جس راستے پر وہ اپنی آدھی پونجی گنوا آئی تھی۔ اس راستے سے وہ کئی لاکھ ڈالر کما لے گی۔

بہرحال اب ہمارے اور پچاس ہزار ڈالر کے درمیان محض دس گھنٹے رہ گئے تھے اور یہ جدائی ہمیں بہرطور برداشت کرنی ہی تھی۔

اگلے دن لیری اس قدر بے تاب تھا کہ دس بجے ہی میرے گھر آ پہنچا اور کورا کے گھر چلنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ ہم کورا کے گھر پہنچے اور اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا تو اس وقت بھی بمشکل ساڑھے دس ہی بجے تھے جبکہ کورا سے ہمارا وقت گیارہ بجے کا طے ہوا تھا۔

"تم نے تو گیارہ بجے آنے کے لیے کہا تھا۔" کورا نے لیری کو یاد دلایا۔

"میں نے سوچا کہ نئی زندگی کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہم تینوں بیٹھ کر کچھ پی پلا لیں۔ کیا تم رقم لے آئی ہو؟"

کورا نے اثبات میں سر ہلا کر بیگ کو تھپتھپایا پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔ "آپ بھی پئیں گے پروفیسر! آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کے اعصاب بہت کمزور ہیں۔"

"تمہارے ساتھ رہ کر میرے اعصاب مضبوط ہو جائیں گے یہ خصوصی موقع ہے۔ مجھے تم دونوں کا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔"

میں نے موٹے شیشوں کی عینک ناک پر ٹھیک سے جماتے ہوئے کہا۔

"واقعی یہ ایک خصوصی موقع ہے۔" کورا نے کچن کی

طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آپ اسکاچ ہی پئیں گے نا؟"

"ہاں آج بھی اسکاچ ہی چلے گی۔" میں نے لیری کو رستہ دیتے ہوئے کہا۔

لیری پراعتماد اور پرسکون دکھائی دے رہا تھا جب کورا بوتل اور گلاس لے کر آئی تو اس نے بڑی صفائی سے کورا کے گلاس میں بے ہوشی کا سفوف ڈالا کہ وہ محسوس بھی نہ کر سکی۔ پہلے ہمارا ارادہ کورا کو کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کرنے کا تھا۔ مگر کلوروفارم نہ ملنے پر ہم بے ہوشی کا سفوف لے آئے تھے۔ کورا خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔ آنے والے خوشگوار دنوں کے تصور نے اس کے جسم میں جوش بھر دیا تھا۔ اس نے بڑی خوشی خوشی گلاس اٹھایا اور ہم تینوں نے گلاس آپس میں ٹکرا کر مشروب ختم کر لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کورا کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور آخر کار وہ بے ہوش ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

لیری نے کورا کے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "رقم اپنے بریف کیس میں منتقل کر لو۔ میں ذرا فلیٹ کا جائزہ لے لوں۔ شاید کچھ اور مال ہاتھ آ جائے۔"

میں نے بمشکل کورا کا بیگ کھولا۔ بیگ کھلتے ہی سیٹی کی سی آواز آئی۔ میں نے فوراً پیچھے ہٹنا چاہا مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔

اسپرنگ والا ایک آہنی مکا میری کنپٹی پر پڑا اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو کورا ولسن بدستور فرش پر بے ہوش پڑی تھی اور لیری جا چکا تھا۔ میرا بریف کیس بھی غائب تھا البتہ کورا کا بیگ موجود تھا۔ بیگ مکمل طور پر خالی تو نہیں تھا چونکہ اسپرنگ والا آہنی مکا اب بھی اس میں سے جھانک رہا تھا۔ البتہ رقم نام کی کوئی چیز اس میں موجود نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے صورت حال پر غور کرتا رہا پھر میں نے فیصلہ کیا کہ کورا کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی مجھے رخصت ہو جانا چاہیے اسی میں عافیت تھی۔ میں کراہتے ہوئے اٹھا تو میری نظر ایک کاغذ پر پڑی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ لیری نے جانے سے پہلے میرے نام ایک خط لکھا تھا وہ خط کچھ یوں تھا۔

پیارے پروفیسر!

اب تک جو اخراجات ہو چکے ہیں ان میں دس ڈالر کا اضافہ کر لینا۔ یہ دس ڈالر اسپرنگ والا مکا خریدنے پر صرف ہوئے تھے۔ برا مت ماننا تمہاری تواضع کے لیے مجھے مہنگے داموں کا ڈیلکس مکا خریدنا پڑا۔ رات میں نے اپنے منصوبے میں تھوڑی سی تبدیلی کی تھی اور کورا سے دوبارہ جا کر ملا تھا۔ اس احمق اور لالچی لڑکی کو میں نے بتایا تھا کہ میں نے پروفیسر سے فارمولا حاصل کر لیا ہے اور اب ہم صبح اسے آہنی مکے سے بے ہوش کر کے لاس ویگاس فرار ہو جائیں گے تاکہ منافع میں سے خواہ مخواہ تیسرا حصہ نہ نکالنا پڑے۔ لالچی اور احمق کورا فوراً مان گئی اور اس نے مجھے اپنے بیگ میں اسپرنگ والا مکا فٹ کرنے کی اجازت دے دی۔ بے چاری کورا! اسے کیا معلوم تھا کہ وہ تمہارے جبڑے پر آہنی مکا لگتے نہیں دیکھ سکے گی۔ اگر تمہیں چوٹ زیادہ لگی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں اور ہاں مجھے لاس ویگاس میں تلاش کرنے کی کوشش مت کرنا۔ کیونکہ میں نے ابھی طے ہی نہیں کیا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔

مخلص

لیری!

❖

ناگہانی آفت

ناظم بخاری

عام انسان' سرمایہ کار' سیاستدان کیا کیا منصوبے بناتے ہیں لیکن وہ ایک بڑی منصوبہ ساز کو فراموش کر بیٹھے ہیں جو اوپر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے اور اسی کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔
سسپنس سے پر ایک خوب صورت کہانی' جس کا اختتام پڑھ کر آپ چونک اٹھیں گے

پوری کوٹھی برقی قمقموں کے نور سے منور تھی۔ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ دن کا سماں ہے یا رات کا۔ وہ کوٹھی سیکڑوں جانے پہچانے اور اجنبی لوگوں کی اکثریت سے اٹی ہوئی تھی۔ پینے پلانے کا دور چل رہا تھا۔ قہقہے اڈر رہے تھے۔ وہ ہلا گلا رات کے ابتدائی پہر سے جاری تھا اور اب آدھی رات ہونے والی تھی۔ اب لوگ وہاں سے رخصت ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدم' باہر کھڑی ہوئی گاڑیوں کی جانب اٹھنے لگے۔ دھیرے دھیرے محفل کی چمک ماند پڑ گئی' بہت سے لوگ پی کر بدمست ہو چکے تھے۔ جن میں وجاہت بھی تھا۔ گو اس نے ایک گھونٹ بھی نہیں پی تھی مگر وہ بن پئے ہی اپنے آپ میں نہیں رہ پا رہا تھا۔ وہ اس کوٹھی کے مالکان کا تنہا وارث تھا۔ پوری کوٹھی میں ہنگامہ' لوگوں کی آمدورفت' اس کی شادی کے سلسلے میں تھی۔

آج اس کی سہاگ رات تھی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتا اس کمرے میں پہنچا جہاں اس کی جانِ حیات اس کی منتظر تھی۔ اندر پہنچتے ہی اس نے ایک طائرانہ نگاہ پورے کمرے پر ڈالی' پورا کمرہ دل و دماغ کو تسخیر کر دینے والی کسی خوشبو سے مہک رہا تھا' کمرے کے دروازے سے لے کر ڈبل بیڈ تک فرش کو گلاب کی پتیوں سے سرخ کر دیا گیا تھا۔ یہ سرخی بیڈ کے پورے وجود پر بھی چھائی ہوئی تھی۔ وہ پھولوں کی پتیوں کو ز[illegible] سے اپنے پاؤں تلے روندتا بیڈ کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس سیج کی لڑیوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹایا اور بیڈ [illegible] بیٹھ گیا۔ اچانک اس کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ [illegible] کی نگاہ دلہن پر پڑی۔ سرخ آنچل میں سے آدھا [illegible] یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے بادلوں نے آدھے چاند [illegible] اپنی گرفت میں لے کر آزاد نہ کرنے کی قسم کھائی ہو۔ اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

اسے بے ساختہ وہ محفل یاد آنے لگی جس میں [illegible] نے حنا کو دیکھا تھا۔ وہ بھی شادی کی کوئی ایسی [illegible] تقریب تھی' جب وہ سنگ مرمر سا وجود اسے نظر آیا تھا۔ اس مجسمے کو دیکھتے ہی اس کی دھڑکنیں تھمنے لگی تھیں۔ یقیناً وہ مورت فرشتوں نے بڑی محنت سے تراشی [illegible] اسے چاندنی سے نہلایا گیا تھا۔ تبھی تو اس کے چہرے پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ آنکھیں ایسی شفاف تھیں جیسے وہیں کہیں ماہ و انجم مکیں ہوں۔ چہرہ اس [illegible] نفیس تھا جیسے چھونے سے سلوٹ پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ لبوں کی پنکھڑیاں گواہ تھیں کہ ابھی ان پنکھڑیوں [illegible] رس کسی بھنورے کو نصیب نہیں ہوا۔ بات یہ نہیں تھی [illegible] صرف وجاہت ہی اسے دیکھ رہا تھا' نہیں اس [illegible] برق محفل میں وہ بہت سی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ مگر بذاتِ خود اس کی نگاہ کسی پر نہیں پڑ رہی تھی۔

اپنی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھی۔ اسے معلوم تھا دیکھو مت' دکھو دیکھنے سے اہمیت کم ہو جاتی ہے' دکھنے سے اہمیت بڑھ جاتی ہے' وجاہت بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے ہوئے تسلیم کر رہا تھا۔ وہ واقعی دکھنے کے قابل ہے۔ اپنانے' دل میں سما جانے کے قابل ہے' اس نے زندگی میں بہت سے حسین چہرے دیکھے تھے۔ ایسی بہت سی حسین محفلوں میں شرکت کی تھی' مگر وہ تسلیم کر رہا تھا' کھلے دل سے تسلیم کر رہا تھا کہ اس جیسی صورت پہلے کبھی سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کی دھڑکنوں کو یوں اپنی جانب کبھی نہیں کھینچا تھا۔ جیسے وہ اب اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ وجاہت کی طرف اٹھی' وجاہت اسے اتنی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے لبوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ اچانک پوری محفل ایک غیر مانوس سے اجالے کی دھند میں آ گئی۔ وجاہت نے اس کی توجہ اپنی طرف دیکھی تو مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سنا تھا کہ چاند ہمیشہ فلک پر ہی دکھائی دیتا ہے' مگر آج یہ غلط ثابت ہو گیا۔ آج کسی نے چاند فلک پر نہیں زمیں پر دیکھا ہے۔ آپ بہت خوب صورت ہو۔'' چاند کی مسکراہٹ مزید اجالوں کو دعوت دے گئی۔ وہ گویا ہوئی تو لفظ گویا کھلکھلا پڑے۔ اسے وجاہت کی یہ بے تکلفی اچھی لگی تھی۔ اس نے بھی اسے بے تکلفی سے جواب دیا۔

''چلو تسلیم کہ چاند زمین پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس چاند کو کبھی تسخیر کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے' کیونکہ ایسی کوششیں اکثر لاحاصل ہی رہتی ہیں۔''

''جن لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ایسی کوششیں لاحاصل رہتی ہیں ان کے دعوؤں کو غلط ثابت کرنا میں اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتا ہوں۔''

لب ایک بار پھر مسکرانے کے سے انداز میں کھنچ گئے۔ ''اتنا مان اچھا نہیں ہوتا۔''

''اگر یہ مان بجا ہو تو غلط بھی نہیں ہوتا۔''

''اچھا!'' ایک کھنکتی ہوئی ہنسی فضا میں بکھر گئی۔

''دیکھیں گے' اچانک کسی نے پیچھے سے اس چاند کو آواز دی۔ ''آؤ حنا! چلیں۔''

''او کے گڈ بائے'' وہ چاند اسے گڈ بائے کہہ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے ایک گہری سانس لی۔

وہ ماہ جبیں دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دل میں' اس کی روح میں آ بسی تھی۔ وہ خود کو اس کے بغیر نامکمل محسوس کرنے لگا۔ جیسے وہ اس کے وجود کا کوئی حصہ ہو' جو اس سے کاٹ کر دور کر دیا گیا ہو۔ ایک عجیب سی بے چینی رگِ جاں میں سرایت کر گئی۔ اس نے سوچ لیا' دل میں ارادہ باندھ لیا کہ وہ اس چاند کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا کہ یہ چاند کس گھر کا مکیں ہے اور کب سے مکیں ہے؟ اور یہ چاند آج تک نگاہوں سے اوجھل کیوں تھا۔ وہ نہ صرف اس کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا بلکہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حاصل کر کے اپنی کہی ہوئی باتوں کو سچ بھی ثابت کرے گا۔ وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا' وہ اس کی خالہ زاد کزن ثمینہ تھی۔

وجاہت ایک پرکشش اور خوب صورت شخصیت کا مالک تھا' ایسا ضرور تھا کہ اس سوسائٹی میں رہنے والی کئی دوشیزائیں اس کے آگے دل ہار گئی تھیں مگر وجاہت کے دل میں کوئی گھر نہ کر سکی تھی۔

وجاہت کی چاہت میں گرفتار ہو جانے والی دوشیزاؤں میں ثمینہ بھی شامل تھی' اس نے بڑی شدت اور چاہت سے اس کی جانب قدم بڑھائے تھے مگر وجاہت کی بے اعتنائی دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی تھی' وجاہت کی بے اعتنائی دیکھ کر اس کے لب مسکرانے کے سے

انداز میں کھنچ گئے تھے جیسے یہ محبت کوئی محبت نہ ہو بلکہ کوئی سودا ہو۔ اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو۔ نہیں دیا تو کوئی بات نہیں۔ نہیں لیا تو کوئی بات نہیں، کوئی نفع نہیں کوئی نقصان نہیں۔ جب کسی شے کی شراکت ہی نہیں تو ان باتوں کا سوال ہی کیا؟ (تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی) ثمینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اس حالت سے لگتا ہے کہ وہ تمہیں اندر باہر سے لوٹ کر لے گئی ہے۔ میری مانو تو اپنی لٹوائی ہوئی چیزوں پر فاتحہ پڑھ لو۔ وہ جتنی بلندی پر رہتی ہے، تم اتنی بلندی پر پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' وجاہت کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ ''یہ وہ کیا کہہ رہی ہے؟ سچ کہہ رہی ہے؟ کیا وہ واقعی اتنی بلندی پر رہتی ہے کہ وہ اس تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ، کروڑوں کی جائیداد کا تنہا وارث۔ اس نے بے یقینی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو یہ بات؟ تم اسے جانتی ہو؟''

''بہت اچھی طرح، سارا بائیوڈیٹا معلوم ہے مجھے اس کا۔'' وہ اسے ساتھ لے کر ایک ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی۔

''ذرا تفصیل سے بتاؤ مجھے اس کے بارے میں۔ کون ہے یہ، کیا نام ہے اور کرتی کیا ہے؟'' اس کی بے تابی دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

''ایک شرط پر۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''تمہیں اپنی کل کی ایک حسین شام میرے نام کرنا ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے وجاہت کو کسی مشکل میں ڈال دیا ہو۔ وجاہت کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ بات صرف ایک شام اس کے نام کرنے کی نہیں ہے بلکہ اس شام اسے اور بھی بہت کچھ اس کے نام کرنا پڑے گا۔ وہ خفا نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

ثمینہ چند لمحوں تک اس کے خفگی بھرے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اچانک کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ''او کے او کے، خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مذاق کر رہی تھی۔'' اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔

''شیخ امین کی بیٹی ہے۔ شیخ صاحب کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟ پاکستان میں ان کا مختصر سا بزنس، بس، چھبیس ٹیکسٹائل ملز کی صورت میں بکھرا ہوا ہے۔ باقی جتنا بزنس ہے وہ ترقی یافتہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ اسے تم ان کی بدقسمتی کہو یا خوش قسمتی کہ حنا ماں باپ کی واحد اولاد ہے۔ حنا اور اس کے گھر والوں کی بلندی کا اندازہ تم اس بات سے لگا لو کہ ان میں سے کسی بھی فرد کا ذاتی بینک بیلنس دس، گیارہ ہندسوں سے کبھی نیچے نہیں آیا۔ ان باتوں کے بعد اپنی اور ان کی حیثیت کا اندازہ خود لگا لو۔'' وجاہت کا دل بیٹھنے لگا۔

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟'' وہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

''تمہیں آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے۔ نہ کہ پیڑ گننے سے۔ اگر میری کہی ہوئی باتوں میں سے کوئی ایک بھی غلط ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔'' وجاہت کی پیشانی ایک بار پھر شکن آلود ہو گئی۔ اگر یہ تمام باتیں درست تھیں تو پھر واقعی اس گوہر نایاب کا ملنا دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔ گو وہ خود بھی کروڑوں کی جائیداد کا اکیلا وارث تھا۔ شکل و صورت تعلیم و تربیت میں بھی ہزاروں میں ایک تھا، مگر اس ماہ جبیں کی حیثیت اس سے کئی گنا بڑھ کر تھی۔ وہ چاہ کر بھی اپنے آپ کو ان کے برابر نہیں لا سکتا تھا۔ ثمینہ اس کے متفکر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہو

''اب آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ اب پھنسی ہے مچھلی جال میں۔'' اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس سر پھرے مگر پرکشش شخصیت کے مالک نوجوان کے لیے اپنا مزید وقت برباد نہیں کر سکتی تھی۔

''او کے وجی! بائی بائی۔'' وہ مسکراتے ہوئے چل دی۔ اس کے جانے کے چند لمحوں بعد وہ متحرک اجالا اس کے روبرو اس چیئر پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کا پر تفکر چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی اہم معاملے میں بہت دور تک سوچ رہا ہے۔ حنا نے پر اعتماد نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ گو وہ اسے نہیں جانتا تھا مگر حنا ایک حد تک اسے جان گئی تھی۔ محفل میں وہ واحد فرد تھا جو اس کے دل کو بھا گیا تھا۔ وہ پیار محبت کی قائل نہیں تھی۔ اب تنہا جانے کو صرف ایک پسند خیال کر رہی تھی۔ پہلی نظر میں جیسے وہ وجاہت کے دل میں جا اتری تھی ویسے وجاہت نے بھی اسے ایک حد تک متاثر کیا تھا۔ اسے اپنے گھر والوں کی طرف سے اپنا جیون ساتھی چننے کی مکمل آزادی تھی۔

وہ ایک آزاد خیال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اندرون اور بیرون ملک اس کی کافی لڑکوں سے دوستی رہی تھی مگر یہ دوستی صرف دوستی ہی رہی۔ ان دوستوں میں اسے ایک بھی کوئی ایسا دوست نہ مل سکا جسے وہ اپنے ہم سفر کے طور پر چن سکتی۔ آج وجاہت کو دیکھ کر اس کے دل نے کہا کہ ہاں یہی وہ شخص ہے جسے وہ اپنے ہم سفر کے طور پر چن سکتی ہے، اپنا بنا سکتی ہے، مگر وہ خود اس کی طرف قدم بڑھا کر اپنی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ منتظر تھی کہ وجاہت اس کی طرف بڑھے۔ اس نے وجاہت کی آنکھوں میں جھانک کر یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اب اگر اس کی آنکھوں، اس کی روح میں کوئی ہے تو صرف وہ ہے۔ اب وہ نہیں، وجاہت اس کی طرف آئے گا۔ اس مختصر سے عرصے میں اس نے وجاہت کے بارے میں کچھ حد تک معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس کا اب تک کا وقت دیار غیر میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے گزرا تھا۔ جیسے وجاہت کے لیے وہ اجنبی تھی، ویسے ہی وجاہت بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ یہ جان کر اسے کچھ تسلی ہوئی تھی کہ وہ تعلیم یافتہ، مہذب، باکردار اور ایک خوشحال گھرانے کا واحد چشم و چراغ ہے۔ گو ان کے اسٹیٹس میں بہت فرق تھا مگر یہ فرق مٹایا جا سکتا تھا۔ اگر وہ چاہتی تو۔   وہ بھی یہی چاہتی تھی، اس اسٹیٹس کے فرق کی خلیج کو پاٹنا چاہتی تھی مگر کسی طریقے، کسی سلیقے سے   ۔ وہ کھنکاری، اس کے کھنکارنے پر وجاہت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ زمین پر دیکھے جانے والے چاند کو پانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ ایسی کوششیں اکثر لاحاصل ہی رہتی ہیں۔ مگر تم نے کہا تھا کہ تم ان دعوؤں کو غلط ثابت کرنا اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے ہو۔ ابھی ابھی ثمینہ یہاں سے اٹھ کر گئی ہے، میں نے تم دونوں کی باتیں سنی ہیں۔ یقیناً تم میرے بارے میں ایک حد تک جان گئے ہو اور اتنا جاننے کے بعد میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ تم نے اب اس چاند کو تسخیر کرنے کا خیال اپنے دل سے نکال دیا ہوگا؟''

وجاہت نے ایک گہری سانس لی۔ ''جو ایک بار دل میں آ بسے اسے دل سے نہیں نکالا جا سکتا۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر ایک ایسی بات کہہ دی تھی جو کہ مجھے تمہیں جاننے کے بعد کہنی چاہیے تھی۔ خیر   . جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا، میں اپنے اور تمہارے درمیان اس اسٹیٹس کے فرق کی خلیج کو پاٹنے کی اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔''

وہ مسکرائی۔ ''اگر نہ پاٹ سکے تو   ؟''

وہ چپ رہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے دعوے سب دعوے ہی تھے؟"

"میں جانتا ہوں کہ یہ ایک ناممکن بات ہے مگر۔ اگر مجھے اس خلیج کی دیوار کو پاٹنے کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑی، کوئی بھی راستہ اپنانا پڑا میں ضرور اپناؤں گا۔ بشرطیکہ کوئی قیمت ہو، کوئی راستہ ہو۔" حنا نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم واقعی اس خلیج کو پاٹ سکو گے؟ کسی بھی قیمت پر، کوئی بھی راستہ اپنا کر......؟"

"کاش مجھے اپنی باتوں کو سچ ثابت کرنے کا صرف ایک موقع ملے۔ اس کے بعد میرا ہر عمل میری ہر بات کا گواہ ہوگا۔"

"کیا کر سکتے ہو تم میرے لیے؟"

"سب کچھ، کچھ بھی۔" حنا نے ایک گہری سانس لی۔ "میری مما، پاپا نے مجھے اپنا جیون ساتھی چننے کی مکمل آزادی دے رکھی ہے اور میں اپنی مالی حیثیت سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ تم یقین کرو، ایسے انگنت خوش شکل اور تعلیم یافتہ فرد ہیں جو صرف میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ میرا صرف ایک اشارہ انہیں ارب پتی بنا سکتا ہے۔ اور ایسے کئی ارب پتی بھی میرے صرف ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ مگر مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ تم مجھے اچھے لگے ہو اسی لیے میں نے تم سے اتنی باتیں کر لی ہیں۔ تم نے کہا کہ تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو، اگر ایسا ہے تو میری صرف دو شرائط ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مان لو۔ میں اپنا وجود تمہارے نام کر دوں گی۔ پہلی، تم اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہاں رہنا قبول کر لو۔ دوسری یا پھر اپنی تمام پراپرٹی، بزنس، بینک بیلنس میرے نام کر دو۔ میں نے تمہیں رستہ دکھا دیا ہے، قیمت بتا دی ہے۔ اب اگر تم چاہو تو اپنے دعوؤں کو سچ ثابت کر سکتے ہو۔" اس نے اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "اس پر میرا موبائل نمبر درج ہے۔ تم کیا فیصلہ کرتے ہو، یہ تم خود سوچ لو، تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ ایک ہفتے میں جو فیصلہ کرنا، مجھے اس سے آگاہ کر دینا۔ میں منتظر رہوں گی۔" اس نے کارڈ وجاہت کو تھمایا، ایک مسکراتی ہوئی نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی مسکراتی ہوئی نظریں کہہ رہی تھیں۔ "چاند کو تسخیر کرنے کا دعویٰ کرنے والے، تم فقط ایک ستارہ ہو اور ستارے کبھی چاند کو تسخیر نہیں کرتے۔ مگر میں تمہیں خود کو تسخیر کرنے کے دو راستے دکھا کر جا رہی ہوں۔ حوصلہ ہے، دعویٰ ہے تو آؤ، مجھے تسخیر کر لو۔ وہ اٹھ کر اس زرق برق محفل میں گم ہو گئی۔ نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔

"یہ کیسی قیامت سے پالا پڑا ہے۔ ایسی قیامت نہ پہلے کبھی دیکھی، نہ سنی اور نہ ہی کبھی ایسی کوئی سچویشن پیدا ہوئی۔ اب تو وہی بات ہے، نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن، کیا یہ قیامت اس کے حق میں ثابت ہوگی۔ یا اس کے خلاف۔

❁ ❁ ❁

وہ کراچی کے صف اول کے ایک اخبار کا منجھا ہوا صحافی تھا۔ گو اسے اس فیلڈ میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر اس کے قلم کی کاٹ گواہ تھی کہ اس کا قلم کئی پرانے قلم کاروں سے زیادہ آب دار ہے۔ اس کے لفظوں کے نشتر گواہ تھے کہ وہ اپنے فن میں بے حد طاق اور مخلص ہے۔ ہر ہفتے ملک کی کوئی نہ کوئی سیاسی شخصیت اس کے نوک قلم کی زد پر رہتی تھی۔ وہ اس سیاسی شخصیت کا ایسا قلمی پوسٹ مارٹم کرتا تھا کہ اس

شخصیت کا سیاست میں اپنے پیروں پر کھڑا رہنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ مگر جاننے کے باوجود بھی نہ وہ سیاسی شخصیت اس کا کچھ بگاڑ سکتی تھی اور نہ ہی اس کے کالم کو جھٹلا سکتی تھی کیونکہ وہ جو کالم بھی لکھتا تھا تمام تر ثبوت و حقائق کے ساتھ لکھتا تھا۔ اس تند و تیز شعلے سے کئی سیاسی شخصیتیں نالاں تھیں۔ کیونکہ اس نے ان کے کئی ایسے رازوں سے عوام کو متعارف کرایا تھا جن سے عوام پہلے کبھی آشنا نہیں تھے۔ شروع شروع میں اس کے کالم چھوٹے موٹے اخباروں کی زینت بنتے رہے۔

پھر ایک دن اخبار کے چیف ایڈیٹر کی نگاہ اس کے ایک کالم پر پڑی۔ وہ ایک ایسے جوہری تھے جو قلمی ہیرے کی مکمل پہچان رکھتے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی اسے نہ صرف اپنے اخبار میں لکھنے کی دعوت دی، بلکہ اسے مناسب معاوضہ بھی ادا کرنے لگے۔ یہ معاوضہ اس کی توقع سے بڑھ کر تھا۔ سو دیکھتے ہی دیکھتے خوشحالی کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔ فکر معاش سے آزادی نصیب ہوئی تو اس کی اپنے کالموں پر توجہ مزید بڑھ گئی۔ کالموں پر توجہ بڑھی تو اس کے قلم کی کاٹ مزید دو آتشہ ہو گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام سیاسی شخصیتوں پر ایسے ایسے کالم لکھنے لگا جو کسی بھی ایک سیاسی شخصیت کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صرف خدا سے ڈرتا تھا۔ جب بھی قلمی میدان میں وہ تھکاوٹ محسوس کرتا، اسے آر مہدی کے توانا بازو اسے اپنے کاندھوں پر محسوس ہوتے۔ پاکستان کی دن بدن زبوں حالی کو دیکھ کر اس کا من کڑھتا۔ وہ اس حالت کا ذمہ دار برسر اقتدار پارٹی کو سمجھتا تھا۔ جو پاکستانی عوام کو اس کا حق دینے کی بجائے دن رات اپنے دھندے کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگی تھی۔ بجلی، چینی اور آٹا عنقا تھے۔ عوام کا شمار ان پریشانیوں کے ہاتھوں نا جینے والوں میں تھا نا مرنے والوں میں۔ ایک دن حکومتی پارٹی کے چند راز اس کے ہاتھ لگے۔ وہ ایسے ہی رازوں کی کھوج میں دن رات متحرک رہتا تھا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ عوام کی طرح وہ بھی اس حکمران پارٹی سے سخت بدظن تھا۔ چند مخصوص راز اس کے ہاتھ لگے تو اس نے سوچا کہ اب ان "انصاف پرور" حکمرانوں کو منظر عام سے ہٹانے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ خود اتنا طاقتور نہیں تھا کہ ایسا کر سکتا مگر اس کے پاس قلم کی طاقت تھی۔ وہ اسے بروئے کار لا کر اگر اس حکومت کو گرا نہیں سکتا تھا تو کم از کم لڑکھڑانے پر مجبور ضرور کر سکتا تھا۔ اور انہی دنوں حکمرانوں کو بھی محسوس ہو گیا کہ اب اس کا وجود مزید برداشت نہیں ہو سکتا۔ اسے منظر عام سے ہٹا دینا چاہیے۔ منظر عام سے ہٹانے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آ رہی تھی کہ باوجود کوشش کے نہ تو اس کے قلم کا رخ موڑا جا سکا تھا، اور نہ ہی اسے خریدا جا سکا تھا۔ وہ اپنے قلم کو اپنے ایمان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ چند دن پہلے اسے اپنے کرائے کے فلیٹ پر دستک سنائی دی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی دکھائی دیا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ڈائری تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک دستی بیگ تھا۔

شاہد اقبال نے اسے وضاحتی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے اپنا تعارف کروانے کی اجازت نہیں ہے اور ویسے بھی میں اگر یہ حرکت کروں تو وہ فضول ہی ہوگی۔ مجھے اوپر سے آپ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ بیگ آپ کے لیے ہے۔" آنے والے نے بیگ اس کی طرف بڑھایا۔

"کیا ہے اس میں؟" "آپ خود دیکھ لیجیے۔" اس نے زپ کھول کر دیکھا۔ اندر کاغذ کی چند سرخ گڈیاں رکھی

ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی تھا جس پر لکھا ہوا تھا۔ "اپنی اصلاح کرلو۔ اپنے قلم کا رخ موڑ دو اور یہ گڈیاں اٹھالو۔ ہر ماہ تمہیں اتنی رقم مل جایا کرے گی اور اگر تم نے اپنے قلم کو ہمارے حق میں استعمال کیا تو ہر ماہ اس سے ڈبل رقم تمہیں پہنچادی جائے گی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ پرسکون لہجے میں کہا۔ "اپنے اوپر والوں سے کہنا کہ ابھی وہ کاغذ نہیں بنا جو شاہد اقبال کو خرید سکے۔ یہ کاغذی ٹکڑے ان کے مالکان تک پہنچادو۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم آئندہ یہاں آنے کی زحمت نہیں کرو گے۔" آنے والا بنا کچھ کہے مودب انداز میں سر جھکا کر رخصت ہوگیا۔

اگلے دن ایک اور معروف سیاسی شخصیت اس کے نوک قلم کی زد پر تھی۔ شام کو وہ دفتر سے گھر لوٹا تو اس کی چھٹی حس نے کہا کہ کچھ نہ کچھ غیر معمولی ہے۔ اس نے آگے پیچھے اوپر نیچے ارد گرد ہر جگہ بغور دیکھا تمام ماحول تمام مناظر اپنی جگہ ویسے ہی تھے۔ کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ اس کی پیشانی پر چند شکنیں ابھریں۔ پھر وہ فلیٹ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ چھٹی حس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ اندر کا منظر ویسا نہیں تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا۔

مگر اب اس فلیٹ میں ایک فرد کا اضافہ ہوچکا تھا۔ اندر ایک بہت ہی حسین دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ "ہائے مسٹر شاہد اقبال! آئی ایم شازیہ رائے۔" دوشیزہ نے مصافحے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ "کل اوپر والوں کی طرف سے ایک فرد آپ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اوپر والوں کا خیال ہے کہ وہ آپ کی صحیح خدمت نہیں کرسکا ہوگا۔ اس لیے اب یہ اعزاز مجھے سونپ کر بھیجا گیا ہے۔" وہ پیشانی پر شکنیں لاکر اسے مزید وضاحتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ دوشیزہ کا بڑھا ہوا ہاتھ مایوس ہو کر واپس اپنی جگہ چلا گیا۔ "او کے مسٹر شاہد! کوئی بات نہیں۔ بیٹھیے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ دوشیزہ نے کل جیسے ایک دستی بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

"اس بیگ میں کل سے دس گنا زیادہ رقم موجود ہے۔ یعنی پچاس لاکھ روپے۔ اوپر والوں کا خیال ہے کہ کل آپ کو پانچ لاکھ روپے دے کر آپ کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔ آپ کی قیمت پانچ لاکھ نہیں کم از کم پچاس لاکھ ہونی چاہیے۔ اس رقم کے ساتھ ساتھ یہ کنیز بھی آپ کو سونپی گئی ہے۔ آپ کا جس طرح جی چاہے اس کنیز کو اور ان روپوں کو اپنے تصرف میں لایئے۔ شرط اتنی سی ہے کہ آپ اپنے قلم کی جولانیاں اوپر والوں کے نام کردیں۔ اگر آپ نے ہامی بھرلی تو آپ کو آئندہ بھی اسی طرح نوازا جاتا رہے گا۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنا آدھا وجود بالائی حصہ اچانک ہی برہنہ کردیا۔ یوں لگا جیسے کوئی بجلی اچانک کوند گئی ہو۔ مگر اس بجلی کا اس پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ اگر اس وقت وہاں کوئی زاہد وعابد بھی ہوتا تو بہک سکتا تھا۔ مگر وہ اپنے قلم کی طرح کردار کا بھی پختہ تھا۔ اس کی نگاہیں صرف دوشیزہ کے چہرے پر جمی رہیں۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اپنا وجود ڈھانپو۔"

دوشیزہ کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ جیسے اس نے کوئی بچکانہ بات کہہ دی ہو۔ وہ بے حس وحرکت کھڑی رہی۔ "اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری باتوں کا کوئی جواب دوں تو پہلے اپنے وجود کو ڈھانپو!"

اس بار اس کے وجود میں جنبش ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے اتارے ہوئے کپڑے زیب تن کرلیے۔

"مجھے یقین نہیں کہ تم اس پاک سرزمین مشرق کی بیٹی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے کسی طوائف کے وجود سے ہی جنم لیا ہوگا اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ

اس کا سبب بھی اوپر والوں میں سے ہی کوئی ایک بنا ہوگا۔" دوشیزہ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ جیسے یہ کوئی اہم یا خاص باتیں نہ ہوں۔ وہ اس کے اصل مدعے کی منتظر رہی۔ "یہ کاغذی ٹکڑے لے جاکر اپنے اوپر والوں کے منہ پر مارنا۔ ان سے کہنا نہ تو کوئی مجھے آج تک خرید سکا ہے اور نہ ہی کوئی آئندہ خرید سکے گا۔ میرا آج بھی وہی جواب ہے جو کل تھا اور کل بھی وہی جواب ہوگا۔ جو آج ہے۔ اب تم جاسکتی ہو۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ دوشیزہ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

اچانک اس کے چہرے کی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ چہرے پر سنجیدگی اتر آئی۔ "مسٹر شاہد اقبال! مجھے آپ کی کوئی بات بھی بری نہیں لگی بلکہ یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ ایک باایمان انسان اور صحافی ہیں جو کسی قیمت پر بھی نہیں خریدے جاسکتے۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ جیسے باکردار صحافی اس سرزمین پر بہت کم پیدا ہوتے ہیں مگر ہوتے ضرور ہیں۔ ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ آپ اس دنیا میں رہ کر اتنا تو ضرور جان گئے ہوں گے کہ دنیا آپ جیسے لوگوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتی خاص کر جب وہ خود بے ایمان ہو۔ یقین کرو میں جو باتیں کہہ رہی ہوں مجھے ان میں سے ایک بات بھی کہنے کی ہدایت نہیں کی گئی ہے۔ تمہاری شخصیت تمہاری جوانی دیکھتے ہوئے میں یہ باتیں اپنی طرف سے کہہ رہی ہوں۔ خود پر اپنی جوانی پر کچھ ترس کھاؤ۔ تم جیسے صحافیوں سے میرا پہلے بھی واسطہ پڑچکا ہے اور اوپر والوں کا بھی۔ جب انہوں نے کسی طرح بھی جھکنا گوارا نہ کیا کسی طرح بھی نہ خریدے گئے تو انہیں منظر عام سے ہٹادیا گیا۔"

"اپنے مخلص مشوروں سے نوازنے کا شکریہ۔ میں تم سے بہتر طور پر جانتا ہوں کہ مجھے کن باتوں پر عمل کرنا چاہیے اور کن باتوں پر نہیں۔ اب تم جاسکتی ہو۔" دوشیزہ کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔

وہ رخصت ہوئی تو شاہد ایک گہری سانس لے کر اپنی ورک ٹیبل پر آبیٹھا۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ سوچنے لگا "اس کا مطلب ہے کہ صداقت اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ کڑوا سچ لوگوں کے حلق سے اترنا دشوار ہوتا جارہا ہے۔" اس نے پھر ایک گہری سانس لی۔ "میرے معبود! تو بخوبی جانتا ہے کہ میں نے ہمیشہ جھوٹ اور منافقت کے خلاف حق کے لیے جنگ لڑی ہے۔ اپنے قلم کو کبھی غلط استعمال نہیں کیا۔ کبھی اس سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ میرے معبود! مجھے ہمیشہ اسی طرح صداقت کے راستے پر قائم ودائم رکھنا۔ ہمیشہ میرے معبود! ہمیشہ۔" اس نے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور پھر کی بورڈ اٹھا کر اپنے ادھورے کالم کو مکمل کرنے لگا۔ وہ ایک بے حد خصوصی کالم تھا اور اس کے اب تک شائع ہونے والے تمام کالموں میں اہم بھی۔ ابھی یہ کالم نامکمل تھا مگر اگلے دو دنوں میں یہ کالم مکمل ہونے والا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کالم کے ساتھ ہی ایک انقلاب وجود میں آئے گا۔ چاہے یہ انقلاب عارضی ہی کیوں نہ ہو۔

اگلے دن پریس سے لوٹ کر آنے سے قبل ہی اس کا کرائے کا فلیٹ ایک دھماکے سے اڑادیا گیا۔ فلیٹ میں موجود اس کے واحد کمپیوٹر کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ جس کی ہارڈ ڈسک میں اس نے اوپر والوں کی بہت سی قابل گرفت کمزوریاں سیو کی ہوئی تھیں۔ یہ حادثہ ٹھیک اس وقت ہوا جب وہ اپنے فلیٹ کے قریب پہنچنے والا تھا۔ دھماکہ بے حد شدید تھا۔ نہ صرف اس کے فلیٹ کو نقصان پہنچا تھا بلکہ قریب قریب کے دو چار فلیٹ بھی ایک حد تک اس دھماکے کی زد میں آگئے تھے۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک

تھا۔ اپنے سامنے اتنا بڑا حادثہ دیکھ کر بھی اپنے قدموں پر کھڑا رہا۔ وہ اندازہ کر رہا تھا کہ فلیٹ میں موجود ہر شے بیکار ہوگئی ہوگی۔ یہاں تک کہ اس کا واحد کمپیوٹر بھی۔

مگر اسے کچھ خاص پروا نہیں تھی۔ کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک میں جتنا بھی ڈیٹا تھا اس مکمل ڈیٹا کی ایک کاپی اے آر مہدی کے پاس محفوظ تھی۔ یہ احتیاط اس نے کل دوشیزہ کے جانے کے بعد کی تھی۔ کیونکہ جو شخص اس کی غیر موجودگی میں فلیٹ میں داخل ہوسکتا ہے وہ یقیناً اس کے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک چوری یا بیکار بھی کرسکتا ہے۔ اس کا یہ احتیاطی قدم رائیگاں نہیں گیا تھا۔

ابھی اس کی نظریں فلیٹ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں پر ہی جمی تھیں کہ ایک چھوٹا سا بچہ اس کے قریب آرکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ بچے نے کاغذ کا ٹکڑا اسے تھما دیا۔ اس پر لکھا تھا۔

''اسے وارننگ سمجھو یا کچھ اور اب بھی وقت ہے صحافت چھوڑ دو یا اپنے قلم کا رخ موڑ دو۔ ورنہ اگلی بار ...'' بچے سے اس تحریر کے بارے میں کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ اس نے ایسی کوئی کوشش بھی نہ کی۔ اس تحریر کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک سچا مسلمان ہونے کے ناتے وہ جانتا تھا' اسے یقین کامل تھا کہ موت صرف اسی وقت ہی آئے گی جب خدا کو منظور ہوگا۔ جب بھی آئے گی' وہ باہیں کھول کر اس کا استقبال کرے گا۔ اس حادثے نے اس کی توجہ ہٹانے کی بجائے مزید توجہ سے اسے اپنے کام میں مگن کردیا۔ چند لمحوں میں ہی آگ بجھانے والی گاڑیاں وہاں آ پہنچیں۔ میڈیا والوں تک بھی خبر پہنچ گئی۔

چند میڈیا والے بھی اپنے کیمروں کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے۔ یہ خبر ان کے خبرناموں کا ایک حصہ بن گئی کہ ملک کے صف اول کے صحافی شاہد اقبال کا فلیٹ کسی ذاتی دشمنی کی بناء پر اڑا دیا گیا۔ البتہ جب شاہد اقبال سے اس سلسلے میں کچھ پوچھا گیا کہ انہیں کسی پر شک ہے یا دہشت گردوں نے کس بنیاد پر اس کے فلیٹ کو اپنا ٹارگٹ بنایا تو اس سلسلے میں شاہد اقبال نے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ وہاں سے سیدھا اے آر مہدی کے گھر پہنچا۔ انہیں مختصراً اس حادثے کے بارے میں بتایا اور ان کے کمپیوٹر پر بیٹھ کر فوراً ہی اپنا ادھورا کالم مکمل کرلیا۔ اس کالم میں صدر مملکت اور وزیراعظم کے خلاف اس نے ایسے ایسے حقائق اور ثبوت جمع کیے تھے جس سے یہ عوام پہلے کبھی آشنا نہیں تھے۔ اس نے ان کے خلاف اتنے ثبوت اکٹھے کرلیے تھے کہ اگر وہ تمام ثبوت شائع ہوجاتے تو نہ صرف صدر صاحب کو استعفیٰ دینا پڑ جاتا بلکہ عوام انہیں احتساب کے کٹہرے میں بھی کھینچ لاتے۔ وزیراعظم صاحب کی حالت بھی صدر صاحب سے کچھ مختلف نہ ہوتی۔ کالم مکمل کرنے کے بعد اس نے اے آر مہدی کو دکھایا۔ کالم پڑھتے ہی ان کے لبوں پہ ایک بھرپور مسکراہٹ اتر آئی۔ ''شاہد اقبال! میں خدا کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے نہ صرف حق وصداقت کی اشاعت کا شرف بخشا ہے بلکہ تم جیسا باایمان صحافی بھی عطا کیا ہے۔ جس پر میں بجا طور پر فخر کرسکتا ہوں۔ میری دلی دعا صرف اتنی ہے کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔''

''نہیں سر! یہ تو آپ کا بڑا پن ہے اور کچھ نہیں۔ ورنہ میں کہاں اور میری اوقات کہاں۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔ اے آر مہدی نے دل میں فیصلہ کیا کہ اس کالم کو کل ہی اشاعت کے مراحل سے گزار دیا جائے۔ اگلا دن اس کالم کی اشاعت کا دن تھا۔

❁ ❁ ❁

وسیم شام کو ڈیوٹی کر کے لوٹا تو بے حد خوش تھا۔ وہ

دبئی کی ایک گلاس کمپنی میں آپریٹر تھا۔ اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ آج اس نے اپنی کمپنی کے دفتر میں اپنا ایک ماہ کا ریزائن فارم جمع کرا دیا تھا۔ اسے کمپنی کی طرف سے ملی ہوا ویزا اختتام کو پہنچنے والا تھا اور اس کا آگے مزید کام کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ریزائن کے دن مکمل ہوتے ہی وہ پنچھی سے اڑ کر پاکستان پہنچ جاتا جہاں اس کے دوست تھے۔ عزیز تھے' احباب تھے اور سب سے بڑھ کر شازیہ تھی۔ اس کی جان' اس کی دھڑکن' اس کی شریک حیات اس کا شمار دنیا کے ان کروڑوں لوگوں میں تھا جنہیں غربت ورثے میں ملتی ہے۔ پیدا ہوا تو گھر میں غربت کی حکمرانی تھی۔ ہوش سنبھالا تو فاقے ہمراہ تھے۔ تین بہنوں کا واحد اکیلا بھائی تھا۔ باپ جیسے تیسے کرکے گھر والوں کو دو وقت کی روٹی مہیا کر رہا تھا۔ ابھی اس نے میٹرک کا امتحان بمشکل کلیئر کیا تھا کہ اس کا والد' کارخانے کی ایک مشین میں آکر اپنے ایک ہاتھ سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ گھر کی ساری ذمہ داری اس کے ناتواں کاندھوں پر آپڑی۔ کم عمری کے باوجود اس نے ہمت سے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ شروع شروع میں چھوٹی موٹی نوکریاں کرتا اور چھوڑتا رہا۔ پھر ایک اسپننگ مل میں ایک دوست کی مدد سے بھرتی ہوگیا۔ اسے بمشکل مل میں ایک برس ہی ہوا تھا کہ اس کے دوست عاصم نے اسے بتایا کہ وہ دبئی جارہا ہے۔ وسیم کے لیے یہ بات ناممکن تھی۔ اس نے اس کے سامنے بے یقینی کا اظہار کیا۔ ''یار! مجھے یقین نہیں آرہا۔ سچ بتا' کیا تو واقعی دبئی جارہا ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''ہاں میری جان! میں واقعی دبئی جارہا ہوں اور وہ بھی پندرہ دنوں کے اندر اندر۔''

''مگر یار یہ سب کچھ اتنا اچانک ؟'' عاصم قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''سب قسمت کی بات ہے پیارے اور یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا۔ میں پچھلے ایک عرصے سے ایک شخص کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی بہت رقم بھی دے رکھی تھی اسے۔ اپنی جان پہچان کا آدمی تھا' بس کام ہوگیا۔ یہ الگ بات کہ ذرا دیر سے ہوا۔'' وسیم نے اسے پر رشک نظروں سے دیکھا۔

''یار! بڑا خوش قسمت ہے تو۔ تیری تو لاٹری نکل آئی۔ کاش ایسا کوئی ایک موقع مجھے بھی ملتا تو ...''

عاصم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''فکر نہ کر یار! بس ذرا مجھے وہاں جاکر سیٹ ہوجانے دے۔ اس کے بعد میں تمہارے لیے بھی کچھ سوچوں گا۔'' اور پھر پندرہ دنوں کے اندر اندر وہ دبئی چلا گیا۔ گو اس نے وسیم سے کہا تھا کہ وہ وہاں جاکر اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا مگر اسے اس بات پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ خوش فہم سوچوں سے اپنا دل بہلانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی تھی' جس ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس سے اسے لوگوں کو سمجھنے میں بہت مدد ملی تھی۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہوگیا تھا کہ بغیر کسی لالچ کے کوئی کسی کی کچھ مدد نہیں کرتا۔ کسی کا کوئی فائدہ نہیں سوچتا۔

مگر ایک سال بعد ہی اسے اپنی ان سوچوں کی تردید کرنا پڑی۔ اسے اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ دنیا میں ہر جگہ ہی خود غرضی اور مفاد پرستی نہیں ہوتی بلکہ کہیں کہیں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جو دوستوں کے بغیر کسی لالچ کے کام آتے ہیں اور جن کے دم قدم سے ہی دنیا میں سچائی' محبت اور دوستی کا وجود قائم ہے۔ اس عرصے میں ضرورت کے تحت وسیم نے اپنا ایک ذاتی کم قیمت موبائل خرید لیا تھا۔ جس کا نمبر اس نے عاصم کے نمبر پر سینڈ کردیا تھا۔ ایک دو ماہ بعد دونوں دوستوں میں چند منٹوں کے لیے بات چیت ہوجایا کرتی تھی۔ کبھی عاصم کال کرلیتا تو کبھی وسیم۔ اس عرصے میں وسیم نے ایک بار بھی عاصم کو یاددہانی نہیں کرائی کہ

پاکستان سے چلنے سے پہلے اس نے اس کے بارے میں دبئی پہنچ کر کچھ کرنے کی بات بھی کی تھی۔ وسیم نہیں چاہتا تھا کہ اپنی غرض کی بات کرکے وہ اپنے ایک اچھے دوست کو کھو دے۔ یہ جو وہ کبھی کبھار کال کرتا ہے یا سن لیتا ہے' کہیں یہ بھی بند نہ ہو جائے۔ اسے اپنے اس دوست کی دوستی بہت عزیز تھی۔ جس نے اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں بڑی مدد دی تھی۔

دوسری طرف گو عاصم نے اس سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی' مگر در پردہ وہ اس کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ پھر ایک دن یہ بھاگ دوڑ رنگ لے آئی۔ عاصم نے اس کے موبائل پر کال کی اور دعا سلام کے بعد کہا۔ "چل جگر! اب جلد از جلد اپنا پاسپورٹ وغیرہ بنوا کر اس کی ایک فوٹو کاپی' فیکس یا ای میل کے ذریعے مجھے کمپنی کے نمبر پر سینڈ کر... میں نے اپنی کمپنی کے منیجر سے تمہارے لیے بات کرلی ہے۔ چند ماہ بعد ہماری کمپنی کے کچھ ویزے نکلنے والے ہیں۔ ان میں ایک ویزہ تمہارا بھی ہوگا۔"

وسیم کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔

"یار! تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"ابے گدھے! مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میرا مطلب ہے کوئی ایڈوانس رقم وغیرہ؟"

"اگر رقم وغیرہ کا معاملہ ہوتا تو اتنی دیر کیوں لگتی؟ ویزہ کمپنی کی طرف سے فری میں مل رہا ہے۔ رقم وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور تو تو ویسے بھی یار ہے اپنا' اگر کوئی اور ہوتا تو اس سے کچھ اینٹھ بھی لیتے' پر تجھ سے کیا لینا۔ مگر ہاں اپنی ٹکٹ کے روپوں کا ضرور بندوبست کرلینا۔ ٹکٹ کمپنی کی طرف سے نہیں ہے۔" اگلے ایک ماہ میں وسیم نے اپنا پاسپورٹ بنوا کر اس کی ایک کاپی عاصم کو سینڈ کردی اور کال کرکے عاصم کو بھی اس بات سے آگاہ کردیا۔ چند ہفتوں بعد اس کا ویزہ آگیا۔ اس نے اس سلسلے میں گھر والوں سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ جب اس کے ویزے کی کاپی آگئی' اس نے گھر والوں کو اس بارے میں آگاہ کیا تو وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پائے۔ نجانے وہ خوشی کے آنسو تھے' یا اس سے عارضی طور پر بچھڑنے کے؟ اس خبر سے ہر شخص کی آنکھ بھر آئی۔ بہنیں' بھائی سے لپٹ کر رونے لگیں۔ پھر ماں اور باپ کی باری آئی پھر یہ آنسو اس وقت خشک ہوگئے جب آنے والا خوش حالی کا تصور ان کی آنکھوں میں اتر آیا۔ ماں نے تصور میں دیکھا' بیٹا دبئی پہنچ کر بہت سے روپے بھیج رہا ہے۔ ان روپوں سے گھر کی حالت بدل گئی ہے۔ کچے در و دیوار پختہ کمروں میں بدل گئے ہیں۔ ٹی وی' فریج' واشنگ مشین اور ایسی بہت سی چیزیں آگئی ہیں۔ جس سے خوش حالی ظاہر ہوتی ہے۔ بیٹیوں کے شکستہ وجود پر بیش قیمت لباس زیب تن ہونے لگے ہیں۔ وہ رشتے دار جو کل تک انہیں دیکھنا گوارہ نہیں کرتے تھے' انہیں جھک جھک کر سلام کررہے ہیں۔ سب بیٹیوں کے خوشحال گھرانوں میں رشتے طے ہوگئے ہیں۔ سب بیٹیاں وداع ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی ہیں۔ اب وہ گھر میں اکیلی ہے۔ اسے تنہائی ڈسنے لگی ہے۔ وہ سوچتی ہے۔ اس بار بیٹا چھٹیوں پر گھر آئے گا تو وہ اس کے لیے ایک چاند سی دلہن ڈھونڈ لائے گی۔ تصور ٹوٹا تو وہ سپنوں سے حقیقت کی دنیا میں تھی۔ خوش فہم سوچوں میں الجھ کر بیٹے کی وقتی پریشانی کو بھول گئی تھی۔ ویزہ آگیا تھا مگر ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے۔ ماں کا بہت تھوڑا سا زیور رکھا ہوا تھا' اسے بیچ کر ٹکٹ کے روپوں کا بندوبست کرلیا گیا۔

دبئی میں آکر اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ یہ وہ دبئی نہیں ہے جس کے وہ اپنے ملک میں خواب دیکھا کرتا تھا۔ کام مشکل تھا' بے حد سخت' مگر کرنا تھا' وہ کرنے لگا۔ وہ جان گیا کہ اب جو کچھ ہے' یہی ہے' جو کچھ کرنا ہے' یہیں کرنا ہے' اس نے دن رات کا سکون خود پر حرام کرلیا۔ ڈیوٹی کے بعد جس قدر ممکن ہوتا' وہ اوور ٹائم لگانے کی کوشش کرتا۔ پہلے مہینے میں اس نے گھر میں پندرہ ہزار کی رقم روانہ کی۔ دوسرے مہینے سترہ ہزار۔ بعد میں اس نے جس قدر ہوتا رہا وہ زیادہ سے زیادہ رقم بچا کر گھر روانہ کرتا رہا۔ ہر پندرہ دنوں بعد وہ گھر کال کرکے خیر خیریت بھی دریافت کرلیا کرتا تھا۔ چند ماہ بعد ہی اس کی محنت رنگ لے آئی۔ وہ گھر جتنی رقم بھیجتا' گھر والے اس رقم سے ضروری اخراجات کی مختصر سی رقم نکالتے اور باقی رقم جمع کرتے جاتے۔ ایک سال بعد اسے گھر والوں نے آگاہ کیا کہ اس کی بھیجی گئی تمام رقوم میں سے اپنے اخراجات کی مختصر سی رقم نکالنے کے بعد انہوں نے خاصی تمام رقم محفوظ کرلی ہے۔ یہ جان کر اسے حیرت انگیز خوشی کا جھٹکا لگا۔ وہ سمجھتا رہا تھا کہ اس کی ہر ماہ بھیجی گئی تمام رقم گھر والے ساری کی ساری استعمال میں لاتے رہے ہوں گے مگر...... اس نے ماں باپ سے کہہ دیا کہ رقم محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس رقم سے گھر کے در و دیوار پختہ کرائے جائیں۔ ایک سال کی رقم سے گھر کے در و دیوار کی حالت بدل گئی۔ اگلے دو سالوں کی سخت محنت سے تینوں بہنوں کے جہیز کا سامان خریدا گیا۔ اور پھر اس سے اگلے دو سالوں میں اس کی تینوں بہنیں یکے بعد دیگرے پیا گھر سدھار گئیں۔ ان گزرے سالوں میں' وہ ایک دو بار گھر کا چکر بھی لگا آیا تھا۔

تمام بیٹیوں کے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد ماں کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ اگلی بار وہ گھر آیا تو ماں اس کے لاکھ نہیں نہیں کرنے کے باوجود ایک خوب صورت و خوب سیرت لڑکی کا انتخاب کرکے اپنے گھر لے آئی۔ شازیہ اس کی زندگی میں کیا آئی' گویا اسے ہفت اقلیم کی شاہی مل گئی۔ اس کے آنگن میں خوشیوں' مسرتوں اور بہاروں کے بے شمار قافلے اتر آئے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک باشعار' خدمت گزار' نیک اور وفادار بیوی تھی۔ اس نے اسے محبتوں کی ایسی لطافتوں' نزاکتوں سے روشناس کرایا جس سے اس کا وجود پہلے کبھی آشنا نہیں تھا۔

شازیہ کو پاکر اس کے دل میں کسی اور شے کی کوئی حسرت' کوئی تمنا نہ رہی۔ جس دن اس کی چھٹیاں اختتام پذیر ہوئیں' اس دن وہ بے حد دل گرفتہ تھا۔ شازیہ کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ وہ پچھلے چند ہفتوں میں گویا اس کی عادی ہوگئی تھی۔

ایک بار شازیہ نے تنہائی میں اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا تھا۔ "آپ دبئی مت جایئے۔ اوپر والا بہت بڑا رازق ہے۔ جو کچھ ہماری قسمت میں ہوگا وہ یہیں مل جائے گا۔ آپ یہیں محنت کیجیے' اللہ برکت دے گا۔ یہاں جیسی بھی ملے گی' روکھی سوکھی میں کھا کر گزارہ کرلوں گی۔ مگر آپ کے بغیر نہیں رہ پاؤں گی۔" یہ کہتے ہی اس کا گلا بھر آیا۔

وسیم نے نرمی سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ کئی آنسو اس کے لبوں نے جذب کرلیے۔ اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "بس صرف تین سالوں کی بات ہے۔ یہ تین سال جیسے تیسے گزار لو۔ تم سے دور ہونا مجھے بھی گوارہ نہیں ہے۔ مگر کیا کروں' مجبوری ہے۔ ان تین سالوں میں' میں چار پیسے بچانے کی کوشش کروں گا۔ پھر میرا وجود ہوگا' تمہاری محبت ہوگی اور محبت بھرے شب و روز ہوں گے۔" اس نے اس کے اداس لبوں کی خوشبو چرالی۔ دل شکستہ' افسردہ وہ دبئی لوٹ آیا۔ دبئی آنے کے چند ہفتوں بعد اسے اطلاع ملی کہ شازیہ

امید سے ہے۔ پھر چند ماہ بعد خبر آئی۔ شازیہ نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا ہے۔ اس کی خبر ملتے ہی اس نے فوراً شازیہ سے فون پر بات کی۔

"شازیہ! تھینک یو جان! تھینک یو ویری مچ' آئی لو یو۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس خبر سے مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے آج میں مکمل ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے ابھی تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ تمہیں اور اپنے بیٹے کو سینے میں چھپا لوں۔"

"تو آجایئے نا۔" شازیہ کے لفظوں میں جانے کتنے ارمان تھے۔ وسیم نے ایک گہری سانس لی۔

"بس صرف دو سالوں کی بات ہے۔ تھوڑا سا انتظار اور پھر اس کے بعد..... اچھا چھوڑو یہ بتاؤ' میرا بیٹا کیسا ہے۔ کس پر گیا ہے؟" اس کے لہجے میں بچوں کا سا اشتیاق تھا۔ شازیہ بے ساختہ کھل کھلا کر ہنس دی۔

"بالکل ٹھیک ہے' ابھی ایک دن کا تو ہوا ہے' ابھی سے کیسے پتا چل سکتا ہے کہ کس پر گیا ہے۔ چند ہفتے تو گزرنے دیں۔ کچھ نقش نین بن جائیں تو پھر آپ کو بتاؤں گی۔"

بعد میں وقتاً فوقتاً وہ گھر کال کرتا رہا۔ شازیہ اور ماں' باپ سے بات چیت ہوتی رہی۔ کبھی بہنیں میکے آئی ہوئی ہوتیں تو ان سے بھی بات ہو جاتی۔ شازیہ کی محبت میں' محبت بھرے تصورات میں وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ تین سال پورے ہونے کو آگئے۔ شازیہ نے اور اس نے اس تین سالہ جدائی کے عذاب کو کیسے جھیلا تھا۔ یہ صرف وہ دونوں ہی جانتے تھے۔ ہجر کی گھڑیاں اختتام پذیر ہونے کو تھیں وصال کے دن لمحہ لمحہ سرکتے ہوئے قریب آرہے تھے۔

اس نے نہانے اور فریش ہونے کے بعد گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ چند لمحوں تک بیل جاتی رہی' پھر اس کی دھڑکنوں نے کال ریسیو کرلی۔ شازیہ کی کھنکتی ہوئی آواز اس کی روح میں اتر گئی۔

دعا سلام کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا کر رہی تھیں؟"

"آپ کے لاڈلے کا دل بہلا رہی تھی۔"

"آہا! نٹ کھٹ بھی ساتھ ہے۔ ذرا اس شریر کی آواز تو سناؤ۔" شازیہ نے موبائل زوہیب کے کان سے لگایا۔

"چلو بیٹا پاپا سے بات کرو۔" اس کی ساری توجہ کھلونوں پر تھی۔ اس نے بے اعتنائی برتی۔ شازیہ نے دوبارہ موبائل اپنے کان کے قریب کرلیا۔ "نواب صاحب کا موڈ نہیں ہے بات کرنے کا۔ اپنے کھیل میں مگن ہے۔ بعد میں اس کی آواز سناؤں گی۔ اچھا چھوڑیں یہ بتائیں' ریزائن کب تک دے رہے ہیں؟"

"آج ہی ایک ماہ کا ریزائن فارم جمع کرا آیا ہوں۔"

"سچ؟"

"تمہاری قسم۔" وہ مسرت سے گنگ ہو گئی۔

"پھر کب تک گھر آجائیں گے آپ؟"

"اگلے ماہ کی تیس تاریخ تک۔"

"پکا؟"

"بالکل پکا۔" دونوں نے خدا حافظ کہہ کر کال منقطع کردی۔ دونوں ہی آنے والے خوب صورت دنوں کے تصور میں کھونے لگے' ایک دوسرے کی دھڑکنوں میں آجانے میں صرف تیس دن باقی تھے۔

☆.....☆.....☆

حاجی بشیر احمد اس علاقے کی سب سے معزز شخصیت تھے۔ ہر دل عزیز' شفیق' ہنس مکھ اور دکھ سکھ میں دوسروں کے کام آنے والے۔ خدا نے نہیں حسن دولت سے بے طرح نوازا تھا۔ دولت پا کر بھی وہ بالکل سادا اور نیک دل انسان تھے۔ تکبر ان میں نام کو نہیں تھا۔ با اخلاق ایسے تھے کہ خود سے کئی درجہ نچلے طبقے کے لوگوں سے آپ آگے بڑھ کر سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔ سخی ایسے تھے کہ ایک زمانہ ان کی سخاوت کے گن گاتا تھا۔ اگر دشمن بھی ان کی چوکھٹ تک چلا آیا تو کبھی خالی نہ گیا۔ ان کا بہت وسیع و عریض الیکٹرونکس کا کاروبار تھا۔ کاروبار کی کئی شاخیں نہ صرف پاکستان کے ہر بڑے شہر میں پھیلی ہوئی تھیں بلکہ بیرون ملک بھی ان کا کاروبار جما ہوا تھا۔ یہ تمام جما جمایا کاروبار انہیں ورثے میں نہیں ملا تھا' اتنی وسیع و عریض جائیداد اور کاروبار میں سے انہیں بمشکل پانچ فیصد تک کا حصہ انہیں اپنے والد صاحب کی طرف سے ملا تھا۔

انہوں نے اپنی محنت اور دیانت داری سے اتنے وسیع کاروبار تک پھیلا دیا تھا۔ ان کے والد نہایت نیک اور دوسرے وکلا سے ہٹ کر ایک دیانت دار وکیل تھے۔ جو کیس بھی لڑا' حق و صداقت کی خاطر لڑا۔ ہمیشہ سچائی اور صداقت کا ساتھ دیا۔ اپنی پوری زندگی میں ایک کیس بھی ایسا نہیں تھا' جو انہوں نے حق کے خلاف لڑا ہو۔ وہ بہت نام ور اور چوٹی کے وکیل تھے۔ وہ اگر چاہتے' جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر با آسانی عدالت میں ثابت کرسکتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا کبھی نہیں کیا۔ حالانکہ انہیں' اس سلسلے میں بہت سے کیسز بھی ملے' جنہیں وہ قبول کر لیتے تو راتوں رات امیر ہو سکتے تھے۔ مگر انہیں دولت سے زیادہ اپنی دیانت داری' اپنا ایمان عزیز تھا۔ جنہیں وہ کسی قیمت پر بھی فروخت کرنا نہیں چاہتے تھے۔

انہی دنوں شہر کی ایک معروف ترین شخصیت کا بیٹا' قتل کے الزام میں اندر ہو گیا۔ تمام شواہد اس کے خلاف تھے' مگر وہ بے گناہ تھا۔ کاروباری دشمنی کی بھینٹ چڑھا تھا۔ ایک کامیاب سازش کے تحت اسے پھنسایا گیا تھا۔ معروف شخصیت عباس ملک نے ملک کے تمام نام ور وکلا سے رابطہ کیا۔ ہر وکیل کیس ہسٹری سننے کے بعد کہہ دیتا کہ یہ کیس اس کے بس کا نہیں ہے۔ اس کیس میں کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہاں عباس ملک کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ہر وکیل بھاگ کر یہ کیس لے لیتا۔ جس کی اسے منہ مانگی قیمت مل رہی تھی۔ کیس میں کامیابی کی اسے کوئی پرواہ نہ ہوتی..... مگر یہ کسی عام فرد کا کیس نہیں تھا' عباس ملک کا تھا' جس سے غلط بیانی کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ کسی کے کہنے پر اپنا یہ کیس لے کر منیر احمد کے پاس پہنچے اور ساری کیس ہسٹری بتانے کے بعد بے ساختہ رونے لگے۔ ہر طرف کی مایوس کن صورت حال نے انہیں شکستہ دل کردیا تھا۔ انہیں اپنا ایک اکیلا بیٹا' موت کے منہ میں صاف جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ منیر احمد کے دل نے گواہی دی کہ سامنے والے کے لفظوں میں صداقت ہے۔ انہوں نے کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ کیس ان کے لیے ایک چیلنج تھا۔ جسے انہوں نے کھلے دل سے قبول کرلیا اور اس میں کامیابی کے لیے دن رات ایک کردیے۔ ان کی شب و روز کی محنت رنگ لے آئی اور انہوں نے عباس ملک کے بیٹے کو باعزت طور پر عدالت سے بری کرانے میں کامیابی حاصل کرلی۔ عباس ملک ان سے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے ایک کروڑ کی بڑی رقم انہیں انعام کے طور پر دی بلکہ انہیں کاروباری معاملات کے لیے اپنا وکیل بھی مقرر کرلیا۔ جب تک عباس ملک زندہ رہے' وہ قانونی طور پر ان کے کاروباری معاملات دیکھتے رہے' جب وہ چل بسے تو منیر احمد ان معاملات سے الگ ہو گئے۔ نیو جنریشن کی اپنی سوچ' اپنے نظریات ہوتے ہیں۔ منیر احمد نیو جنریشن کے ان نظریات کے حامی نہ تھے۔

سو انہیں ان معاملات سے الگ ہونا پڑا۔

منیر احمد نے شادی کی، گھر بار بسایا، مگر خدا نے انہیں اولاد کی صرف ایک نعمت عطا کی۔ بشیر احمد کی صورت میں انہوں نے بشیر احمد کو دونوں طرح کی تعلیم سے آراستہ کیا۔ دینی بھی اور دنیاوی بھی۔ انہوں نے انہیں نہ صرف دنیاداری سکھائی، بلکہ دین سے انسانیت سے بھی آگاہ کیا۔ بشیر احمد کو نیک، سلجھا ہوا اور ہر دل عزیز شخصیت بنانے میں خدا کے کرم کے ساتھ ساتھ منیر احمد کی تربیت کا بھی کافی ہاتھ تھا۔ یہ ان کی تربیت کا کمال تھا کہ وہ اتنے بگڑے ہوئے ماحول میں بھی بشیر احمد کو ایک اچھا انسان بنانے میں کامیاب رہے تھے۔

بشیر احمد جوان ہوئے تو انہوں نے ان کی ایک نہایت شریف گھرانے میں شادی کردی۔ اس دوران انہوں نے وکالت کو خیرباد کہہ کر عباس ملک کے دیئے ہوئے ایک کروڑ سے کاروبار کا آغاز کرلیا تھا۔ جنہیں اپنی محنت اور دیانت داری کے بل بوتے پر وہ ترقی دیتے رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان کا کاروبار بے حد مستحکم ہوچکا تھا۔ ابھی بشیر احمد کی شادی کی خوشیاں پھیکی بھی نہیں پڑی تھیں کہ ایک دن منیر احمد اور ان کی بیوی ایک محفل سے گھر لوٹ رہے تھے کہ ان کی گاڑی ایک بدمست ٹرک ڈرائیور کی گاڑی سے ٹکرا گئی۔ دونوں میں سے ایک فرد بھی بشیر احمد کو سہارا دینے کے لیے زندہ نہ رہا۔ بشیر احمد پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر انہوں نے جواں مردی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ وہ باپ کے زندہ ہوتے ہوئے بھی کاروبار میں دلچسپی لیتے رہے تھے۔ مگر ان کے جانے کے بعد انہوں نے اپنی ساری توجہ کاروبار پر مبذول کردی۔

کاروبار کو حد سے زیادہ توجہ ملی تو وہ دن دونی، رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی کمپنی ترقی کرتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کمپنی کی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے، کاروباری تقاضوں کے ہاتھوں مجبور ہوکر کمپنی کی ایک شاخ دبئی اور دوسری سنگاپور کھولنا پڑی۔ اسے ان کی بدقسمتی کہیے یا کچھ اور کہ شادی کے کئی برسوں بعد تک بھی ان کے ہاں خدا کی طرف سے اولاد کی نعمت نہ اتر سکی۔ ان کے دل میں کئی برسوں سے اولاد کی تمنا پنپ رہی تھی۔ جو کہ کسی طرح بھی پوری ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ انہیں اپنی بیوی سے بہت محبت تھی، اس محبت کو مدنظر رکھتے ہوئے، اولاد کی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے جسمانی اور روحانی، ہر طرح سے اپنا اور بیوی کا علاج کرایا۔ مگر اولاد کی نعمت نصیب نہ ہوسکی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اب کسی طرح بھی یہ امید بر نہیں آئے گی تو انہوں نے ایک دن بشیر احمد سے اس سلسلے میں بات کی۔ وہ رات کا وقت تھا۔

”آج میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں؟“

بشیر احمد نے انہیں غور سے دیکھا۔

شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگے تھے کہ وہ ان سے کیا مانگنا چاہتی ہیں۔ کیونکہ وہ ذاتی طور پر سمجھتے تھے کہ انہوں نے انہیں کسی شے کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ ان کی ہر خواہش پوری کی تھی۔

”مجھے نہیں لگتا کہ آپ کی کوئی ایسی خواہش رہ گئی ہو، جسے میں نے پورا نہ کیا ہو اس کے باوجود بھی اگر کوئی ایسی خواہش رہ گئی ہو، کوئی ایسی بات رہ گئی ہو جسے میں پورا نہ کرسکا ہوں تو کہو، میں اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”آپ نے تو بغیر کہے میری ہر خواہش پوری کی ہے، ہر بات مانی ہے، بس صرف یہ آخری بات مان لیں۔ اس کے بعد میں آپ سے اور کوئی بات نہیں منواؤں گی۔“

”ہاں کہیں کیا بات ہے؟“

”آپ.... آپ دوسری شادی کرلیں۔“ زبیدہ بیگم نے اپنے اندر کے کرب کو دباتے ہوئے کڑوی گولی نگل لی۔

”آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں، اس کے باوجود بھی آپ مجھ سے ایسی بات کہہ رہی ہیں؟“ ”میں.... میں آپ کی محبت کے قابل نہیں ہوں اور نہ ہی میری محبت آپ کے قابل ہے۔ میں آپ کو کیا دوں گی؟ میرا دامن تو خالی ہے، آپ تو اپنے دامن کو اولاد کی نعمت سے بھر سکتے ہیں۔ مجھ سے آپ کی یہ ویرانی، یہ خالی پن دیکھا نہیں جاتا۔“

بشیر احمد نے انہیں نرمی سے اپنے قریب کرلیا۔

”دیکھو زبیدہ بیگم! آئندہ کبھی اپنے لبوں پر ایسی بات مت لانا۔ آپ ہی میری پہلی بیوی ہو اور آپ ہی آخری۔ میں آپ کی محبت کو، اپنی محبت کو نہیں بانٹ سکتا۔ اگر میری قسمت میں اولاد کی نعمت ہے تو وہ آپ ہی سے ملے گی۔ ورنہ مجھے کسی اور کے وجود سے یہ نعمت لینا گوارا نہیں۔“ انہوں نے نرمی سے ان کے آنسو پونچھ لیے۔

خدا کو بھی جیسے ان پر ترس آ گیا۔ شاید یہ ان کے صبر کا اجر تھا کہ خدا نے انہیں یکے بعد دیگرے تین بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ بشیر احمد نے انہیں اپنی طرف سے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم دلوائی اور ان کی ہر طرح سے اچھی تربیت کی۔ یہاں تک کہ وہ ان کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ان کی شادی کے فرائض سے بھی سبکدوش ہوگئے۔ اس عرصے میں بیوی داغ مفارقت دے گئیں اور وہ اکیلے ہوکر رہ گئے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کا ہر شے سے جی اچاٹ ہوگیا۔ جتنا بھی وقت ملتا وہ اسے خدا کی عبادت میں صرف کرتے۔ نجانے کیوں انہیں بار بار یہ وہم ہونے لگا تھا کہ اب ان کے جانے کا وقت آ گیا ہے۔

ان کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے وہ ایک بار اور خدا کے گھر کا دیدار کرآئیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ، کب ساتھ چھوڑ دے۔ خدا معلوم پھر مہلت ملے نہ ملے۔ وہ جب بھی حج پر جاتے تھے اپنے خرچ پر کسی غریب مگر مستحق فرد کو بھی اپنے ساتھ ضرور لے جاتے تھے۔ اس بار انہوں نے اپنے ایک دور کے رشتے دار قیوم علی کو اپنے ساتھ لے جانے کا سوچا۔

قیوم علی غریب مگر دین دار انسان تھا۔ وہ صحیح معنوں میں اس بات کا مستحق تھا کہ اسے حج کرایا جائے۔ کسی قسم کے انتظامات سے پہلے قیوم علی سے پوچھنا اور بات کرنا ضروری تھا۔ خدا معلوم، کسی مجبوری کی بناء پر وہ جانے پر تیار ہو بھی یا نہ ہو؟ بشیر احمد اسی سوچ میں غرق اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے موبائل نکالا اور اپنے سب سے بڑے بیٹے کامران احمد کا نمبر ملانے لگے۔ بیل جانے لگی، چند لمحوں بعد کال ریسیو کرلی گئی دعا سلام کے بعد انہوں نے پوچھا۔

”کہاں ہو بیٹا؟“

”ایک کاروباری میٹنگ میں بزی ہوں ابو۔“

”کب تک فارغ ہوجاؤ گے؟“

”قریباً دو گھنٹے تک۔“

”ٹھیک ہے، میٹنگ ختم ہوتے ہی فوراً مجھ سے ملو۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

دو گھنٹے بعد کامران ان کے روبرو تھا۔ انہوں نے بات شروع کی۔ ”میرا ایک دور دراز کا رشتے دار بھائی قیوم علی تھا، جانتے ہو اسے؟“

”جی کچھ حد تک۔“

”اس بار میں انہیں حج پر لے جانا چاہتا ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“

”مگر کسی قسم کے انتظامات سے پہلے ان سے اس

سلسلے میں بات کرنا ضروری ہے۔ کیا تمہارے پاس ان کا کوئی نمبر ہے؟"

"فی الحال تو نہیں ہے' آپ کہیں تو معلوم کیا جاسکتا ہے۔"

"جس قدر جلد ہوسکے' معلوم کر کے مجھے آگاہ کرو۔"

دو چار دن کی کوشش کے باوجود قیوم علی کا کوئی کونٹیکٹ نمبر نہ مل سکا۔ البتہ انہیں وہاں کا ایڈریس ضرور مل گیا جہاں وہ اسلام آباد کے قریب کہیں مقیم تھے۔ بشیر احمد نے سوچا کہ پہلے خط وکتابت سے بات چیت کی جائے پھر کچھ سوچ کر انہوں نے یہ خیال رد کر دیا۔ ویسے بھی وہ ڈاک کے نظام سے غیر مطمئن تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اس نیک کام کی دعوت' خود قیوم علی کے روبرو پہنچ کر انہیں دینی چاہیے۔ اگلے دن انہوں نے کامران کو ہدایت کی۔

"دیکھو بھئی جس قدر جلد سے جلد ہوسکے اسلام آباد کی ایک سیٹ کنفرم کراؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ خود قیوم علی کے روبرو ہو کر انہیں اس نیک کام کی دعوت دینی چاہیے۔ اگر انہیں کوئی مجبوری نہ ہوئی اور انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی تو پھر آگے کے کچھ انتظامات کے بارے میں سوچیں گے۔"

"جی ابو! میں کوشش کرتا ہوں۔" کامران نے کوشش کر کے اگلے ہی روز تین جولائی کو جانے والی ایک فلائٹ میں سیٹ کنفرم کر لی۔

❀ ❀ ❀

وجاہت کے اگلے دو چار دن سوچتے ہوئے بسر ہوئے۔ وہ بہت عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ وہ اپنے ماں' باپ کی واحد اولاد تھا۔ ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اسے بھی اپنے والدین اتنے ہی عزیز تھے۔ جتنا وہ انہیں' یہ کسی طور ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی غرض کی خاطر انہیں چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ وہ بزنس اور جائیداد بھی اس ماہ جبین کے نام نہیں کر سکتا تھا کہ فی الحال سب کچھ اس کے والد کے نام تھا۔ وہ چند ماہ قبل ہی اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے والد کے ساتھ ان کے بزنس میں کچھ سیکھنے کی غرض سے شامل ہوا تھا۔ سو کسی فیصلے پر پہنچنا' کوئی فیصلہ کرنا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ دشوار کیا ہو رہا تھا اس کے پاس کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ جس پر وہ چل سکے' عمل کر سکے۔ دوسری طرف ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اس ماہ جبین کو بھلا دے۔ وہ ایسی تھی ہی نہیں کہ بھلائی جاسکے۔ دل سے نکالی جاسکے۔ وہ اسے بھلا بھی نہیں پا رہا تھا اور اسے کوئی راستہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہی سوچوں' اسی پریشانی نے اسے کسی حد تک سنجیدہ بنا دیا۔ قہقہے کہیں گم ہو گئے۔ لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ کہیں چھپ گئی۔

جب یہ پریشانی حد سے بڑھ گئی تو اس نے اس سلسلے میں اپنے واحد اور گہرے دوست عابد سے بات کی۔ عابد نے اس کی بات سنی' چند لمحوں تک اس سے ہنسی مذاق کرتا رہا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"اب تو صرف ایک ہی راستہ ہے' تو اپنے والدین سے بات کر' وہ تیری ماہ جبین کے والدین سے بات کریں گے۔ شاید اس بات چیت سے کوئی تیسرا راستہ نکل آئے۔ شاید اس کے والدین اتنی کڑی شرائط نہ رکھیں' جتنی اس نے رکھی ہیں۔" وجاہت کی پیشانی پر متفکر لکیریں برقرار رہیں۔

"اگر اس کے والدین نے بھی یہی شرائط رکھیں اس بات چیت سے کوئی تیسرا راستہ نہ نکلا تو پھر؟"

"یار تو بات کر کے تو دیکھ' قبل از وقت کیوں خود کو الجھا رہا ہے۔" وجاہت نے ایک گہری سانس لی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کچھ کرتا ہوں میں۔ بلکہ وہی کرتا ہوں جو تم نے کہا ہے۔ خدا معلوم کوئی راستہ نکل ہی آئے۔"

❀ ❀ ❀
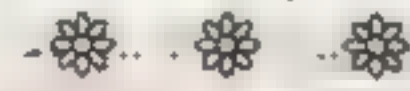
ثاقب وحید کا پاکستان کی ایک غیر معروف مگر طاقت ور جماعت سے تعلق تھا' بڑے صاحب کے بعد پوری جماعت اس کے انڈر میں تھی۔ اس کی جماعت کے تمام فرد جرات مند اور دلیر تھے۔ ضرورت پڑنے پر وہ ہر ایسا کام کر گزرتے تھے جسے دوسری کوئی جماعت کرنے کا سوچتے ہوئے بھی گھبراتی تھی۔ اس جماعت کا تعلق سیاست سے نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر ہر بار کسی بھی پارٹی کا اقتدار میں آنا ان کی مدد کے بغیر ناممکن ہوتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی کے چینل پر چینل تبدیل کر رہا تھا' مگر اسے کوئی چینل پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔ اچانک اس کے موبائل کا بزر بج اٹھا۔ اس نے موبائل نکالا' اسکرین پر نگاہ کی' سامنے "بڑے صاحب" کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔ "گڈ ایوننگ سر! حکم کیجیے' کیسے یاد کیا؟"

"ایوننگ اس بار پھر ایک پارٹی کی طرف سے چند ٹارگٹ ملے ہیں۔ انہیں پورا کرنا ہے۔" وہ غور سے سننے لگا۔ "کل لوگوں کا ایک مذہبی تہوار آ رہا ہے۔ اس مذہبی تہوار پر وہ اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق جلوس نکالنے والے ہیں۔ خودکش حملے کے ذریعے' جلوس کے جتنے لوگوں کو بھی ہو سکے' لقمہ اجل بنانا ہے۔ کیا فوری دھماکے کی تیاریاں مکمل ہیں؟ اگر مکمل نہیں ہیں تو انہیں فوراً مکمل کرو۔"

"ہم ہمیشہ تمام انتظامات کے ہمراہ تیار رہتے ہیں۔ خودکش حملہ آور اور دھماکے کا تمام مواد تیار ہے۔ آپ صرف اتنا بتا دیجیے کہ خودکش حملہ کتنے بڑے پیمانے پر ہونا چاہیے اور کس شہر میں؟ باقی آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔"

"اس بار صرف دو شہروں کا ٹارگٹ ملا ہے۔ کراچی اور لاہور حملے میں کم از کم پچاس اموات کا ہونا لازمی ہے' ایک شہر میں' زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔"

"آپ نے کہا ہے کہ حملہ خودکش طریقے سے ہونا چاہیے۔ اس بار لگتا ہے کہ سیکورٹی بہت سخت ہوگی۔ اگر خودکش حملہ کامیاب نہ ہوسکا تو ؟"

"سخت سیکورٹی کو نرم کرنا تمہارا کام ہے۔ اگر پھر بھی خودکش حملے میں دشواری ہو' حملہ کامیاب نہ ہو سکے تو کسی اور طریقے سے اپنا ہدف مکمل کرنے کی کوشش کرو۔ بس ایک چیز کا خیال رہے' ایک شہر میں کم از کم پچاس اموات کا ہونا لازمی ہے۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں۔ بالکل ایسا ہی ہوگا سر۔ اور کوئی حکم؟"

"ہمارا کوئی بھی فرد کسی بھی صورت زیر حراست نہیں آنا چاہیے۔ ضرورت پڑے تو خریدے گئے دوسرے افراد کو سامنے کر دیا جائے۔"

کال منقطع ہو گئی۔ کال منقطع ہوتے ہی ثاقب وحید نے ایک اور نمبر پنچ کیا۔ رابطہ ہوتے ہی مخصوص ہدایات دہرانے لگا۔ اچانک اس کی پیشانی پر پُر تفکر شکنیں ابھر آئیں۔

"ہوں۔ تو یہ دشوار ہے؟ او کے تو پھر پلان نمبر ٹو پر عمل کرو۔ فوراً ہی جلوس کے قریب کی کسی عمارت کا بندوبست کرو جہاں سے آسانی سے اپنا ہدف مکمل کیا جاسکے' جس قدر "ساز و سامان" کی ضرورت ہو' ساتھ لے لو۔ تمام کام مکمل ہوتے ہی اطلاع کرو۔" دوسری طرف "یس سر" کہہ کر کال منقطع کر دی گئی۔

❀ ❀ ❀

وسیم کا ریزائن پریڈ ہونے میں ابھی دس دن باقی تھے۔ آج اس کا ارادہ' کسی ٹریول ایجنسی میں جا کر' اپنے لیے تین جولائی کی ایک سیٹ بک کرانے کا تھا۔ آج اس نے چھٹی کی تھی۔ سب کے جانے کے بعد وہ دیر تک پڑا نیند سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

بیدار ہونے کے بعد وہ نہا کر فریش ہو کر ایک ٹریول ایجنسی کی طرف چل دیا۔ ٹریول ایجنسی میں پہنچ کر اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ آپریٹر چند لمحوں تک کی بورڈ پر انگلیاں چلا کر کچھ چیک کرتا رہا۔ پھر معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"سوری سر! تین جولائی کی کسی بھی ایئر لائین کی کوئی فلائیٹ ڈائریکٹ اسلام آباد کے لیے نہیں ہے۔ البتہ ایک جہاز ہے جو عارضی طور پر کراچی کے ایئر پورٹ پر رکے گا۔ چند منٹوں کے لیے۔ اگر آپ کہیں تو؟" وسیم کی پیشانی پر چند شکنیں ابھر کر غائب ہو گئیں۔

"او کے اس جہاز میں میری ایک سیٹ کنفرم کر دیجیے۔"

"جی بہتر۔" آپریٹر ایک بار پھر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مخصوص کارروائی کے بعد اس نے وسیم سے رقم لی اور اسے ٹکٹ تھما دیا۔ وہ ٹکٹ لے کر ٹریول ایجنسی سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اسے ایک عجیب سی تسکین کا احساس ہوا۔ ہر کام مکمل ہو گیا تھا۔ اب صرف ریزائن کے مکمل ہونے کا انتظار تھا۔ ریزائن مکمل ہوتے ہی وہ اپنی محبت، اپنی جان محبت کے پاس ہوتا۔ جس سے اب ایک پل کے لیے بھی دور رہنا قیامت سے کم نہ تھا۔

❀ ❀ ❀
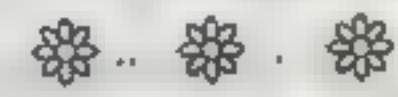
ہزاروں کا مجمع دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی تھی۔ لوگوں کی تعداد عارضی طور پر کم ہوئی، بہت سے لوگ نماز کے بعد دوبارہ مجمع میں لوٹ آئے۔ لوگ پورے اخلاص کے ساتھ جلوس میں شریک تھے۔ عصر کا وقت آ پہنچا۔ مجمع نڈھال ہو چکا تھا۔ اچانک ہی قریبی عمارت سے یکایک تڑاتڑ فائرنگ کی آواز آئی۔ فائرنگ جلوس کے شرکا پر کی جا رہی تھی۔ اچانک مجمعے میں عارضی طور پر بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ ایک پل کو اس ناگہانی آفت سے وحشت زدہ ہو کر گھبرا گئے۔ ابھی لوگ پہلے فائرنگ سے نہیں سنبھلے تھے کہ اچانک ان پر دوسرا برسٹ چلایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پچاس ساٹھ افراد کے وجود سے لہو فواروں کی طرح نکلا۔ وہ سب کٹی ہوئی شاخوں کی طرح لہرا کر، تڑپ کر زمین پر آ رہے۔ اچانک جوشِ ایمانی سے مغلوب لوگوں کے چہرے تمتما گئے۔ وہ اپنے زخمی بھائیوں کی مدد کو لپکے۔ یہ سفاکانہ کھیل پہلی بار نہیں کھیلا گیا تھا۔ ماضی میں بھی بارہا وہ ایسے لوگوں کا شکار بنتے رہے تھے۔ فائرنگ کے پہلے حصے میں ہی سب کے سب تماش بین رفوچکر ہو گئے۔ اب وہاں صرف جلوس کے شرکاء باقی تھے۔ فوراً ہی ایمبولینس وہاں آ پہنچیں۔ پولیس پہلے سے موجود تھی۔ ٹی وی پر خبریں نشر ہونے لگیں۔

پولیس نے خاموش عمارت کی طرف برسٹ مارے اور فوراً ہی پوری عمارت کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ کراچی کی معروف شاہراہ جا بجا خون سے تر ہونے لگی۔ خون اگلتے کئی جسموں سے ارواح نکل کر عالم بالا کی طرف چل دیں۔ کئی لوگ عالم نزع میں تھے۔ اپنے ہی خون میں لت پت کئی زندہ و مردہ وجود ایمبولینس میں لادے جانے لگے۔ گاڑیاں حرکت میں آنے لگیں۔ یہ روح فرسا مناظر دیکھ کر کئی اہل دل لوگوں کی آنکھ نم ہونے لگی۔ انسانیت کے دشمنوں کی ایسی سفاکانہ حرکت پر ان کا دل خون رونے لگا۔ ہر درد مند دل انہیں برا بھلا کہہ رہا تھا اور رخصت ہو جانے والوں کے لیے دعائے خیر کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اس سفاکانہ کھیل کا ابھی آدھا حصہ باقی ہے۔ ابھی اس سے بھی زیادہ دلدوز واقعات دیکھنے کو ملنے والے ہیں۔

❀ ❀ ❀

ثاقب وحید اپنے کمرے میں بیٹھا، پاکستان کے نامور نیوز چینلز پر اس سفاکانہ کھیل میں ہونے والی تباہی کو براہ راست دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔ پہلا پلان نہ سہی دوسرا سہی، وہ اپنے مطلوبہ ہدف کو پورا کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اچانک اس کے موبائل کا بزر بجا، کال ریسیو ہوتے ہی بڑے صاحب کی آواز سنائی دی۔ "گڈ! ویری گڈ۔ میرے سامنے پاکستان کے تمام نیوز چینلز متحرک ہیں۔ ہر چینل پر کراچی کے روح فرسا منظر بار بار دکھائے جا رہے ہیں۔ میڈیا کی معلومات کے مطابق اب تک پچاس کے قریب اموات ہو چکی ہیں۔ مزید کئی لوگوں کی حالت نازک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنا ٹارگٹ مکمل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔"

"یس سر! بالکل۔"

"خودکش بم دھماکہ ہوتا تو مزید اموات متوقع تھیں۔ خیر! خودکش بم دھماکہ نہ سہی ایسے ہی سہی، یہ بھی خوب رہا۔ بلندی سے اپنے ہدف کو نشانہ بنانا کچھ دشوار نہیں ہوتا۔ اچھا یہ بتاؤ، لاہور کے ٹارگٹ میں کتنا وقت ہے؟" "صرف پانچ منٹ سر! وہاں تباہی خودکش بم دھماکوں کے ذریعے وجود میں لائی جا رہی ہے۔ آپ چند لمحوں بعد انہی نیوز چینلز پر کراچی کے واقعات سے بھی زیادہ دلدوز واقعات دیکھ سکیں گے۔ اس بار اموات ہمارے اور آپ کے اندازوں سے زیادہ ہوں گی۔"

"میں ان لمحوں کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔" دوسری طرف بڑے صاحب نے کہہ کر کال منقطع کر دی۔ ان کے لبوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ آ گئی۔ انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ شراب کے پیمانے کی طرف بڑھایا اور دائیں ہاتھ سے سرتاپا برہنہ دودھ سی سفید مغربی دوشیزہ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ خود بھی مکمل طور پر لباس سے بے نیاز تھے۔

❀ ❀ ❀

وجاہت کی بدلی بدلی سی کیفیت اس کے والدین سے بھی پوشیدہ نہیں تھی۔ باپ تو خیر بزنس میں مصروف رہتا تھا مگر ماں نے جلد ہی یہ کیفیت محسوس کر لی۔ انہوں نے پہلے تو سوچا کہ وجاہت سے پوچھیں کہ اس کی بدلی بدلی کیفیت کیوں ہے، پھر نجانے کیوں کچھ سوچ کر انہوں نے اپنے شوہر سے یہ بات کہہ دی۔ میاں صاحب بھی کئی دن سے وجاہت کی حالت نوٹ کر رہے تھے۔ بیوی نے بھی جب ان کی توجہ اس طرف دلائی تو انہوں نے ایک دن وجاہت سے اس بارے میں پوچھ لیا۔ "پچھلے کئی دنوں سے، میں نوٹ کر رہا ہوں کہ تم کچھ فکر مند سے رہنے لگے ہو۔ تمہیں کوئی پریشانی لاحق ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو اپنا دوست سمجھ کر مجھ سے اس پریشانی کو شیئر کرو۔ میں اپنے بیٹے کی ہر پرابلم دور کرنے کی کوشش کروں گا۔"

باپ کے لفظوں کی نرماہٹ نے اس کا دل دھڑکا دیا۔ وہ خود بھی کئی روز سے سوچ رہا تھا کہ باپ سے اس سلسلے میں بات کرے مگر . آج باپ نے اسے خود ہی موقع دیا تو اس نے ہمت کر کے باپ سے اپنے من کی بات کہہ دی۔

"پاپا! میں خود کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے اس سلسلے میں بات کروں، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کا آغاز کس طرح کروں......؟"

"بیٹا جو بات ہے پوری سچائی سے کہہ دو، گھبرانے یا ہچکچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ ہوں۔"

"وہ دراصل میں ... شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

میاں جی کے چہرے پر ایک پل کو حیرانی کے

آثار پیدا ہوئے جیسے انہیں اس سے اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ اس سے کسی بہت بڑی پریشانی کی توقع کر رہے تھے مگر یہ پریشانی تو کہاں...... مسرت کی بات تھی۔ انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے من کی خوشی کو دبایا۔ ''شادی کی بات کر رہے ہو تو یقیناً لڑکی بھی پسند کی ہوگی؟''

''جی پاپا! وہ تعلیم یافتہ ہے' خوب صورت ہے' اچھے خاندان سے تعلق ہے؟''

''تو پھر پرابلم کیا ہے؟''

''جی پاپا' وہ ان کا طبقہ۔'' نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ پوری بات نہ کر سکا۔ میاں جی نے ایک اور گہری سانس لی۔ جیسے وہ وجاہت کے ادھورے جملے سے ہی بات کی گہرائی تک پہنچ گئے ہوں۔

''کسی نچلے طبقے سے تعلق ہے اس کا؟''

''جج... جی۔'' انہوں نے نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''بس اتنی سی بات کے لیے خود کو پریشان کر رکھا تھا؟ تم جیسا کہو گے ویسا ہی ہوگا۔ کسی کا نچلے طبقے سے ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔ تمہاری پسند ہماری پسند ہوگی۔ بتاؤ' کون ہے وہ؟''

''پاپا! آپ جیسا سمجھ رہے ہیں بات ایسی نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کا تعلق ہم سے بھی بالائی طبقے سے ہے۔ آپ نے میری پوری بات سنی ہی نہیں اور ادھوری بات اچک لی۔''

میاں جی کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

''کون ہے وہ؟''

''وہ شیخ امین کی بیٹی ہے۔ شاید آپ شیخ امین کو جانتے ہوں؟''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہم سے کئی گنا زیادہ حیثیت کے لوگ ہیں۔'' وجاہت نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ جیسے اصل بات یہی ہو۔ جسے وہ کہنے سے ڈر رہا تھا۔

''تم لڑکی سے ملے ہو؟''

''جی پاپا۔''

''کوئی بات چیت بھی ہوئی ہے اس سے؟''

''جی پاپا!'' وجاہت نے حنا سے ہونے والی بات ان سے کہہ دی۔ میاں جی کی پیشانی پر ابھری لکیروں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''وجاہت ہمارا اور ان کا کوئی میل نہیں ہے' بہتر یہی ہے کہ تم اسے بھول جاؤ۔''

''میں اپنی سی کوشش کر چکا ہوں اسے بھلانا میرے بس میں نہیں ہے۔'' ''تو پھر ہمیں بھلا دو۔'' اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

''یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''تو تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنی تمام جائیداد اتنی محنت سے عروج تک لے جانے والا بزنس' بینک بیلنس سب کچھ اس لڑکی کے نام کر دوں؟''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟'' وہ ہلکی سی کوفت میں مبتلا ہو گئے۔

''میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار شیخ صاحب سے اس سلسلے میں مل لیں۔ شاید وہ یہ رشتہ قبول کر لیں۔ شاید وہ اتنی کڑی شرائط نہ رکھیں' جتنی حنا نے رکھی ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے اگر تمہاری اسی بات میں خوشی ہے تو میں ان سے مل لیتا ہوں۔ آگے تمہاری قسمت۔ تم حنا سے کسی دن کا وقت لو' ہم اس دن ان کے ہاں جائیں گے۔''

وجاہت کے پاس حنا کا موبائل نمبر موجود تھا' باپ کے جاتے ہی اس نے اس کا نمبر پنچ کیا۔ دوسری

طرف سے کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ ''ہیلو... ہیلو! اوہ' یہ تم ہو' میں تو سمجھی تھی کہ بخار عشق ان دو چار دنوں میں اتر گیا ہوگا۔ مگر لگتا ہے کہ ابھی کچھ حرارت باقی ہے۔ اسی لیے تو میرا خیال آ گیا۔''

''تمہارا خیال تو ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے۔'' مسکراہٹوں کا رس نچوڑتی ہوئی کھنک' ایک بار پھر سماعت میں اتری۔ ''اپنے دعوے میں کہاں تک ثابت قدم ثابت ہو رہے ہو؟''

''میں نے اسی سلسلے میں تم سے رابطہ کیا ہے۔''

''زہے نصیب' جی آیا نوں' کہو!''

''میں نے اپنے گھر والوں سے بات کر لی ہے۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری ممی' ڈیڈی سے ملنا' ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم کسی نہ کسی فیصلے پر پہنچ ہی گئے ہو۔ تو پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

''تمہاری دونوں شرائط ہی بہت کڑی ہیں۔ مما' پاپا کا خیال ہے کہ وہ اگر تمہارے گھر والوں سے مل لیں تو شاید ان شرائط میں کچھ لچک' کچھ نرمی لائی جا سکے' بس تم ہمیں اپنے یہاں آنے کا صرف ایک موقع دو۔''

''تم اپنی فیملی کے ہمراہ بڑے شوق سے ہمارے گھر اسی سنڈے کو آ سکتے ہو' مگر تمہاری یہ کوشش فضول ہی ہوگی۔ کیونکہ جو میرا فیصلہ ہے وہی میری مما' پاپا کا فیصلہ ہے۔''

''تم ایک موقع تو دو۔''

''اوکے' میں نے کہا نا کہ تم اسی سنڈے کو ہمارے گھر آ سکتے ہو۔''

''تھینک یو' تھینک یو ویری مچ۔''

''تمہارا انتظار رہے گا۔''

اسی سنڈے کو میاں جی شیخ صاحب کی پرشکوہ کوٹھی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رسمی باتوں اور خاطر مدارات کے بعد وہی موضوع چھڑ گیا' جس کے لیے وہ یہاں جمع ہوئے تھے۔ شیخ صاحب نے کہا۔

''میاں صاحب! ہماری ایک ہی بیٹی ہے' میں نے اس کی کبھی کوئی بات نہیں ٹالی' اس کی ہر آرزو پوری کی ہے یہاں تک کہ ہم نے اسے اپنا جیون ساتھی چننے کی بھی مکمل آزادی دے رکھی ہے۔ مجھے حنا نے ہر بات سے آگاہ کر دیا ہے۔ ہم آپ کی بات مان سکتے ہیں' یہ رشتہ طے ہو سکتا ہے' مگر شرائط وہی دونوں رہیں گی۔ جن سے آپ واقف ہیں۔ دونوں شرائط میں سے جو چاہیں آپ ایک مان سکتے ہیں۔ مگر ان میں نرمی اور لچک کا سوال ہی ممکن نہیں۔ فیصلہ خود آپ کے ہاتھ میں ہے جو چاہیں کریں۔''

''تو یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟'' ''بالکل آخری۔''

میاں جی نے وجاہت کی طرف دیکھا۔ ''بیٹا! ہمارا جو کچھ بھی ہے وہ تمہارا ہے تم کہو تو ہم سب کچھ حنا کے نام کرنے کو تیار ہیں۔ کیونکہ ہمیں بھی تمہاری خوشی سے زیادہ اور کوئی شے عزیز نہیں ہے۔ یا تم چاہو تو ہمیشہ کے لیے یہاں رہ جاؤ۔ تمہارے یہاں یا وہاں رہنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم سے ملاقات تو ہوتی ہی رہے گی۔'' وجاہت میاں جی کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ کی دن رات کی محنت سے بنایا ہوا سب کچھ کسی اور کے پاس چلا جائے یہ مجھے کسی طور گوارا نہیں اور آپ سے دور رہنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہم اس لیے یہاں آئے تھے کہ حنا کی بتائی ہوئی شرائط میں شاید کوئی نرمی' کوئی لچک لائی جا سکے۔ کوئی اور راستہ نکالا جا سکے' جو ان کے اور ہمارے دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔ اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ یہاں آ کر بھی دوسرا کوئی راستہ نہیں نکلے گا تو میں آپ کو کبھی یہاں نہیں لاتا۔ چلیے ممی آپ بھی اٹھیے۔''

زرینہ بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میاں جی نے ایک بار پھر وجاہت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو وجاہت اب بھی وقت ہے جو فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے۔"

"خدا نے چاہا تو ایسا نہیں ہوگا آپ چلئے۔" میاں جی جہاں سے اٹھے تھے' وہیں بیٹھ گئے۔ وجاہت اور بیوی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے چند کاغذات نکال کر امین صاحب کی طرف بڑھا دیئے۔ "یہ میرے تمام بزنس اور بینک بیلنس کے کاغذات ہیں جو کہ پچیس کروڑ کے لگ بھگ ہیں خدا گواہ ہے' میں نے جو کچھ بھی بنایا' جو کچھ بھی حاصل کیا' وہ اپنی محنت اور خدا کے فضل سے حاصل کیا ہے اور میرا جو کچھ بھی ہے' میرے بیٹے کا ہے۔ میرے لیے اس کی خوشی سے بڑھ کر اور کوئی شے عزیز نہیں۔ میں نے ان تمام کاغذات پر دستخط کر کے اپنا سب کچھ حنا بیٹی کے نام کر دیا ہے' اب صرف حنا بیٹی کے دستخط ضروری ہیں۔ یہ ہوتے ہی میرا سب کچھ اس کا ہو جائے گا۔"

"پاپا! مجھے یہ سب منظور نہیں" وجاہت نے کچھ کہنے کی کوشش کی ہی تھی کہ میاں جی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"چپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ میرا حکم ہے۔" وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ شیخ صاحب نے بغور کاغذات دیکھے اور پھر حنا کی طرف بڑھا دیئے۔ حنا نے بھی کاغذات دیکھے' سب کچھ پیپروں پر درج تھا۔ اچانک باپ بیٹی کی نگاہیں ملیں' اور ان کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے تمام کاغذات میاں جی کو واپس کر دیئے۔ "اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ان کے بغیر ہی آپ کی بات منظور ہے۔ آپ جب چاہیں بارات لے کر آ سکتے ہیں۔ دراصل یہ سب حنا کی شرارت تھی۔ آپ اسے آزمائش بھی کہہ سکتے ہیں۔ بقول حنا کے اگر وجاہت ان دونوں شرائط میں سے ایک شرط بھی مان لیتا' خاص طور پر یہاں آ کر رہنے کی شرط تو کسی صورت بھی اس رشتے کا طے ہونا ممکن نہیں تھا۔ مگر آپ نے یہاں آ کر جس طرح ہماری شرط پوری کی' آپ کی یہ ادا مجھے اور حنا کو بہت پسند آئی۔ اب آپ کے ان کاغذات کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہمارا ہے' وہ حنا کا ہے اور جو کچھ حنا کا ہے' وہ وجاہت بیٹے کا اور آپ کا ہے۔" وجاہت' میاں صاحب اور زرینہ بیگم سب گم سم بیٹھے رہ گئے۔

اچانک دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ وجاہت چونک کر ماضی سے حال میں آ گیا۔ اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ اسے اس وقت کسی اور کا یوں مخل ہونا پسند نہیں آیا۔ وہ بادل ناخواستہ اٹھا' دروازے تک آیا' کھول کر دیکھا تو سامنے حنا کی سہیلی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خجالت کے آثار تھے۔

"سوری! یہ حنا کا موبائل میرے پاس رہ گیا تھا۔ پلیز اس تک پہنچا دیجیے۔"

وہ دوبارہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ بیڈ پر بیٹھتے ہی اس کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ وہ آفت جاں جو اس کے من میں آ بسی تھی آج اس کے روبرو تھی۔ اس نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اپنا ہاتھ گھونگھٹ کی طرف بڑھا دیا۔ ذرا سا گھونگھٹ سرکتے ہی اچانک اس کی آنکھیں مند گئیں۔ پلکوں کو بند کرنا اس کے لیے ناگزیر ہو گیا۔ جیسے بھری دوپہر میں غلطی سے سورج کی طرف نظر چلی گئی ہو۔ وہ قیامت آج دوآتشہ ہو کر اس کے روبرو تھی۔ اسے دیکھتے ہی وجاہت کو سچ مچ قیامت پر ایمان لانا پڑ رہا تھا۔ مزید دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر دوسرے ہی پل حسن ہو کہ دوبارہ بھی چھپنی جا چکی ہے۔ اب صرف ایک راستہ ہی تھا۔ محسوس کرنے کا۔

بعض چیزیں دیکھی نہیں جاتیں' محسوس کی جاتی ہیں۔ بعض باتیں کہی نہیں جاتیں محسوس کرائی جاتی ہیں۔ وجاہت نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ جیسے دوپہر کا سورج' اچانک رات کی تاریکیوں میں کہیں جا چھپا ہو۔ سورج رات کی تاریکیوں میں چھپ جائے تو چاند طلوع ہو جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے نکلتا ہے چڑھتا ہے اور عین فلک کے سینے پر آ کر ہر شے کو اپنی چاندنی سے منور کر دیتا ہے۔ اس کمرے میں بھی ایک چاند تھا' جو کہ طلوع ہونے کو تھا۔ جس کی کرنیں' کسی کے وجود کو تسخیر کرنے کو بے تاب تھیں۔ وجاہت نے ہاتھ بڑھا کر چاند کو اپنے ہاتھوں کے پیالوں میں بھر لیا۔ وہ چاند سا چہرہ' ہاتھوں کے پیالوں میں نہ آ سکا۔ گلاب کی سیکڑوں پتیاں ان پیالوں میں سمٹ آئیں۔ جو احساس دلا رہی تھیں کہ ابھی پورا گلستان ان ہاتھوں کی دسترس میں آنے والا ہے۔ وہ خوب صورت پنکھڑیاں' لبوں کے بے حد قریب سمٹ آئیں۔ ان پنکھڑیوں کی خوشبو اسے مدہوش کرنے لگی۔ ایک لطیف سا احساس اس کے وجود میں سرایت کرتا چلا گیا۔

❀ . . ❀ . . ❀

لاہور کا جلوس بھی اسی عقیدت ذوق وشوق سے جاری تھا۔ جیسے کراچی کا جلوس۔ چند لمحے پہلے تک جلوس کے ہر فرد تک کراچی کے تکلیف دہ سانحے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ اس خبر کو سن کر نہ تو کوئی فرد جلوس سے رخصت ہوا تھا اور نہ ہی کسی کے چہرے پر خوف کی کوئی لہر نظر آئی تھی۔ جیسے انہیں معلوم ہو کہ موت ان کی طرف نہیں بڑھے گی اور اگر بڑھے گی بھی تو . مگر اس خبر نے ہر دل والی کی آنکھ نم کر دی تھی۔ ابھی ان کی یہ عبادت اختتام کو نہیں پہنچی تھی کہ اچانک ایک قیامت جیسا خوفناک دھماکہ ہوا۔ اٹھے ہوئے ہاتھ' بازو نیچے نہ آ سکے۔ اپنے وجود سے الگ ہو کر سیکڑوں ٹکڑوں میں منقسم ہو گئے۔ یہ حال صرف اٹھے ہوئے ہاتھ اور بازوؤں کا ہی نہیں ہوا تھا بلکہ سینکڑوں لوگ اس سانحے کی زد میں آ کر اپنے اعضا کا وجود کھو بیٹھے تھے۔ قریب کی مضبوط دیواریں' ایک ہی جھٹکے میں زمیں بوس ہو کر رہ گئیں۔ زمین کا ایک ذرہ بھی ایسا نہ بچا' جو لہو کی سرخی سے سرخ نہ ہو چکا ہو۔ ابھی اس دھماکے کی گرد تھمی بھی نہیں تھی کہ ایک اور قیامت خیز دھماکہ ہوا۔ ابھی اس دھماکے کی گونج مدھم نہیں پڑی تھی کہ کچھ فاصلے پر اسی نوعیت کا ایک اور دھماکہ ہوا۔ سیکڑوں' ہزاروں لوگ لمحوں میں لقمہ اجل بن گئے۔ ایمبولینس' پولیس اور رینجرز کی گاڑیاں فوراً آ پہنچیں۔ مگر یہاں حالت کراچی سے یکسر مختلف تھی۔ یہاں زخمی نہیں تھے۔ صرف لاشیں تھیں۔ لاشوں کے ورثاء' حساس دل لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اس ظلم پر احتجاج کر رہے تھے۔ میڈیا کی ٹیم اس احتجاج کو ان قیامت ناک مناظر کو عوام تک پہنچا رہی تھی۔ اس بار سچ مچ قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ جاں بحق ہونے والوں میں کوئی وجود بھی ایسا نہیں تھا جو سلامت رہ گیا ہو۔ وہاں کئی جسم بریدہ' کٹے ہوئے سر نظر آ رہے تھے۔ جن کے چہرے کا اطمینان بتا رہا تھا کہ انہوں نے اپنی منزل کو پا لیا ہے۔ کئی بازو' ہاتھ' پاؤں اور ٹانگیں اردگرد بکھری ہوئی تھیں۔ ان بریدہ اعضاء کو دیکھنے والوں کا دل' سینے سے بہا جا رہا تھا۔ اپنے گھروں میں بیٹھے لاکھوں لوگوں کی نمی آنکھوں سے رخساروں تک کا سفر کر رہی تھی۔ لوگ مل جل کر اپنے غم کو سینوں میں دبا کر بریدہ اعضاء کو بریدہ لاشوں کو اکٹھا کرنے لگے۔ اپنی تاریخ میں اپنی نوعیت کا سب سے زیادہ تباہی مچانے

وار سانحہ رونما ہو چکا تھا۔ ظلم کی انتہا ہو چکی تھی۔ جانے والے جاچکے تھے۔ قیامت گھم چکی تھی مگر اس تاریخ ساز قیامت کی یاد اس قیامت کے نشان' کئی مہینوں تک سینوں میں' ذہنوں میں محفوظ رہنے والے تھے۔ اس قیامت کے' جس نے سیکڑوں گھروں کے ورثاء کو ان کے عزیز واقارب سے چھین لیا تھا۔

❁ ❁ ❁

اگلے دن وہ کالم شائع ہوا تو گویا پورے ملک میں بھونچال سا آگیا۔ اس کالم کی اہمیت سے اے آر مہدی بھی بخوبی واقف تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ صبح اخبار کی تعداد دو گنا زیادہ رکھنا پڑے گی۔ صرف اسی کالم کی بدولت' اخبار ہاتھوں ہاتھ نکلے گا۔ ان کی توقع کے مطابق ایسا ہی ہوا۔ جب تک صدر صاحب یا وزیراعظم صاحب کے حامی اس خبر کو چھپاتے' دباتے' یہ کالم جنگل کی آگ کی طرح ہر جگہ پھیل چکا تھا۔ اور اس بار عوام نے "بے حسی" اور "نظراندازی" کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تمام تر ثبوتوں کے باوجود بھی عوام یہ کیسے گوارہ کرسکتے تھے کہ ان کے حکمران اتنی بے حسی سے ان کی گردن پر چھری پھیرتے رہیں اور وہ چپ رہیں۔ یہ "انصاف پرور" حکمران اب انہیں ایک پل کے لیے بھی گوارا نہیں تھے۔ جن کی حکومت آتے ہی بجلی' پانی' چینی' آٹا اور بے روزگاری اپنے عروج پر پہنچ کر سابقہ ریکارڈ توڑ گئی تھی۔ جنہیں عوام کے بارے میں سوچنے کی ایک پل کو بھی فرصت نہیں۔ جو عوام کے ہی خون سے نچوڑی گئی دولت کے بل بوتے پر "دوروں" کے نام سے عیاشیاں کرتے پھریں۔ انہیں حکومت کرنے کا ذرا بھی حق حاصل نہیں۔ افراتفری میں شٹر ڈاؤن اور پہیہ جام ہڑتال کا اعلان ہوا۔ اور ہر بڑے شہر کی تمام معروف سڑکوں پر لوگوں کے سیکڑوں جلوس نکل آئے۔ آرمی کی بھی شاید حکومت سے ان بن تھی۔ فوج فوراً ہی حرکت میں آگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مارشل لا لگ گیا۔ عارضی امن قائم ہوا تو عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ سابقہ حکومت کے ہاتھوں بہت ستائے ہوئے تھے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کو بام عروج تک پہنچانے میں سابقہ حکومت نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس تبدیلی سے ہر فرد مطمئن تھا۔ جیسے اس بار تاریخ ساز حکومت قائم ہوگی۔ جو ان کی تمام محرومیوں' تمام دکھوں کا ازالہ کردے گی۔ ملک میں ایسی خوش حالی آئے گی' جو صرف خواب میں ہی نظر آتی ہے۔ صحافت کی دنیا میں شاہد اقبال کے اس کالم کو نہ صرف احترام کی نظر سے دیکھا گیا بلکہ اس کی بھرپور تعریف بھی کی گئی۔ یکا یک ہی اس کی شہرت زمین سے آسمان تک پہنچ گئی۔ صف اول کے ہر اخبار کا ایڈیٹر اس کا ہر کالم منہ مانگے داموں خریدنے کو تیار تھا۔ مگر اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کے کالموں کی اصل جگہ صرف وہی ہے جہاں یہ تہلکہ خیز کالم شائع ہوا ہے۔ وہ سچ مچ اے آر مہدی کا شکر گزار تھا جن کی سپورٹ اس کے ساتھ تھی اور جنہوں نے حقیقی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے اس کالم کی اشاعت کا اہتمام کیا تھا۔ یہ خدا کا فضل تھا کہ اس کے کالم کا مثبت نتیجہ نکلا۔ اگر منفی نتیجہ نکلتا تو نہ صرف وہ فوراً جیل میں ہوتا' بلکہ اے آر مہدی بھی اس کے ساتھ ہوتے اور اس سے بڑھ کر اخبار کی اشاعت ہی بند کردی جاتی۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا بے حد شکر گزار تھا کہ جس نے نہ صرف اس کے قلم کو توانائی بخشی تھی بلکہ اس کے صرف ایک کالم کی بدولت' عوام کو کرپٹ حکومت سے بھی نجات دلائی تھی۔ اس کالم کی کامیابی نے اسے متکبر ہونے کی بجائے مزید توجہ سے اپنا کام کرنے پر مجبور کردیا۔ وہ اپنے آئندہ شائع ہونے والے کالموں کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

❁ ❁ ❁

چند دنوں بعد ثاقب وحید کے نمبر پر اسی نمبر سے کال آئی۔ بڑے صاحب نے کسی قسم کی تمہید کے بغیر کہا۔ "پچھلی بار جوا بھور میں ہم نے ایک فرقے کے لوگوں پر کامیاب ترین حملہ کیا تھا' جس کی ذمہ داری بیدرے گھنے پر ایک تنظیم کے بڑے لیڈر نے قبول کی تھی۔ ہمارے اس حملے سے "مہربان دوست" بہت خوش ہوئے ہیں مگر ابھی ان کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ فرقہ پرست لوگوں میں پھوٹ نہیں پڑی۔ اس بار ان کی طرف سے حکم ملا ہے کہ دوسری مذہبی تنظیم کو نشانہ بنایا جائے اور اس بار اموات کی شرح دس' بارہ لوگوں تک ہونی چاہیے۔ ہمارے دوست کو خودکش بم دھماکے زیادہ پسند ہیں۔ ان کی ہدایت ہے کہ ہمیں ان کی طرف سے جتنے بھی ٹارگٹ ملیں' انہیں اسی طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔"

"آپ بے فکر ہوجائیں۔ یہ کام کل ہی ہوجائے گا اور کوئی حکم؟"

"تم صحافی' شاہد اقبال سے واقف ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔ یہ وہی صحافی ہے جس کے صرف ایک کالم نے حکومت کو ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس کردیا ہے۔ بہت ذہین اور لائق صحافی ہے۔"

"چوبیس گھنٹے میں اس کی مکمل ہسٹری معلوم کرکے بتاؤ مجھے۔"

"آپ کے کہنے سے پہلے ہی اس کا مکمل بائیو ڈیٹا معلوم کیا جاچکا ہے۔"

"گڈ ویری گڈ۔ تفصیل بتاؤ۔"

"کوئی لمبی چوڑی کہانی نہیں ہے اس کی۔ ایک اچھے اور شریف خاندان سے تعلق تھا۔ ماں' باپ بچپن میں چل بسے ایک چچا نے پال پوس کر جوان کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد چچا سے مزاج نہ مل

سکا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہو کر کراچی آ رہا۔ صحافت میں ڈبل ایم اے کیا ہے۔ پچھلے پانچ برسوں سے صحافت سے وابستہ ہے اور ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔"

"اس شخص کو ہر حال میں خریدنے کی کوشش کرو۔ جتنی قیمت لگے لگا دو۔ مگر اس شخص کا ہمارا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔"

"سوری سر! آپ کے کہنے سے پہلے ہی ہم اپنی سی کوشش کر چکے ہیں۔ یہ وہ فرد ہی نہیں ہے جسے خریدا یا توڑا جا سکے۔"

"اگر یہ شخص ہمارا نہیں ہو سکتا تو ہم جیسی غیر معروف اور خفیہ تنظیم کی تہہ تک پہنچ کر اس کی حقیقت معلوم کر سکتا ہے۔ یہ ہمارے لیے مستقبل میں خطرہ بن سکتا ہے اس لیے اسے دنیا سے رخصت کرنے کا پروگرام بناؤ۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں۔ اس کام کو جلد ہی مکمل کر کے آپ کو رپورٹ پیش کر دی جائے گی۔"

❀ ❀ ❀

وجاہت اور حنا صبح بیدار ہوئے تو رات کا خمار ابھی تک ان کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ حنا بستر سے کھڑی ہوئی تو وجاہت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اچانک اس کے موبائل فون کا بزر بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نگاہ کی' سامنے میاں صاحب کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔ "السلام علیکم پاپا!"

"وعلیکم السلام! خوش رہو جاگ گئے ہو؟ تو پھر فوراً ہماری بہو کے ساتھ نیچے چلے آؤ۔ اس کے ممی' پاپا آئے ہوئے ہیں۔"

"ابھی آئے پاپا۔" آدھے گھنٹے بعد وہ نیچے پہنچے تو حنا کو اپنے ممی' پاپا کی جھلک دکھائی دی۔ دونوں نے چاروں سے دعائیں لیں اور ناشتے کی طویل ٹیبل چیئرز پر بیٹھ گئے۔ ناشتے کے دوران سب میں ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی رہی۔ اسی دوران شیخ صاحب نے ایک لفافہ حنا کی طرف بڑھایا۔ لفافہ لیتے ہی ... کی آنکھیں ایک اندرونی مسرت سے چمک اٹھیں۔

"تھینک یو پاپا! تھینک یو ویری مچ۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر شکریہ ادا ... جائے۔ ویسے بھی ہمارے درمیان اس لفظ کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔"

"آپ سچ مچ ایک گریٹ پاپا ہیں' وجاہت ... میاں صاحب استفسار طلب نظروں سے شیخ صاحب کو دیکھنے لگے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں' اس لفافے میں کیا ہے۔ انہوں نے ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ ...

"بھئی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس ... صرف اسلام آباد کے دو ٹکٹ ہیں اور وہ بھی کل کی تاریخ کے۔ یہ سب کرنے کے لیے مجھے حنا نے کہا تھا کہ ... اور وجاہت اپنا ہنی مون مری اور آزاد کشمیر کی وادی میں منائیں گے۔ وجاہت نے حنا کی طرف دیکھا۔

"تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ حالانکہ میرا ارادہ ... کہیں باہر جانے کا تھا۔" وجاہت نے کہا۔ حنا کے چہرے پر پشیمانی در آئی۔

"ایم ویری ویری سوری! میں آپ کو رات کو ... بارے میں نہ بتا سکی۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ آپ میری بات ضرور مان لیں گے۔" وہ پشیمان نظر آتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وجاہت نے اسے مزید کوفت و پشیمانی سے بچانے کی کوشش کی۔

"اوکے' نو پرابلم' تمہاری خوشی ہی میں میری خوشی ہے۔ ہم کل کی فلائٹ سے ہی اسلام آباد پہنچیں گے اور پھر وہاں سے مری کی طرف نکل جائیں گے۔" ... کے لبوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔

میاں جی نے گفتگو میں حصہ لیا۔ "مری اور کشمیر اچھی طرح گھوم پھر آؤ' پھر باہر سے بھی ہو آنا۔ دو چار ماہ خوب تفریح کرو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

گفتگو میں عارضی وقفہ آیا تو سب خاموشی سے ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ بات کنفرم ہو چکی تھی کہ وہ نیا شادی شدہ جوڑا کل یعنی تین جولائی کی فلائٹ سے کراچی سے اسلام آباد پہنچنے والا ہے۔

❀ ❀ ❀

ثاقب وحید نے اندرون شہر اپنے موبائل فون سے ایک نمبر ڈائل کیا۔ بیل جاتے ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ "یس سر! حکم کیجیے۔ تم تک شاہد اقبال کا مکمل بائیوڈیٹا پہنچ گیا ہوگا۔ جس قدر جلد ہو سکے' اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر اطلاع دو۔"

"کامیابی کی رپورٹ' شام سے پہلے ہی آپ تک پہنچ جائے گی۔"

"انتظار رہے گا۔"

❀ ❀ ❀

شاہد اقبال اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک حد تک کچھ غیر معروف سڑک کے کنارے کھڑا باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک چار افراد' دو موٹر سائیکل پر وہاں آ پہنچے۔ موٹر سائیکل رکتے ہی وہ آرام سے نیچے اتر آئے۔ ان چاروں میں سے دو کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ ان کے اطمینان اور بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ ان کے چہرے پر نقاب تک نہیں تھی۔ انہوں نے شاہد اقبال کو ان تینوں صحافیوں سے الگ کر کے ایک طرف کھڑا کر دیا۔ شاہد اقبال کے علاوہ تینوں صحافیوں کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ آنے والے چاروں افراد میں سے ایک جو سینئر نظر آ رہا تھا' اس نے اطمینان سے ارد گرد کا جائزہ لیا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف گردن سے ہلکا سا اشارہ کر دیا۔ اشارہ ملتے ہی دونوں کے ریوالور یکے بعد دیگرے تین بار گونجے۔ چھ گولیاں بیک وقت شاہد اقبال کے سینے میں اتر گئیں۔ اپنے قلم سے قوم کی تقدیر بدلنے کا خواب دیکھنے والا قلم کار' کٹی ہوئی شاخ کی طرح ہرا کر زمین بوس ہو گیا' لمحوں میں ہی خون میں لت پت ایک لاش' زمین کے بے اماں سینے پر پڑی ہوئی تھی۔ سینئر شخص چند لمحوں تک لاش کو دیکھتا رہا پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

"چلو۔" چند لمحوں میں دو موٹر سائیکلیں' اطمینان سے اسی سڑک پر رواں تھیں' جیسے انہیں کہیں پہنچنے کی کوئی جلدی نہ ہو۔

❀ ❀ ❀

وہ جولائی کی تین تاریخ تھی۔ حاجی بشیر احمد اپنی تمام تیاریاں مکمل کر کے ایئرپورٹ جانے کے لیے اپنی گاڑی میں آ بیٹھے۔ ڈرائیور پہلے سے آگاہ تھا کہ انہیں ایئرپورٹ جانا ہے۔ کامران بھی ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر انہوں نے منع کر دیا۔ ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے مستعدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایئرپورٹ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ حاجی بشیر احمد کو پچھلے سال حج پر جانے سے پہلے کے ایام یاد آ گئے۔ پچھلے سال بھی وہ اسی تگ و دو میں تھے کہ کسی غریب مگر مستحق فرد کو اپنے خرچے پر حج کرا سکیں۔ پچھلے سال انہوں نے اپنے گھر کے قریب' رہنے والے مسجد کے موذن کو حج پر لے جانے کا سوچا۔ اس سے پہلے کہ ان کی روانگی کا دن آتا' ایک دن عبداللہ بازار گیا اور اپنے قدموں پر چل کر واپس نہیں آیا۔ چند لوگ اس کے بے جان وجود کو اٹھا کر لے آئے۔ کراچی کے روزمرہ کے حالات میں دو چار قتل ہونا بھی شامل تھا۔ قاتل اور مقتول' دونوں کا کسی مخصوص گروہ سے تعلق ہوتا تھا۔ مگر اس قتل و غارت کی زد

میں کبھی کوئی بے گناہ اور لاتعلق شخص بھی آجاتا تھا۔ جیسے اس بار عبداللہ شاہ آ گیا تھا۔ اچانک گاڑی کے ٹائر پوری قوت سے چرچرائے۔ وہ چونک کر خیالات کی دنیا سے باہر نکل آئے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے' سنبھلتے اچانک ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا ان کی گاڑی نے چند قلابازیاں کھائیں اور پھر ایک جگہ پر الٹے رخ رک گئی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پائے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہوتے ان کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

❀……❀ ❀

ثاقب وحید کو شام کو شاہد اقبال کے "کام" کی رپورٹ ملی تو اس نے اسی وقت ہی اس مخصوص انٹرنیشنل نمبر پر کال کی۔ "شاہد اقبال کا مسئلہ حل کر دیا گیا ہے سر! ابھی نیوز چینلز پر بھی اس کی خبر آجائے گی اور کوئی حکم……؟"

"کل بیرون ملک سے تمہارے بینک اکاؤنٹ میں ایک بہت بڑی رقم جمع کرائی گئی ہے۔ "مستحق" افراد تک پوری پوری رقم پہنچادو۔"

"یہ کام بھی ہو جائے گا اور کچھ؟"

"سیف علی کی میرے نمبر پر کال آئی تھی۔ وہ آج کل اسلام آباد میں ہیں۔ وہ مجھ سے مل کر کسی اہم معاملے میں کچھ سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں۔ میری جگہ تم اس سے مل کر اسے اپنی طرف جھکاؤ۔ سمجھوتے کو کامیاب بناؤ۔ ان کا ہماری طرف آنا خوش آئند بات ہے۔ ان کا میرے پاس بھی آنا ممکن نہیں اور نہ ہی کراچی میں آنا ممکن ہے۔ تم خود فوراً سے پیشتر ان سے ملو اور ملاقات کے بعد فوراً واپس کراچی پہنچو۔ تمہاری یہاں زیادہ ضرورت رہے گی۔ فی الحال اپنی جگہ کاشف حسن کو سونپ جاؤ۔"

"میں ابھی اسلام آباد کے لیے کوئی سیٹ بک کراتا ہوں۔"

"پاکستان کے تمام نیوز چینلز ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی اہم خبر ہو تو فوراً اطلاع دو۔"

کال منقطع ہوتے ہی ثاقب وحید نے ایک نمبر پنچ کیا۔ کال ریسیو ہوتے ہی کہا۔ "جتنا جلد ہو سکے اسلام آباد کے لیے ایک سیٹ کنفرم کراؤ۔"

"او کے سر! میں معلومات حاصل کر کے آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔" دوسری طرف سے کال منقطع کر دی گئی۔ دس منٹ بعد ہی ثاقب وحید کا موبائل فون جگمگا اٹھا۔ اسکرین پر دس منٹ پہلے ڈائل کیا ہوا نمبر جگمگا رہا تھا۔ "ہاں کہو!"

"صبح' تین جولائی کی پہلی فلائٹ میں آپ کی سیٹ بک ہو گئی ہے۔ آپ کو ٹکٹ اور کاغذات جلد ہی مل جائیں گے۔"

"میں انتظار میں رہوں گا۔"

❀ ❀ ❀

انہیں ہوش آیا تو وہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں موجود تھے۔ ان کے سر پر چوٹ آئی تھی' جس سے ایک حد تک خون بہہ نکلا تھا۔ سر پر مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور خون کی کمی کو پورا کرنے کے لیے انہیں خون کی بوتل لگی ہوئی تھی۔ انہیں ہوش میں آتا دیکھ کر کامران لپک کر ان کے قریب پہنچے۔ دور کھڑے ہوئے دوسرے عزیز بھی قریب سمٹ آئے۔ کامران نے بے ساختہ ان کا ایک ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

"پاپا…… آپ…… آپ کیسے ہیں؟ یہ سب کیسے ہوا؟" اس کے لہجے سے نمی اور بے قراری صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اچانک انہیں اپنے ڈرائیور

خیال آیا۔ "زاہد میاں کیسے ہیں؟"

"وہ…… وہ نہیں رہے۔"

انہوں نے بے ساختہ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ "انا للہ وانا……" ایک پُر اذیت ہراس کے دل میں اتر گئی۔ آنکھیں کھول کر انہوں نے کامران کو دیکھا۔

"میں خیریت سے ہوں میری فکر مت کرو' تم جاؤ' زاہد کے گھر والوں کو سنبھالو انہیں دلاسہ دو' جس چیز کی ضرورت ہو پوری کرو ان کی۔ تمہارا وہاں ہونا زیادہ ضروری ہے۔"

"اس منحوس حادثے کو بھی آج ہی ہونا تھا۔ آپ کتنی اچھی نیت سے قیوم انکل کے پاس جارہے تھے مگر……" اس کی آواز بھرا گئی۔

"نہیں بیٹا' ایسی باتیں نہیں کرتے۔ خدا کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ خوامخواہ شکوہ کر کے خدا کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ ہر وقت اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اب تم جاؤ۔" کامران نہ چاہنے کے باوجود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ حاجی بشیر احمد کا اس بات پر پختہ یقین تھا کہ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ انہیں جب بھی کوئی مصیبت یا پریشانی لاحق ہوتی تھی تو وہ یہی بات دہرا کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے تھے۔ مگر اس بار ان کے ان لفظوں میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خدا کی واقعی اس حادثے میں ایک مصلحت پوشیدہ تھی۔ اس حادثے نے انہیں اس سے بھی بڑے حادثے سے بچالیا تھا۔

☆……☆……☆

وجاہت اور حنا' دونوں کے والدین انہیں ایئر پورٹ تک آ کر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بورڈنگ کے تمام مراحل سے گزر کر وہ اب ویٹنگ روم میں ویٹ کر رہے تھے۔ نو بجے انہیں وہاں سے آؤٹ ہونا تھا۔ مگر اب نو کی بجائے ساڑھے نو ہونے والے تھے۔

مگر اب بھی پتا نہیں تھا کہ فلائٹ کی روانگی کب تک عمل میں آئے گی۔ حنا' وجاہت سے بھی زیادہ بور بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اکتا کر کہا۔ "جاؤ وجی! پوچھ کر آؤ کہ فلائٹ کب تک روانہ ہوگی۔" وہ اٹھ کر معلوماتی کاؤنٹر پر گیا اور پھر چند لمحوں بعد واپس لوٹ آیا۔ اس نے بیٹھتے ہی ایک گہری سانس لی۔

"لیجیے۔ ایک اور مصیبت پیدا ہو گئی ہے۔ جواب ملا ہے کہ موسم کی خرابی کے باعث کر فلائٹ لیٹ کی جا رہی ہے۔ جونہی موسم ٹھیک ہوگا فلائٹ روانہ ہو جائے گی۔" حنا نے برا سا منہ بنایا۔ "اس موسم کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔"

اس نے سرسری نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پورا ہال مختلف ممالک کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے ٹی وی پر "جیو نیوز" کی سرخیاں نظر آ رہی تھیں۔ وقت دھیرے دھیرے سرکنے لگا۔ ہال میں وقتاً فوقتاً مختلف ممالک میں جانے والی فلائٹس کا اعلان ہوتا رہا۔ پھر اچانک ان کی باری آ گئی۔ دونوں نے اعلان سنا اور ایک دوسرے کو آسودگی بھری نگاہ سے دیکھ کر مسکرا دیے۔ تمام مسافر ضروری کارروائی کے بعد جہازی زینے طے کر کے اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھنے لگے۔ پلین اسٹاف کی طرف سے انہیں خوش آمدید کہا گیا اور امید ظاہر کی گئی کہ ان کا سفر ان کے ساتھ اچھا گزرے گا۔ انہیں مخصوص ہدایات دینے کے بعد پلین حرکت میں آیا۔ پلین فضا میں پہنچتے ہی سیٹ بیلٹ کھول لیے گئے۔ تمام مسافر پرسکون ہو کر بیٹھ گئے۔

اس پلین میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ مسافر تھے اور ہر فرد کے سینے میں ایک کہانی پوشیدہ تھی۔ کچھ لوگوں پر کہانی بیت چکی تھی اور کچھ پر بیت رہی تھی۔ وہاں ایک خوب صورت عورت' اپنے ایک کم سن بیٹے کے ساتھ بیٹھی بہت دور تک سوچ رہی تھی۔ وہ کم سن بچہ اس کی واحد اولاد تھا۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی' مگر اس کے باوجود اس سے اس کا سکون چھن گیا تھا۔ کراچی کے خراب سے خراب تر حالات نے اسے دہلا دیا تھا۔ اسکولز میں بم بلاسٹ ہو رہے تھے۔ معصوم بچیاں اور بے گناہ بچے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔ اس صورت حال نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ اس خوف سے رہائی حاصل کرنے کے لیے' چند ہفتوں کے لیے کسی پرسکون مقام پر جا کر رہنا چاہتی تھی۔ وہاں ایک کروڑ پتی سیٹھ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تین بیویوں اور کئی بچوں کا باپ تھا۔ مگر عالم پیری میں بازار حسن کی ایک دیوی پر دل ہار بیٹھا تھا۔ اس بازار میں ہر بار جانا ممکن نہیں تھا (نیک نامی بھی کوئی چیز ہے) اس نے اس حسینہ کی قیمت ادا کر کے اس کا ایک سال اپنے نام کر لیا تھا۔ وہ اسے کراچی نہیں لا سکتا تھا' وہاں جان پہچان کے بہت لوگ تھے' نیک نامی پر حرف آ سکتا تھا۔ سو اس نے اس حسینہ کو اسلام آباد میں ایک پرتعیش گھر کرائے پر لے کر دے رکھا تھا۔ جب بھی اس کی یاد آتی وہ ہفتہ پندرہ دنوں بعد جا کر اپنا دل بہلا آتا تھا۔

دوسری طرف ثاقب وحید بھی اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا اسے اس طرح اپنے بارے میں سوچنے کے بہت کم مواقع میسر آتے تھے مگر جب بھی آتے وہ اپنے بارے میں بہت دیر تک اور بہت دور تک سوچتا تھا۔ بیس سال پہلے وہ ایک خفیہ' مخصوص جماعت میں شامل ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مختلف کارنامے انجام دے کر بڑے صاحب کی نظروں میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ بڑے صاحب کی مہربانیاں بھی اس پر حد سے زیادہ ہونے لگیں۔ وہ اس پر حد سے زیادہ اعتماد کرنے لگے تھے۔ اسی لیے چند برس قبل' دیار غیر جانے کے بعد انہوں نے اپنے تمام اختیارات اسے سونپ دیے تھے۔ ان کی غیر موجودگی

میں وہ تمام سیاہ وسفید کا مالک تھا۔

حنا اور وجاہت کی آنکھیں بھی مندی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بھی سوچوں سے بے نیاز نہیں تھے۔

وسیم بھی اسی جہاز میں سوار تھا اور وہ بھی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماں باپ کا' بیوی کا' بیٹے کا چہرہ بار بار اس کے تصور میں آ رہا تھا اور آ آ کر اس کی بے چینی کو مزید ہوا دے رہا تھا۔ ہر شخص سوچ رہا تھا۔ آنے والے وقت کے بارے میں' آنے والے دنوں کے بارے میں' سب کے دل مختلف ارادوں سے پر تھے مگر تقدیر کا کچھ اور ارادہ تھا۔ ایسا ارادہ' جو دوسروں کے سب ارادوں پر بھاری ہوتا ہے۔ انسان سوچوں میں ڈوبا ہوا ہو تو کچھ پتا نہیں چلتا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ کافی وقت گزر گیا تھا مگر بہت کم لوگوں کو اندازہ تھا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔

شاید ان کی منزل قریب تھی۔ بے حد قریب۔

اچانک ہوا میں سکون سے تیرتا ہوا جہاز لہرایا۔ جیسے ایک لمحے کے لیے اس کی توانائی سلب کر لی گئی ہو۔ سیٹوں پر بیٹھے ہوئے سب لوگ لہرا گئے۔ چند عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ سب لوگ خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گرے۔ جہاز کے سینئر پائلٹ کو کچھ پتا نہ چل سکا کہ جہاز کے لہرانے کی وجہ کیا ہے۔ ابھی وہ کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ جہاز نے ایک اور گہری قلابازی کھائی' اس بار لوگ ایک دوسرے کے اوپر اوندھے منہ آ گرے۔ دہشت نے یک لخت تمام قلوب پر قبضہ کر لیا۔ دھڑکتے ہوئے دل تھمنے لگے' تھم تھم کر چلنے لگے۔ کچھ قلوب اپنی مخصوص رفتار سے زیادہ متحرک تھے۔ اس ناگہانی آفت کے پڑتے ہی سب لوگوں کے منہ سے بے اختیار خدا کا نام نکلا۔ انسان کی خود غرضی ثابت ہو چکی تھی کہ مصیبت پڑنے پر وقت آنے پر ہی سب اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ روتے ہیں' گڑگڑاتے ہیں اور خدا ان کی سن لیتا ہے مگر جب قیامت ہو' قیامت کا آغاز ہو' تب خدا کو پکارنے کا' معافی مانگنے کا' توبہ کرنے کا وقت نکل چکا ہوتا ہے۔ تب خدا نہیں سنتا' یہ مصیبت نہیں تھی' قیامت تھی' جو کہ ٹوٹنے والی تھی۔ مصیبت دور ہو سکتی ہے مگر قیامت نہیں ٹل سکتی۔ وہ قیامت' جو تقدیر کے اشتراک سے مل کر بپا ہو۔ تقدیر جب وار کرتی ہے' حملہ کرتی ہے تو کبھی کبھار اسے کسی بہانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اتنی بات ہی اس کے لیے اطمینان بخش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے ساتھ ہے۔

اچانک عقیل عباس نے اپنے تمام تر تجربہ کو بروئے کار لاتے ہوئے جہاز کو سنبھال لیا۔ جہاز چند لمحوں کے لیے ہوا میں تیرنے لگا۔ ایک سو پچاس کے لگ بھگ افراد کچھ دیر کے لیے موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے۔ کوئی ایسا دل نہیں تھا' لب نہیں تھے جو خدا کو یاد نہ کر رہے ہوں کیا بوڑھے کیا جوان' سب کی آنکھوں کی نمی رخساروں تک کا سفر کر رہی تھی۔

"الٰہی! صرف ایک بار ..... صرف ایک بار"

مگر اس بار وقت گزر چکا تھا۔ ایک بار کی مہلت بھی نہیں تھی۔ تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا۔ آج کے دن ایک قیامت بپا ہوئی تھی۔ قیامت صغریٰ' جسے لوگ مہینوں یاد رکھتے۔

پائلٹ کا دل سینے میں دھڑ دھڑا رہا تھا۔ وہ ایک نہایت پختہ کار پائلٹ تھا۔ اپنی پوری زندگی اس کام میں بتا چکا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی سروس پوری ہو چکی تھی۔ یہ اس کی آخری فلائٹ تھی۔ جو اسے سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ آرام سے اور سکون سے زندگی بسر کرتا ..... اپنی پوری سروس میں اس کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا کہ بغیر کسی فنی خرابی کے جہاز لہرایا

کیوں اور دوسری بار اتنی گہری قلابازی کیوں کھائی؟
وہ دن کا وقت تھا' ہر طرف اجالا تھا' اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تقدیر جب کارگر حملہ کرتی ہے تو قیامت کے ساتھ موت بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ موت کو اپنے ٹارگٹ کا پتا تھا' اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی' وہ بہت پرسکون تھی۔ جیسے اب سب اس کی مرضی سے ہونے والا ہے۔ موت نے سب لوگوں کی بجائے صرف ایک فرد پر حملہ کیا۔ وہ بیک وقت جب بھی کئی لوگوں پر اترتی ہے' اسی طریقے سے اترتی ہے۔ وہ فضائی ہو یا زمینی' موت سب سے پہلے صرف 'پائلٹ' کی بینائی چھینتی ہے۔ پھر اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس پائلٹ کی بھی اس نے بینائی چھین لی۔ اس نے کئی بار پلکیں جھپکائیں' سر کو دائیں بائیں جھٹکا' مگر اندھیرا بدستور قائم رہا۔ اس نے چیخ کر دوسرے پائلٹ کو اس صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا' مگر اندازہ ہوا کہ گویائی بھی چھینی جاچکی ہے۔ اگر وہ بولنے کے قابل ہوتا تو بھی اس کے بولنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ جونیئر پائلٹ کی بھی وہی حالت تھی جو اس کی تھی۔

اچانک . ایک خوف ناک دھماکہ ہوا جس کی گونج کئی میل دور تک سنائی دی۔ لوگوں کے خدشات سے لرزتے دھڑکتے دل ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔ فولادی لوہے سے بنا ہوا جہاز سیکڑوں ٹکڑوں میں منقسم ہوگیا۔ وہ جہاز ایک پہاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ جہاز کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں میں کہیں کہیں آگ بھڑک رہی تھی۔ جہاز میں سوار بہت سے اجسام کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ کئی وجود اعضاء بریدہ ہوگئے تھے اور کئی وجود...... موت کی آغوش میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں چند ایک کے علاوہ کوئی بھی لاش نظر نہیں آرہی تھی۔ صرف کٹے پھٹے ہوئے اعضاء ہی نظر آرہے تھے۔ کئی وجود پھٹ گئے تھے' جن کے لہو سے زمین سرخ ہوگئی تھی۔ ہونی جاری تھی۔ آگ اور دھوئیں سے فضا سیاہ ہو رہی تھی۔ وہ روح فرسا منظر ایسا نہیں تھا' کہ کوئی آنکھ بھی اسے دیکھنے کی متحمل ہوسکتی۔ کسی میں اتنی ہمت اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اس منظر کو' ان اعضاء بریدہ اجسام کو زیادہ دیر تک دیکھ سکتا۔ اس دھماکے کی گونج سنتے ہی کچھ مردوں کے ساتھ مقامی عورتیں بھی چلی آئیں اور یہ درد بھرا منظر دیکھ کر اپنی آنکھوں میں نمی بھر کو واپس لوٹ گئیں۔

حکومتی اہل کاروں تک خبر پہنچ گئی۔ وقتاً فوقتاً لوگ آنے لگے۔ چند لمحوں میں آگ بجھانے والی ٹیم بھی آگئی۔ آتے ہی آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر وہاں اب بچا ہی کیا تھا' بہت کچھ جلا کر آگ نے راکھ کر ڈالا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی تمام آگ بجھ گئی۔ اب وہاں صرف دھواں تھا (انسانی خواہشوں کا' محبت کا' جذبوں کا ..) سب کچھ ہی ختم ہوگیا۔ بہت سے لوگ ختم ہوگئے۔ جن میں ثاقب وحید بھی تھا اور حنا وجاہت بھی۔ ان میں وہ بھی تھا' جس کا وجود اب عنقا ہوچکا تھا۔ ہر زندہ وجود کی کہانی' زندہ وجود کے ساتھ ہوتی ہے مگر جب زندہ وجود نہ رہیں ان کی کہانی بھی نہیں رہتی۔ بہت سے وجودوں کے ساتھ وہ تینوں چاروں وجود بھی ختم ہوگئے۔ ان کی کہانی ختم ہوئی اور جب کہانی ختم ہوجائے' تب پڑھنے کے لیے کچھ نہیں رہتا۔

❖

سچا خواب

محترم عمران بھائی!
السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'
تمام محترم قارئین کا شکریہ کہ وہ میری تحریروں کو پسند کرتے ہیں. ایک اور سچی کہانی لے کر حاضر ہوں. اس کہانی کا انجام پڑھ کر آپ کو اللہ تعالیٰ کے وہ بہت سے احکامات یاد آجائیں گے جو اس نے ہماری ہدایت اور بھلائی کے لیے قرآن میں ارشاد فرمائے ہیں. اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے. آپ سب کی آراء کا انتظار رہے گا.

والسّلام
شہلی ارشاد

رحمت اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
''مومن سراپا الفت و محبت ہے اور اس آدمی میں سرے سے کوئی خیر و خوبی نہیں ہے جو نہ تو دوسروں سے محبت کرے اور نہ دوسرے اس سے محبت کریں۔''
(مشکوٰۃ)

یہ کہانی ہے دو جگری دوستوں کی' جو بچپن سے ساتھ پلے بڑھے اور جوان ہوئے' دونوں کا مزاج مختلف تھا لیکن پھر بھی دوستی تھی۔ ایک صراط المستقیم پر گامزن تھا تو دوسرا دین سے دور تھا' اس کی وجہ شاید دونوں کے والدین کی جانب سے تربیت کا فرق تھا۔

قصبہ نور پور میں جامع مسجد کے خطیب و پیش امام کرم الٰہی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دو بچوں سے نوازا تھا۔ بیٹا ریاض اور بیٹی نوشابہ تھی۔

مولانا کرم الٰہی ایک متقی اور پرہیز گار بندے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بیوی بھی ایسی ہی صابر و شاکر دی تھی' جو روکھی سوکھی کھا کر بھی دن و رات اللہ کا شکر بجا لاتی۔ بچے پیدا ہوئے تو ان کی تربیت بھی دینی اصولوں پر کی اور گاؤں کے واحد اسکول میں ریاض اور نوشابہ کو پڑھنے بٹھا دیا۔

اسی گاؤں میں ایک اور گھرانہ آباد تھا' غربت تو یہاں بھی تھی۔ صالحہ کا شوہر اس وقت سانپ کے کاٹنے سے انتقال کر گیا جب نوید صرف چھ سال کا تھا' اس کی ماں گاؤں کے لوگوں کے گھروں کے کام کاج کرتی' ان کا اناج بنا دیتی' کسی کے گھر کی صفائی کرتی تو کبھی کسی ایسی عورت کی خدمت کرتی جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہو۔

اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا بھی کسی طرح پڑھ لکھ لے اور شہر جا کر کوئی اچھی سی نوکری کرلے' اتنی غربت بھی نہیں تھی کہ فاقوں کی نوبت آتی پھر بھی حلیمہ کچھ نہ کچھ برے وقت کے لیے پس انداز کرلیتی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا' ایک کلاس میں پڑھنے کی وجہ سے نوید اور ریاض میں گہری دوستی ہوگئی۔ والدین بوڑھے اور بچے جوان ہوگئے' ریاض نماز کا پابند تھا اور پابندی سے پانچ وقت کی نماز مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرتا تھا لیکن بہت کہنے اور سمجھانے کے باوجود نوید کبھی ایک وقت کی نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد نہیں گیا۔ اس کا دل زیادہ تر لڑکیوں میں اٹکا رہتا تھا' جہاں اسے کوئی حسین صورت دکھائی دیتی وہ ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتا۔ نوید

شکل وصورت میں ریاض سے زیادہ خوب صورت تھا' اس لیے لڑکیاں بھی جلد ہی اس کی جانب ملتفت ہو جایا کرتی تھیں۔ ریاض کبھی کبھار نوید کے گھر جایا کرتا تو ہنس ہنس کر اس کی ماں حلیمہ سے کہتا۔

"چاچی' یہ اپنا نوید کچھ زیادہ ہی جوان ہو گیا ہے' تُو جلدی سے اس کی شادی کر دے" اور محبت کی ماری ماں ہنس کر کہتی۔

"کیوں نہیں بیٹا! میں ادھر ادھر نگاہ دوڑا تو رہی ہوں جہاں چاند سورج کی جوڑی مل جائے گی میں اپنے پتر کی شادی کر دوں گی۔" اور جواب میں نوید کہتا۔

"اماں تو ابھی سے میرے پیروں میں شادی کی زنجیر نہ پہنا' مجھے ابھی کوئی شادی وادی نہیں کرنا' ابھی ذرا آزادی سے سانس تو لینے دے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا...؟" اماں خفا ہو کر کہتی۔

"لو میں نے کون سی تیری آزادی پر پابندی لگائی ہے۔"

"ارے میری بھولی ماں! ذرا کام کاج کرنے دے' کچھ روپیا اکٹھا کر لوں گا پھر گھر بنواؤں گا اور پھر ٹھاٹ سے شادی کر دوں گا۔"

"تو پھر کر محنت' میں نے کب منع کیا ہے۔" ماں نے کہا۔

"خالی ہاتھ کیا کروں..." نوید نے مسکین سی شکل بنا کر کہا پھر بولا۔ "یار ریاض! ایسا کرتے ہیں کہ ہم دونوں مل کر کوئی کاروبار کرتے ہیں' کچھ رقم تو ملا کچھ اماں نے رقم جوڑ رکھی ہے' ہم دونوں مل کر خوب محنت کریں گے پھر شادی کریں گے' ہم محنت کریں گے تو ہمارے حالات بدلیں گے۔" نوید نے کہا۔

"بات تو تیری دل کو لگ رہی ہے یار!" ریاض نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں اس بارے میں بابا سے بات کروں گا اگر انہوں نے اجازت دی اور ساتھ میں کچھ رقم بھی دے دی تو ہم بیٹھ کر سوچیں گے۔"

ریاض نے ہامی بھر لی اور آ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ باہر نکلا تو اس کا پالتو ٹومی باہر کھڑا تھا' ٹومی ریاض کا پالتو کتا تھا' ایک مرتبہ جب ریاض اسکول سے آ رہا تھا تو ایک کتے کا چھوٹا بچہ زمین پر بیٹھا ہانپ رہا تھا' پیاس سے اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں نیم موندی ہوئی تھیں۔ ریاض کو اس پر ترس آیا اور اس نے اس کو گود میں اٹھا لیا اور پانی پلایا اور کچھ کھلا کر اسے اسی جگہ چھوڑ آیا' جہاں سے اٹھایا تھا۔

دوسرے دن جب ریاض اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا تو وہ سفید رنگ کا پلا اس کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ ریاض کو دیکھ کر دم ہلانے لگا اور اس کے پیروں میں لوٹنے لگا' وہ منہ سے کیاؤں کیاؤں کی باریک آوازیں نکال کر جیسے اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ ریاض نے جھک کر اسے پیار کیا اور اسکول جانے لگا تو وہ اس کے پیچھے پیچھے آنے لگا اور یوں وہ ریاض سے ہل گیا۔

مولوی صاحب اس بات کے خلاف تھے کہ ریاض کتے کو اپنے ساتھ رکھے' وہ کہتے تھے کہ یہ جانور نجس ہے جہاں یہ موجود ہوتا ہے' وہاں فرشتے نہیں آتے۔ ریاض کو چوں کہ اس پلے سے لگاؤ ہو گیا تھا' اس لیے اس نے اسے چھوڑا تو نہیں البتہ اسے گھر کے باہر ہی چھوڑ کر اندر چلا جاتا تھا' اور جب بھی ریاض باہر نکلتا پلا ٹومی اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹومی اور ریاض دونوں ہی جوان ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

نوید سے مشترکہ کاروبار کی بات کرنے کے بعد ریاض نے اپنے گھر میں بات کی تو مولوی صاحب نے تجارت کو پسند کیا اور کہا۔

"یہ تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے' تم ضرور کاروبار کرو اور دل لگا کر ایمان داری اور محنت سے کام کرو' اللہ تمہارے کام میں برکت ڈالے گا۔" اور اس سلسلے میں جو تھوڑی بہت رقم انہوں نے جوڑ رکھی تھی ریاض کے حوالے کر دی۔

ریاض اور نوید نے رقم ملا کر ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کیا اور خوب دل لگا کر محنت کی' دن رات کی محنت رنگ لائی اور ان کا کاروبار خوب چمک اٹھا' مزید رقم ہاتھ آئی تو دونوں نے مل کر ایک فارم ہاؤس خرید لیا۔

اس فارم ہاؤس میں انہوں نے پھلوں کے درخت بھی لگائے' سبزیاں بھی لگائیں' بھینسیں اور بکریاں بھی پال لیں۔ اس کام میں بھی بہت برکت ہوئی اور ان کے ہاتھوں میں بہت پیسا آنے لگا۔

مالی حالت کے تبدیل ہوتے ہی دونوں کے گھریلو حالات بھی بہتر ہو گئے۔ مکان بہت اچھے بن گئے' ریاض نے اپنی بہن کی شادی کر دی اور مولوی صاحب نے اپنے بھائی کی بیٹی سے ریاض کی منگنی کر دی۔ صوفیہ بھی ان دنوں دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی' شادی کے لیے یہ طے پایا کہ صوفیہ کے امتحانات کے بعد یہ شادی کی جائے گی۔ صوفیہ ریاض کی دیکھی بھالی تھی' وہ خوب صورت اور دین دار لڑکی تھی۔ دونوں اپنے والدین کے اس فیصلے سے مطمئن اور خوش تھے اور منگنی کے بعد ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے۔

ریاض نے نوید پر بھی زور دیا کہ تم بھی اب گھر بسالو' کب تک تم تنہا زندگی گزارو گے اور کب تک بے چاری چاچی اس بڑھاپے اور بیماری میں گھر سنبھالیں گی۔

نوید کی ماں اب مستقل بیمار رہنے لگی تھی۔ وہ دن رات ریاض پر زور دیتیں کہ وہ شادی کے لیے رضا مند ہو جائے لیکن نوید راضی ہی نہیں ہوتا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ پیسہ ہاتھ میں آ جانے کے بعد نوید عیاشیوں میں پڑ گیا تھا۔ وہ فارم ہاؤس میں اپنے ساتھ خراب عورتوں کو رکھتا اور ان پر پیسہ لٹاتا' اسے روز ایک نئی عورت کا چسکا پڑ گیا تھا۔ اسی لیے وہ شادی کے نام سے دور بھاگتا تھا کہ وہ کسی ایک عورت کا رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ کبھی کبھی ریاض کی اس کی منگیتر کے لیے محبت دیکھتا تو خوب مذاق اڑاتا اور کہتا۔

"اللہ تعالیٰ نے جوانی اور پیسہ اس لیے دیا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں خوب عیش کریں' وہ جوانی ہی کیا جو کھل کر نہ کھیلے...!"

اپنی عیاشیوں میں پڑ کر نوید کی توجہ کاروبار پر سے کم ہو گئی' البتہ اب بہت سارے کام ریاض کو اکیلے ہی دیکھنے پڑتے تھے' نوید آئے دن شہر کے چکر لگاتا رہتا تھا۔

ان دنوں نوید کی ماں شدید بیمار ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئی' اب نوید بالکل ہی بے فکر ہو گیا' اپنی ماں کی روز روز کی چخ چخ سے اسے نجات مل گئی۔ اسے ماں کے مرنے کا کوئی دکھ نہیں تھا بلکہ ایک لحاظ سے تو وہ اللہ کا شکر ہی ادا کرتا تھا' اب اسے نصیحت کرنے والا اور روک ٹوک کرنے والا ریاض ہی بچا تھا۔ سو وہ اپنا فرض سمجھ کر نوید کو سمجھاتا رہتا تھا اور نوید اس کی تمام نصیحتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں ریاض بہت خوش رہنے لگا تھا کیوں کہ صوفیہ نے میٹرک کا امتحان دے دیا تھا' اب دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگی تھیں۔ ریاض ان دنوں کے خواب آنکھوں میں سجائے دن رات محنت کر رہا تھا کہ جب وہ اور صوفیہ ایک ہو جائیں گے۔ اس کو اتنا خوش دیکھ کر نوید تپ جاتا اور کہتا۔

"میں نے تیرے جیسا احمق آدمی آج تک نہیں دیکھا' ارے مرد بن مرد...... بس ایک بار میری جیسی عیاشی کی ایک رات گزار لے تیرے دل سے اس صوفیہ کی محبت مکھن سے بال کی طرح نکل جائے گی۔"

اور ریاض ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ نوید کو بھی ہدایت نصیب کرے۔

☆ ☆ ☆

ایک دن ریاض اپنے فارم ہاؤس سے گھر واپس نہیں آیا' نوید اپنی راتیں فارم ہاؤس میں گزارتا تھا' جب کہ ریاض روزانہ رات کو گھر واپس آجاتا تھا۔ ٹومی ریاض کے ساتھ دن بھر فارم ہاؤس میں رہتا اور رات کو ریاض کے گھر کے باہر رہتا۔ ریاض نے گھر کے باہر ٹومی کے لیے ایک چھوٹا سا گھر بنا دیا تھا۔ جہاں رات بھر ٹومی آرام کرتا رہتا تھا۔

اس رات جب ریاض گھر واپس نہ آیا تو اس کے بابا اور اماں نے سوچا کہ کسی وجہ سے وہ آج رات گھر واپس نہیں آسکا ہوگا۔ کل آجائے گا وہ زیادہ پریشان بھی نہیں ہوئے مگر اگلا پورا دن اور پوری رات گزر گئی اور ریاض واپس نہیں آیا تو اس کے اماں اور بابا بہت زیادہ پریشان ہوگئے اور تو اور ریاض گھر نہیں آیا تو ٹومی بھی نہیں آیا۔

"مولوی صاحب آپ فارم ہاؤس جا کر تو پتا کریں' کچھ نوید سے اس کے بارے میں پوچھیں کہ میرا بچہ کہاں رہ گیا۔ میرے دل میں تو بہت بُرے بُرے وسوسے آرہے ہیں۔" ریاض کی اماں نے روتے ہوئے ریاض کے والد سے کہا۔

"تو فکر نہ کر ریاض کی ماں! میں فارم ہاؤس جا کر نوید سے معلوم کرتا ہوں کہ کہیں ریاض شہر تو نہیں چلا گیا لیکن اگر وہ جاتا تو ہمیں بتا کر ضرور جاتا' بس تو سارے شیطانی وسوسے اپنے ذہن سے جھٹک دے اور اللہ سے دعا کر کہ ریاض بالکل خیریت سے ہو۔" مولوی صاحب نے اپنی بیوی کو تسلی دی حالاں کہ خود ان کا دل بہت زیادہ گھبرا رہا تھا لیکن وہ مرد تھے اور انہیں اپنے جذبات پر کنٹرول تھا۔

مولوی صاحب فارم ہاؤس پہنچے تو انہیں وہاں نوید ملا' انہوں نے نوید سے ریاض کے متعلق پوچھا تو اس نے لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا کہ میں تو خود آپ کے گھر آنے والا تھا کہ ریاض کل فارم ہاؤس کیوں نہیں آیا' یہاں سے تو وہ حسب معمول رات کو چلا گیا تھا۔

مولوی صاحب پریشانی کے عالم میں گھر لوٹ آئے' انہوں نے گاؤں میں لوگوں سے بھی دریافت کیا کہ کسی نے ریاض کو دیکھا ہے کہ وہ اس رات گاؤں آیا تھا لیکن سب نے ہی کہا کہ انہوں نے ریاض کو نہیں دیکھا۔

ریاض کی گمشدگی وہ بھی یوں اچانک اس کے بوڑھے والدین کے لیے بہت بڑا المیہ تھا' ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ریاض کو کہاں ڈھونڈیں' کس سے اس کے بارے میں پوچھیں۔

ریاض کی گمشدگی کی خبر خود اس کے سسرال اور اس کی بہن کے سسرال میں بھی پہنچی' سارے لوگ ان کے گھر میں اکٹھے ہوگئے۔ ریاض کی تلاش جاری تھی۔ تین دن گزر چکے تھے اور ریاض کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔

ریاض کی گمشدگی کو چوتھا روز تھا جب نوید ان کے گھر میں داخل ہوا' سب کی نگاہیں بہت سی امیدوں کے ساتھ اس کی جانب اٹھ گئیں کہ وہ ضرور ریاض کی کوئی خبر لے کر آیا ہوگا لیکن نوید نے آتے ہی ایک ایسی خبر سنائی جس کو سن کر موت کا سناٹا چھا گیا اور پھر کسی نے بھی اس خبر کی صداقت پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ نوید نے آکر بتایا۔

"ریاض نے اسے بہت بڑا دھوکا دیا ہے' اس نے مشترکہ اکاؤنٹ میں سے ساری رقم نکالی اور کہیں فرار ہوگیا ہے' اس رات وہ فارم ہاؤس سے گھر آنے کے بجائے شہر چلا گیا تھا اور اگلے دن صبح اس نے بینک سے ساری رقم نکال لی اور کہیں غائب ہوگیا۔"

مولوی صاحب اپنے بیٹے سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"ریاض ایسا کسی قیمت پر نہیں کرسکتا' یہاں اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں' وہ اپنی شادی سے بہت خوش تھا' وہ جا کہاں سکتا ہے؟"

نوید نے ایک الزام ریاض پر یہ بھی لگایا کہ ہم نے بہت سے کاموں کے لیے کافی رقم بطور قرض بھی لی تھی اب ریاض ساری رقم لے کر فرار ہوگیا اور سارا قرضہ میرے سر چھوڑ گیا ہے۔

صوفیہ نے جب یہ سارے الزامات سنے جو نوید نے ریاض پر لگائے تھے تو اس نے بھی انہیں ماننے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ نوید جھوٹ بول رہا ہے' نوید تو یہ کام کرسکتا ہے لیکن ریاض جیسا نیک اور شریف شخص مر کر بھی ایسا گھٹیا کام کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔

نوید ریاض کے گھر والوں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے اس کے گھر سے چلا گیا اور یہ دھمکی بھی دے گیا کہ میں خود ریاض کو تلاش کروں گا اور پھر تم سب کے سامنے اسے لا کر اس کے منہ سے اس کے جرم کا اقرار کرواؤں گا اور پھر اسے سزا بھی دوں گا' تب تم لوگوں کو اس کا یقین آئے گا' کیوں کہ وہ تم سب کے سامنے پارسائی کا ڈھونگ رچاتا تھا' اس کی اصلیت سے تو صرف میں ہی واقف ہوں۔

ریاض کو غائب ہوئے پندرہ بیس دن گزر گئے تھے

لیکن ریاض ہنوز لاپتا تھا۔ایک دن مسجد میں کسی نے مولوی صاحب کو ایک دعا بتا کر کہا کہ آپ اس دعا کا ورد کریں آپ کو ان شاءاللہ ریاض کی خبر ضرور ملے گی۔

مولوی صاحب مسجد سے عشاء کی نماز کے بعد گھر آئے انہوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اور بیٹھ کر دعا کا ورد کرنے لگے اور پھر کسی سے بات کیے بغیر سو گئے۔

رات کو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ریاض کے فارم ہاؤس میں ہیں اور چلتے ہوئے جا رہے ہیں پھر انہوں نے اپنے آپ کو فارم ہاؤس کے پچھلے حصے میں کھڑا دیکھا' وہیں انہیں ایک کنواں دکھائی دیا جو بھاری سلوں سے پٹا ہوا تھا' اس کنویں کے قریب ریاض کھڑا ہے اور اس کے چہرے پر چاقو کے بہت سے نشانات ہیں اور ان سے خون بہہ رہا ہے اور ریاض اس کنویں کی جانب اشارہ کرکے ان سے کچھ کہہ رہا ہے پھر ان کی آنکھ کھل گئی۔

مولوی صاحب نے اپنے اس خواب کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا حد یہ کہ اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا اور وہ تنہا ہی فارم ہاؤس پہنچ گئے۔

فارم ہاؤس میں انہیں نوید ملا۔نوید نے مولوی صاحب کو دیکھا تو بہت بدتمیزی سے طنزیہ لہجے میں بولا۔

یہاں کیا لینے آئے ہیں مولوی صاحب! ریاض نے تو دوست ہو کر میرے ساتھ وہ کیا ہے کہ کوئی اپنے دشمن کے ساتھ بھی نہ کرے۔ میرے سر پر اتنے بڑے قرضے کا بوجھ چھوڑ کر سارا مال ہڑپ کر گیا' آپ دنیا والوں کو تو دین سکھاتے ہیں' مسجد میں بیٹھ کر وعظ کرتے ہیں' کچھ اپنے بیٹے کو بھی سکھایا ہوتا تاکہ آج وہ یوں آپ کے بڑھاپے پر کالک نہ ملتا۔"

مولوی صاحب نے نوید کی اس بدتمیزی کو بڑے تحمل سے برداشت کیا اور اس کی باتیں سنیں اور نوید کو کوئی جواب نہیں دیا۔

نوید نے مولوی صاحب کو رکنے کے لیے بھی نہیں کہا اور نہ انہیں کھانے پینے کے لیے پوچھا' مولوی صاحب واپس آنے لگے تو انہیں کچھ خیال آیا اور وہ رات اپنے گھر واپس نہیں گئے اور وہیں مسجد میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔

اگلی صبح ہی صبح وہ پھر فارم ہاؤس پہنچ گئے' وہ نوید سے ریاض کے بارے میں کچھ اور پوچھنا چاہ رہے تھے۔

جب وہ فارم ہاؤس پہنچے تو نوید فارم ہاؤس میں موجود نہیں تھا' البتہ مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے والا ایک ملازم موجود تھا' اس نے مولوی صاحب کو بتایا کہ نوید صبح ہی صبح شہر کسی کام کے سلسلے میں گیا ہے اور وہ کب واپس آئے گا اس بارے میں اس کو کچھ نہیں معلوم۔

وہ بہت اداس اور غمگین فارم ہاؤس سے واپس آنے لگے اچانک انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کہ یہ سارا منظر یہ ماحول ان کا دیکھا ہوا ہے حالاں کہ وہ پہلی مرتبہ وہاں آئے تھے پھر انہیں یاد آیا کہ انہوں نے خواب میں یہ سارا منظر دیکھا تھا وہ آگے بڑھتے چلے گئے پھر اچانک وہ پتھروں کی بڑی بڑی سلیں دکھائی دیں تو وہ چونک کر رک گئے۔ انہیں خواب میں یہی جگہ دکھائی دی تھی اور ان کا ریاض اسی جگہ اپنا زخمی اور خون آلود چہرہ لیے کھڑا اس جگہ کی جانب اشارہ کر رہا تھا' انہوں نے ان پتھروں کی سلوں کو سرکانے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکے۔

مولوی صاحب واپس اس ملازم کے پاس آئے اور اس سے ریاض کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ ریاض تو یہاں سے چلا گیا تھا' البتہ اس کا کتا فارم ہاؤس میں ہی تھا' وہ روزانہ اس کنویں کے

پاس آتا اور زور زور سے بھونکتا تھا تو نوید نے غصے میں آکر اسے گولی ماردی۔

یہ سن کر مولوی صاحب کا جسم کانپنے لگا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے' ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے انہیں ساری کہانی سمجھ میں آگئی ہو اور وہ وہاں سے سیدھے پولیس اسٹیشن پہنچے حالاں کہ ابھی تک ریاض کی گمشدگی کے سلسلے میں انہوں نے پولیس سے مدد نہیں مانگی لیکن اب جو کچھ ان کی سمجھ میں آرہا تھا اس سلسلے میں پولیس کی مداخلت ضروری تھی۔

پولیس اسٹیشن جا کر انہوں نے تھانہ انچارج نسیم قریشی کو ساری کہانی سنائی اور درخواست کی کہ وہ پتھر کی بھاری سلیں ہٹا کر کنویں کی تلاشی لیں۔ انہوں نے تھانے میں ایف آئی آر بھی درج کرادی۔

پولیس مولوی صاحب کے ساتھ فارم ہاؤس آئی اور پولیس کے جوانوں نے بھاری سلیں ہٹائیں تو کنویں کے اندر کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا' پولیس نے وہ سلیں واپس رکھ دیں اور کہا۔

"مولوی صاحب! آپ کا شک غلط ہے' کنویں میں تو کچھ بھی نہیں ہے' اس میں بہت پرانا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا ہے۔"

کیوں کہ مولوی صاحب نے ایف آئی آر درج کروائی تھی' اس لیے پولیس نے فارم ہاؤس سے آنے کے بعد رپورٹ تیار کی کہ شکایت کنندہ کے شک پر مطلوبہ جگہ کی تلاشی لی جا چکی ہے لیکن وہاں سے سوائے کاٹھ کباڑ کے کچھ بھی برآمد نہیں کیا جا سکا' اس لیے یہ کیس فائل بند کر دیا گیا۔

لیکن مولوی صاحب کے دل کو نہ تو قرار آرہا تھا اور نہ ہی اطمینان۔ وہ اپنے پاک باز بیٹے کے اوپر سے چوری کا الزام صاف کروانا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک بار پھر تھانے آکر پولیس والوں سے ضد کی اور خوشامد کی کہ وہ کنویں کو سارا خالی کریں۔

تھانہ انچارج کو مولوی صاحب کی بزرگی پر رحم آگیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے کہنے پر وہ دوبارہ فارم ہاؤس پہنچے اور پولیس کے جوانوں نے ایک بار پھر کنویں کو کاٹھ کباڑ سے خالی کرنا شروع کردیا اور پھر کنویں کی تہہ میں ایک بوری ملی۔ جس کے منہ کو سختی کے ساتھ بند کیا گیا تھا' بوری پھولی ہوئی تھی' اس میں کچھ تھا۔

بوری کو باہر نکال کر کھولا گیا تو اس میں سے ایک شخص کی لاش برآمد ہوئی' لاش بالکل صحیح سلامت حالت میں تھی اور لاش کے چہرے پر چاقو کے بہت سے گہرے نشانات لگا کر شکل کو بگاڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔

لاش کی شکل پر نگاہ پڑتے ہی مولوی صاحب کے پیروں نے ان کا ساتھ نہ دیا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑے' انہوں نے ریاض کی لاش کو شناخت کرنے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگایا۔

صاف صاف ظاہر تھا کہ ریاض کا قاتل سوائے نوید کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی نوید کی تلاش شروع کردی گئی' جو مفرور ہو چکا تھا۔

ریاض کی لاش پوسٹ مارٹم اور ضروری کارروائی کے بعد اس کے والد کے حوالے کردی گئی' ایک بدنصیب باپ نے اپنے جوان بیٹے کے جنازے کو کندھا دے کے قبرستان پہنچایا' انہوں نے خود ریاض کی نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔

گاؤں کی ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ریاض تھا ہی ایسا' لوگ اسے جانتے تھے اور پہچانتے بھی تھے' جب کہ نوید کا کردار بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔ لوگ ریاض کے حق میں دعائے مغفرت کر رہے تھے تو نوید کے

حق میں بد دعائیں، سارا گاؤں ریاض کے بوڑھے والدین کے دکھ میں برابر کا شریک تھا۔

پولیس اپنی کارروائی کررہی تھی انہوں نے بینک سے فرم ہاؤس کا اکاؤنٹ نکلوا کر چیک کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ نوید نے کئی مرتبہ ریاض کے جعلی دستخط سے بڑی اماؤنٹ بینک سے نکلوائی تھی اور اب وہ منظر سے غائب تھا۔ پولیس مسلسل نوید کو تلاش کررہی تھی۔

نوید کا پتا تو نہ چل سکا البتہ پولیس نے ایک شخص کو جعلسازی کی متعدد وارداتوں کے سلسلے میں گرفتار کیا اور جب اس شخص کے گھر کی تلاشی لی گئی تو پولیس کو وہاں ایک چیک بک بھی ملی جس پر ان کے مطلوب ملزم نوید کے جعلی دستخط تھے۔ اس کے علاوہ اس گھر سے ریاض کے نام کا ایک پاسپورٹ بھی ملا جس پر نوید کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

وہ شخص نوید ہی تھا دوران تفتیش نوید نے ریاض کے قتل کا اعتراف بھی کرلیا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ ہم نے بہت سا قرضہ لیا تھا اور وہ ان قرضوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے فارم ہاؤس کو گروی رکھنا چاہتا تھا لیکن ریاض فارم ہاؤس کو گروی رکھنے کے حق میں نہیں تھا اور نوید کے بار بار کہنے پر بھی وہ راضی نہیں ہوا اس کا کہنا تھا کہ ہم مزید محنت کریں گے اور سارا قرضہ اتار دیں گے لیکن محنت نوید کی سرشت میں نہیں تھی۔

دونوں میں اس روز جھگڑا ہوا اور غصے میں نوید کے ہاتھوں ریاض کا قتل ہوگیا۔

پولیس نے چالان بنا کر نوید کو عدالت میں پیش کیا۔ اقرار جرم اور حالات وشواہد کو دیکھتے ہوئے یہ مقدمہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا اور جج نے کیس کا فیصلہ سناتے ہوئے نوید کو سزائے موت سنادی۔

اور یوں ایک نیک اور متقی شخص جو ایک مسجد کے خطیب اور پیش امام بھی تھے کے سچے خواب نے اس کے بیٹے کے قاتل تک پہنچادیا۔

محترم قارئین کرام! قرآن پاک ہماری ہدایت اور راہ نمائی کے لیے اس دنیا میں آیا ہے اور ہم اس سے اتنے ہی دور ہیں۔ کاش! ہم دنیا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کی تعلیم بھی اس لیے حاصل کریں کہ اس کے مطابق زندگی گزاریں کہ ہمارا رب اب کیا چاہتا ہے کہ ہم اپنی زندگیاں کس طرز پر گزاریں۔

اگر نوید نے ریاض کی طرح قرآن کی تعلیم حاصل کی ہوتی تو اسے یہ ضرور معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء 4:92 میں ارشاد فرمایا ہے

''کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کا قتل کرے۔''

اور سورہ النساء میں اللہ کا ارشاد ہے:۔

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے۔'' (4:92)

میرا تمام قاری بہن بھائیوں کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ جہاں ہم اپنے بچوں کو بہترین انگلش اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں ان پر پیسہ لگاتے ہیں صرف اس لیے کہ وہ بہترین تعلیم حاصل کرکے معاشرے میں اچھا مقام حاصل کریں۔ وہیں ان کی آخرت سنوارنے کے لیے قرآن کی تعلیم کو لازم کرلیں نا صرف ناظرہ قرآن اپنے بچوں کو پڑھوائیں بلکہ اس کے معنی اور مطالب سے بھی آگہی کا پورا پورا اہتمام کریں اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں آخرت کے عذاب سے بچائے آمین۔

ہیروئن

اقبال بھٹی

ہیروئن تین قسم کی ہوتی ہے پہلی فلمی ہیروئن اور ڈرامے کی ہیروئن جس کے خواب ہر عمر کا شخص دیکھتا ضرور ہے مگر تسلیم نہیں کرتا دوسری ہیروئن کا تعلق منشیات کے گھرانے سے ہے جس سے نفرت کے باوجود لوگ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تیسری ہیروئن کا تعلق عملی دنیا سے ہے جسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔

ایک خواب زدہ شخص کا افسانہ جسے اچانک [illegible] کی ہیروئن مل گئی تھی

وہ مجھ سے پورے دو برس بعد اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوٹل میں ملا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ کالی پتلون اور سفید براق قمیص میں تھا۔ اس کے پیر میں نئے جوتے جو چمک رہے تھے۔ وہ میز پر اکیلا بیٹھا تھا اور اس کے سامنے پورا چرغہ تھا جسے وہ بڑی رغبت سے اڑا رہا تھا۔ اسے چرغہ کھاتے دیکھ کر میرے منہ میں پانی اور اس پر رشک آنے لگا۔ بڑی حیرت ہوئی تھی اس کا لباس اور یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر دو سال پہلے اس کی جیب میں چائے تک کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ وہ میرے تیس چالیس روپے کا مقروض بھی تھا۔ میں اس کی میز پر پہنچا تو اس کے چہرے پر ناگواری کی جگہ خوشی پھوٹ پڑی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھ سے بغل گیر ہوگیا اور پھر اس نے میرے لیے بھی پورا چرغہ ہی منگوالیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ میں اس کی فیاضی پر خوش کم حیرت زدہ زیادہ تھا اور اپنی خوش نصیبی پر رشک کرنے لگا۔ اس لیے کہ میں برسوں میں ایک بار بھی چکن تکہ تک نہیں کھاسکتا تھا۔ میں نے کھانے کے دوران اس سے پوچھا۔

''آج کل کیا کررہے ہو؟''

''ہیروئن کا کام کررہا ہوں۔'' اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

''ہیروئن کا...'' میرے ہاتھ سے نوالہ چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ سالا جب ہی چرغہ اڑا رہا ہے اور مجھے بھی کھلا رہا ہے۔

''میری جان تم سمجھے نہیں کہ میں کس ہیروئن کا کام کررہا ہوں۔ ہیروئن کے بارے میں کون نہیں جانتا ہے۔ ہیروئن دو ہوتی ہیں ایک فلمی دنیا کی ہوتی ہے۔ فلمی دنیا کا کوئی کاروبار نہیں ہوتا۔ دوسری ہیروئن منشیات کی ہے جس کا کاروبار آج کل عام ہوتا جارہا ہے۔ ایک تیسری ہیروئن بھی ہوتی ہے؟''

''تیسری ہیروئن...؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''تیسری ہیروئن وہ ہیروئن ہوتی ہے جو ساری زندگی ہیروئن ہی رہتی ہے نہ اس پر کوئی زوال آتا ہے اسے اپنے پاس رکھنے والا نہ تو کسی قانون اور پریشانی کی زد میں آتا ہے اور نہ اس پر کوئی آنچ آتی ہے۔''

''کیا یہ ہیروئن کوئی چیز ہے؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔

''ہے تو بہت پرانی چیز مگر میں نے اسے ہیروئن کا نام خود نے رکھا ہے۔''

''صاف صاف بتاؤ یہ ہیروئن کیا چیز ہے؟''
''یہ ہیروئن عورت ہے' لڑکی ہے' بیوی ہے' دلہن ہے۔ کسی مرد کی زندگی میں کوئی لڑکی یا عورت داخل ہوتی ہے تو وہ کسی ہیروئن سے کم نہیں ہوتی ہے۔ فلمی ہیروئن کی بہار تو چند سال کی ہوتی ہے پھر وہ فلمی افق پر کسی تارے کی طرح ڈوب جاتی ہے۔ دوسری ہیروئن وہ ہے جسے کوئی اچھا نہیں سمجھتا ہے۔ اسے رکھنے' استعمال کرنے اور بیچنے والے کی ہمیشہ مصیبت رہتی ہے اور پھر وہ ساری زندگی برباد کردیتی ہے پر یہ تیسری ہیروئن سب کی زندگی کے لیے ہیروئن رہتی ہے۔ دلہن بن کر' بچے پیدا کرکے' گھر چلا کر اور بیوی بن کر کیوں؟ میری بات ٹھیک ہے نا؟''
''مگر میں پھر بھی نہیں سمجھا کہ اس ہیروئن کا کس قسم کا کام کررہے ہو؟''
''سیدھی سی بات ہے کہ میں رشتے لگانے کا کام کررہا ہوں' بڑا اچھا کام ہے۔ اس میں اتنے پیسے مل جاتے ہیں کہ زندگی ٹھاٹ باٹ سے گزر رہی ہے۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو۔ دو سال پہلے تو میں ایک بن کباب تک نہیں کھا سکتا تھا۔''
''کیا اس میں واقعی اتنے اچھے پیسے مل جاتے ہیں؟''
''اچھے نہیں بلکہ بہت ہی اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔'' وہ بتانے لگا۔ ''آج کل لڑکیاں بہت زیادہ ہیں' ان کی تعداد دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی آتش فشاں کا لاوا ہیں' جو بہ رہا ہے اور قیامت تک بہتا رہے گا' کیا امیر' کیا غریب' کیا متوسط طبقے کا آدمی سب ہی اچھے رشتوں کے لیے پریشان ہیں۔ لڑکے تو بہت ہیں لیکن اچھے کم ہیں۔ سب ہی خاص کر لڑکی والے تو اچھے لڑکوں کے لیے بہت پریشان ہیں اور رہتے ہیں۔ میں ایک رشتہ لگاتا ہوں تو پانچ دس ہزار مل جاتے ہیں۔ خاص کر لڑکی والے بہت زیادہ مال دیتے ہیں۔''
''اسی لیے پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔''
''گھی میں نہیں چرغے میں ہیں' پہلے گھی کھانا بڑی بات تھی آج چرغہ کھانا۔'' وہ بولا اور پھر پوچھا۔ ''زندگی کیسی گزر رہی ہے؟''
''کس کی زندگی کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟''
''تمہاری اپنی زندگی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ زندگی تو اچھی گزر رہی ہوگی؟ خوش تو ہونا؟''
''کیا تمہیں میری آنکھوں میں ایک اچھی زندگی کی کوئی چمک نظر آرہی ہے۔ چہرے پر خوشی کی کوئی دمک ہے؟'' میں اس کی زندگی اور حالت کو دیکھ کر شدید احساسِ محرومی میں مبتلا ہوگیا اور جذباتی ہورہا تھا۔ ''کیا زندگی اسی کو کہتے ہیں جس میں نہ تو کوئی سرور ہو اور نہ ہی کوئی کیف ہو۔ میری سپاٹ سی زندگی کا عفریت مجھے روز بروز آہستہ آہستہ نگلتا جارہا ہے۔''
''میرے یار! کیا تم ترقی پسند شاعر ہوگئے ہو؟''
''کیا میری باتوں پر تمہیں شاعری کا دھوکا ہورہا ہے؟ میرے احساسِ محرومی کا احساس نہیں ہورہا ہے؟''
''یہاں سے اٹھ کر گھر چلتے ہیں' وہیں تم سے باتیں ہوں گی۔'' اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے لیے ایک خوشی خبری ہے۔''

اس نے میرے فلیٹ پر پہنچ کر میرے دو کمروں کے فلیٹ کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا' یہ گھر اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ پانچ برسوں سے میرے ہاں برابر آتا اور سوتا بھی رہا تھا بلکہ اسی نے مجھے یہ فلیٹ کرائے پر دلایا تھا۔ اسی کے توسط سے مجھے نوکری بھی ملی تھی۔ میرے فلیٹ کے کمرے میں روشنی ہوئی تو اس نے میری اکلوتی چارپائی اور صندوق کی طرف دیکھا۔
''تم آج بھی ایک مسافر کی طرح رہ رہے ہو؟''
''دس ہزار کی تنخواہ میں کیا میں بنگلہ بنالیتا۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''چار ہزار روپے فلیٹ کرایہ دے کر چھ ہزار میں گزر بسر کرتا ہوں۔''
''پھر تم ایسا کرو شادی کرلو۔''
''میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے پھر تم کس بات کا بدلہ لینا چاہتے ہو؟''
''اس میں بدلہ لینے والی کیا بات ہوئی؟''
''کیا چھ ہزار میں ہم دونوں کا گزارہ ہوجائے گا؟ وہ پہلے ہی روز گھر سے بھاگ جائے گی۔ یہ تم مجھ سے شادی کا مذاق کیوں کررہے ہو؟''
''میں مذاق نہیں کررہا ہوں بلکہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔'' وہ کہنے لگا۔ ''تم شادی کروگے تو تمہارے دونوں کمرے فرنیچر سے بھر جائیں گے۔ ایک بہترین قسم کا صوفہ سیٹ' ڈبل بیڈ جس میں موٹی فوم کا گدا ہوگا۔ کھانے کی میز چھ کرسیوں کے ساتھ ہوگی۔ ایک بڑی الماری' سنگھار میز اور ایک چھوٹا رنگین ٹیلی ویژن سیٹ مع وی سی پی بھی ملے گا۔ اس کے علاوہ باورچی خانے کا سارا سامان اور کوکنگ رینج بھی۔ تمہارا یہ فلیٹ نہ صرف بھر جائے گا بلکہ چودھویں کے چاند کی طرح جگ مگ جگ مگ کرے گا۔ اس کے علاوہ تمہیں جوڑے کی رقم بھی ملے گی۔''
''یہ سب کچھ مجھے کس خوشی میں ملے گا؟ دس ہزار روپے کمانے والے شخص کو اتنا کچھ مل سکتا ہے؟''
''یہ زمانے کی ریت ہے' ہر باپ کو اپنی بیٹی کا گھر بسانے کے لیے دینا پڑتا ہے۔''
''کیا یہ ایک باپ کے لیے ظلم نہیں ہے کہ اپنی پلی پلائی بیٹی بھی دے اور اتنا سارا جہیز بھی۔''
''لڑکے والوں کی نظر میں یہ کوئی ظلم نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''لڑکی والے کم جہیز دیں اور ان کا مطالبہ پورا نہ کریں تو یہ ظلم ہے اور لڑکے والوں کو لڑکی والوں سے مانگتے ہوئے بھی شرم نہیں آئی اور نہ آتی ہے۔ لڑکی کا جہیز لے کر لڑکا اکڑا اکڑ کر چلتا ہے۔ اس کے بدن پر جو لباس ہوتا ہے اس کے پیر میں جو جوتے ہوتے ہیں' وہ سب ہی تو لڑکی والوں کا دیا ہوتا ہے اور پھر لڑکے والے تو کسی فقیر کی طرح ہوتے ہیں جو بھیک کی ذلالت پر جھوٹی عزت کا خول چڑھا لیتے ہیں۔ ایسے ذلیل لوگ اس ملک کے ہر شہر' ہر گلی' ہر گاؤں میں خون آشام بھیڑیوں کی طرح پائے جاتے ہیں جو لڑکی والوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔'' وہ یک لخت جذباتی ہوگیا تھا۔
''مگر تم اس قدر جذباتی اور دکھی کیوں ہورہے ہو؟ یہ تمہارے سینے کے خم کیوں کانپ رہے ہیں؟''
''اس لیے کہ دو بہنوں کی شادی کرکے ہم لوگ تباہ ہوگئے۔ لڑکے والوں نے بھی کہیں کا

اور کسی قابل نہیں رہنے دیا تھا۔“

ہم دونوں کے درمیان چند لمحے تک سکوت چھایا رہا۔ اس نے سکوت کو توڑا۔

”کیا تم شادی کے لیے تیار ہو؟ میرے پاس ایک بہت ہی اچھا رشتہ ہے۔ ایسی لڑکی‘ ایسا رشتہ‘ ایسا جہیز اور ایسا موقع پھر کبھی تمہارے ہاتھ نہیں لگے گا۔“

”تم بھی مجھے ان ذلیل لوگوں میں شامل کرنا چاہتے ہو جو معاشرے کے ناسور ہیں؟“

”مگر یہ سب کچھ لڑکی والے اپنی مرضی سے دے رہے ہیں‘ تم نے تو نہیں مانگا ہے۔“

”مگر میرے پاس شادی کے لیے کوئی رقم نہیں ہے۔“

”لڑکے کو شادی کے لیے کسی رقم کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔“ وہ جز بز ہو کر بولا۔ ”یار! عجیب احمق آدمی ہو‘ کیا شادی کے لیے رقم کا پاس ہونا ضروری ہوتا ہے؟“

”کیا شادی مفت میں ہوتی ہے؟“

”ہاں!“ اس نے میری پیٹھ پر ایک دھپ جمائی۔ ”لڑکی کا باپ جو جوڑے کی رقم دے گا اس سے اپنے لیے دو جوڑے بنا لینا جوتے خرید لینا۔ شادی اور ولیمہ کے لیے جوڑے بنانے پر رقم خرچ نہیں کرنا ہے تو کسی دوست سے لے لینا‘ مجھ سے لے لینا۔ ولیمہ پر پچیس تیس ہزار سے زیادہ خرچ نہیں کرنا بلکہ فقیروں کو کھانا کھلا دینا‘ باقی رقم جیب میں ڈال دینا۔“

”جوڑے کی رقم کتنی ہوگی؟“

”تیس ہزار ؟“

”تیس ہزار ؟“ میں اچھل پڑا۔

”پورے تیس ہزار روپے نقد کل ہی ادا کر دے سکتا ہوں۔“

”مگر وہ مجھے لڑکی دینا پسند کریں گے؟“

”کیوں نہیں دیں گے‘ تم شریف لڑکے جو ہو۔ آج کل تم جیسے شریف لڑکے ملتے کہاں ہیں؟“

اس کی زبان سے تعریف سن کر میرا سینہ پھول گیا۔ میں نے اپنے تصور میں ایک پیکر تراش کے پوچھا۔

”اچھا یہ تو بتاؤ کہ وہ لڑکی کیسی ہے؟ اس کی عمر کتنی ہے؟ قد کتنا ہے؟ وہ کتنی پڑھی لکھی ہے؟ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟“

”وہ لڑکی ہیروئن ہے ہیروئن! یہ سمجھو کہ وہ بھی ہیروئن سے کم نہیں ہے۔ ایک ہیروئن تو تمہیں ساری زندگی نہیں ملے گی۔“

”کیا ایک ہیروئن ایک کلرک آدمی کو اپنا ......“

”یہ فلم کی نہیں گھر کی ہیروئن ہے‘ زندگی کی ہیروئن ہے۔ کھانا پکانا‘ سینا پرونا سب جانتی ہے وہ تمہاری بیوی نہیں نوکرانی بن کر رہے گی کیوں کہ ہم لوگ دوسروں کے گھروں سے جو لڑکیاں لاتے ہیں وہ ایک طرح سے نوکرانیاں ہی تو ہوتی ہیں اور وہ ساری زندگی سسرال میں خدمت کرتی رہتی ہیں۔“

”مجھے رشتہ منظور ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر بعد چلا گیا۔ میں کوئی گیارہ بجے بستر پر لیٹا تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی لیکن میں خود بھی آج کی رات سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ہیروئن کی طرح تھی اور جس سے میرا رشتہ طے ہونے والا تھا میری نظروں میں ہندوپاک کی تمام فلمی ہیروئنیں گھوم رہی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قسمت مجھ پر یوں بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ میں ایک بہت حسین و جمیل اور ہیروئن جیسی لڑکی کا شوہر بننے والا ہوں اور پھر وہ میرے لیے بہت سارا جہیز لے کر آ رہی ہے جوڑے کی رقم تیس ہزار روپے بھی دے رہی ہے۔ میری کایا پلٹ ہو گئی ہے۔

دوسرے دن وہ یہ بتانے آیا تھا کہ لڑکی والوں نے رسمی طور پر میرا رشتہ منظور کر لیا ہے اور جمعے کے دن بر دکھاوے کے لیے جانا ہے۔ پسند آ جانے کی صورت میں (اس نے مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ تمہیں ناپسند کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔ اس لیے لڑکی‘ لڑکی ہی ہوتی ہے ہر لڑکی حسین نہیں ہوتی ہے) اسی روز شام کی تاریخ طے کر دی جائے گی اور جوڑے کی رقم تیس ہزار روپے بھی مل جائیں گے۔

میں جمعے کے دن دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے ساتھ بر دکھاوے کے لیے گیا تھا‘ مجھے پانچ فی صد بھی یقین نہیں تھا کہ میں پسند کر لیا جاؤں گا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مجھے نہ صرف پسند کر لیا گیا بلکہ اسی روز میری بات پکی ہو گئی اور آئندہ جمعے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی۔ تیس ہزار کی رقم بھی جو جوڑے کی تھی ایک لفافے میں رکھ کر دے دی گئی‘ میری خوب خاطر تواضع بھی ہوئی تھی۔ لڑکیوں اور عورتوں نے بھی سامنے والے کمرے سے جھانک جھانک کر مجھے دیکھا تھا۔

رات نو بجے گھر جاتے ہوئے میں خواب کی سی حالت میں تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میری جیب میں تیس ہزار روپے ہیں۔ میری شادی طے ہو گئی ہے اور میں آئندہ جمعے شادی شدہ شخص ہو جاؤں گا۔ ایک عدد بیوی کا شوہر بن جاؤں گا۔ گھر پہنچ کر میں نے اس سے اچانک کہا۔

”یار! ایک پھڈا ہو گیا ہے‘ اس کے بارے میں نا تو میں نے سوچا اور نا تم نے اور نا ہی لڑکی والوں نے اب کیا ہوگا یار! میں تو بے موت مارا گیا۔“

”کیا ہوا......؟“ وہ ایک دم سے بوکھلا سا گیا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

”چھ ہزار میں ہم دونوں میاں بیوی کا گزارہ کیسے ہوگا یہ تو کسی نے بھی نہیں سوچا جب کہ فلیٹ کا کرایہ چار ہزار کھانے پر تین ہزار اور......“

”اللہ مالک ہے۔“ اس نے تیزی سے میری بات کاٹ کر کہا اور گہری سانس لی۔ ”وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

☆......☆......☆

وہ منگل کے دن صبح چھ بجے رنگ و روغن کرنے والوں کے ساتھ آ دھمکا۔ شام کو میں دفتر سے گھر آیا تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میرا اپنا فلیٹ ہے وہ یکسر بدل گیا تھا۔ اس میں خوب صورتی آ گئی تھی میں نے اس سے کہا۔

”یہ تم نے کیا کیا؟ مالک دیکھ لے گا تو وہ کرایہ اور بڑھا دے گا۔“

”مالک مکان کو تم گھر کے اندر داخل ہی نہیں ہونے دینا۔ بلکہ تین چار مہینوں تک کرایہ اس کے گھر پر لے جا کر پہنچاتے رہنا۔ میں یہ سب کچھ ہمارے بچپن کا دوست ہونے کے ناتے کر رہا ہوں‘ جب میں نے تمہاری زندگی پر رنگ و روغن کیا ہے تو سوچا کہ کیوں نہ گھر پر بھی

کردوں۔ اس لیے کہ اب تمہاری زندگی کا رنگین اور سب سے خوب صورت دور شروع ہونے والا ہے اور پھر گھر میں ایک ہیروئن آرہی ہے' اس کا شان دار استقبال ہونا چاہیے نا......؟"

جمعرات کے دن جہیز بھی آ گیا اس نے خود ہی سارا فرنیچر سیٹ کیا تھا' مجھے اپنے فلیٹ پر کسی شاہی محل کی خواب گاہ کا دھوکا ہو رہا تھا۔ جمعہ کے دن میری شادی بھی ہوگئی' وہی میری طرف سے پیش پیش تھا۔ اسی نے سارا انتظام کیا تھا۔ شادی کی تقریب بڑی سادگی اور باوقار طریقے سے انجام پائی تھی ہم دونوں میں سے کسی کے پاس حرام کی یا اندھی کمائی نہیں تھی جو مہندی جیسی فضول رسموں پر خرچ کرتے۔ رات گیارہ بجے میں اپنی دلہن اور براتیوں کے ساتھ فلیٹ پر پہنچا اڑوس پڑوس کی عورتیں اور لڑکیاں دلہن کو حجلۂ عروسی میں بٹھا کر چلی گئیں اور مرد بھی رخصت ہوگئے۔ میری چارپائی جو چھت پر ڈال دی گئی تھی وہ اور اس پر سونے جا رہا تھا' اس نے چھت پر جانے سے پہلے کہا۔

"دیکھو میرے دوست! میں نے جو کچھ کیا وہ پورے خلوص اور نیک نیتی سے کیا ہے' میں نے دنیا کی حسین ترین لڑکی تمہاری زندگی میں داخل کرادی ہے۔ جاؤ! جا کر ایک نئی زندگی کے سفر کا آغاز کرو۔ یہ نئی زندگی تمہیں مبارک ہو۔"

میں کچھ دیر بعد حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو وہ پلنگ کے کنارے گاؤ تکیے کے سہارے رنگین گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پیر رنگین سلوٹوں میں گم تھے۔ لمبا سا گھونگھٹ اس نے نکال رکھا تھا یا عورتوں نے گھونگھٹ لمبا کردیا تھا تاکہ میں اس کی شکل گھونگھٹ الٹ کر ہی دیکھ سکوں۔ میری نظروں میں کتنی ہی ہیروئنوں کے چہرے گھوم رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس ہیروئن کی طرح ہوگی شبنم' بابرا' انجمن' پنو ڈھلون ... دیکھا ... ؟ میں نے پلنگ پر اس کے پاس بیٹھ کر اپنی جیب تھپتھپا کر تسلی کی کہ منہ دکھائی کی انگوٹھی جیب میں ہی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل اور مرتعش ہاتھوں سے اس کے لمبے گھونگھٹ کے کونے پکڑے اور انہیں بڑی آہستگی سے الٹ دیا۔

رنگین گھونگھٹ میں سے ایک چہرہ ابھرا۔ میں نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔ دوسرے لمحے مجھے ایسا لگا کہ کوئی پتھر تڑاق سے میری کنپٹی پر آ کر لگا ہو۔ میں خوف اور صدمے سے چند لمحوں تک دم بخود ہو کر رہ گیا تھا۔ میری نظروں کے سامنے ایک بے کشش سا چہرہ تھا۔ نا رنگ تھا اور نا ہی کوئی روپ۔ سائیڈ ہیروئن کے تو کیا وہ ایکسٹرا کے لائق بھی نا تھی۔ ایسی لڑکی کو کوئی اسٹوڈیو میں بھی گھسنے نہ دے۔

میں ایک جھٹکے سے بستر پر سے اٹھا اور کسی سنسناتے ہوئے تیر کی طرح اوپر جا پہنچا۔ میری رگوں میں لہو ابل رہا تھا اور دماغ سنسنا رہا تھا۔ وہ چارپائی پر لمبی تان کر اس طرح سو رہا تھا جیسے اس نے اپنے کندھوں سے پہاڑ سا بوجھ اتار پھینک دیا ہو۔ رات کی خاموش فضا میں اس کے خراٹے گونج رہے تھے' میں نے غصے سے چارپائی الٹ دی تو وہ فرش پر کسی گیند کی طرح لڑھک گیا اور ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے مجھے دیکھنے لگا۔

پھر میری زبان تہذیب و اخلاق سے عاری ہوگئی میں نے اسے ایسی باتیں اور ایسی ایسی

گالیاں بکیں جو اس نے اپنی ساری زندگی میں نہ سنی ہوں گی۔ وہ بڑے ضبط و تحمل سے میری باتیں اور گالیاں سنتا رہا تھا۔ جب میں اپنے دل کی بھڑاس نکال چکا تو وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

"تمہیں ہیروئن کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ ہیروئن اسے کہتے ہیں جو سب سے زیادہ کما کر دے۔ مثال کے طور پر تم فلم کی ہیروئن کو لے لو۔ وہ فلمی دنیا میں سب سے زیادہ کمائی ہے مگر چند برسوں میں وہ ٹائیں ٹائیں فش ہو جاتی ہے۔ دوسری ہیروئن وہ جو منشیات کی ہے اور اسے پانے والا ایک ہی رات میں کروڑ پتی بن جاتا ہے مگر وہ ساری زندگی غارت کردیتی ہے' جب وہ پکڑی جاتی ہے تو ساتھ والے کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ تیسری ہیروئن تمہاری بیوی ہے' ایسی ہیروئن کی تلاش میں آج کا ہر لڑکا اور اس کے ماں باپ پاگل ہو رہے ہیں۔ ایسی ہیروئن قسمت والوں کو ہی ملتی ہے اور یہ ساری زندگی ہیروئن ہی رہتی ہے اور رہے گی۔"

"پاگل تو تم ہو۔" میں نے نفرت' غصے اور صدمے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ "ایسی بدصورت لڑکی سے شادی کرنے سے تو بہتر ہے کہ آدمی خودکشی کرلے یا ساری زندگی کنوارا رہ جائے۔ تم نے اس بدصورت سی لڑکی کو ہیروئن کہہ کہہ کر مجھے پھنسا دیا۔ آخر تم نے کس بات کا انتقام لیا ہے؟"

"احمق آدمی! وہ ہیروئن نہیں ہے تو اور کیا ہے؟" وہ کہنے لگا۔ "تمہاری بیوی سلائی کے ایک کارخانے میں کام کرتی ہے' ہر مہینے بیس ہزار روپے کماتی ہے۔ یہ سارا جہیز اور جوڑے کی رقم اس کی اپنی کمائی کی ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ بیس ہزار روپے ہر ماہ کمانے اور گھر چلانے والی ہیروئن تمہاری زندگی میں آ گئی ہے وہ نہ صرف گھر کا خرچ چلائے گی بلکہ تمہارے لیے کھانا بھی پکائے گی اور تمہارے بچوں کی ماں بھی بنے گی۔ تمہارے دکھ سکھ کی ساتھی بنے گی۔ ساری زندگی تمہاری خدمت کرتی رہے گی۔ تمہاری زندگی میں خوش حالی اور آسودگی بھر دے گی۔ تم بتاؤ کہ تمہاری بیوی کسی ہیروئن سے کم ہے؟ اس ہیروئن کے مقابلے میں کوئی دوسری ہیروئن ہے اس دنیا میں......؟ کیا اس سے حسین ہیروئن کوئی اور ہو سکتی ہے؟ اب جا کر غور سے اپنی دلہن کو دیکھو تمہیں اس سے زیادہ حسین ہیروئن ساری دنیا میں نظر نہیں آئے گی؟ تمہیں ایسی حسین ہیروئن اس دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی ہے؟"

میں نے حجلۂ عروسی میں آ کر اسے غور سے دیکھا۔ واقعی وہ دنیا کی سب سے حسین ہیروئن نظر آرہی تھی۔ اس کے سامنے دنیا کی ہر حسین ہیروئن کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔

❖

بری آتما کا انتقام

جناب ایڈیٹر نئے افق!

آداب!

آپ نے جعلی عاملوں کے قصے تو بہت پڑھے ہوں گے لیکن یہ قصہ ایک سچے عامل کا ہے۔ جو آج حیدر آباد میں گمنامی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ قصہ خود اس نے مجھے سنایا تھا کہ اس نے کس طرح ایک خاندان اور دو بھٹکتی روحوں کے درمیان تصفیہ کرایا تھا۔ امید ہے یہ کہانی آپ کو پسند آئے گی۔

خلیل جبار

کراچی

میں نے جب سے اپنا آستانہ کھولا تو میرے ذہن میں مختلف نوعیت کے خدشات تھے۔ لوگوں کو میرے پرانے کام کے بارے میں پتا ہے۔ میری دھوبی کی دکان تھی۔ علاقے کے لوگ مجھ سے کپڑے دھلواتے اور استری کرانے آتے تھے۔ ایک وقت تھا میری دکان سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی اور گھر کا گزارا بہت اچھا ہو رہا تھا۔ اس دکان سے میں نے اپنی دونوں بہنوں کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے کیں تھیں۔ خود اپنی شادی پر خوب کھل کر خرچا کیا تھا۔ والد نواب علی نے مجھے بہت سمجھایا اور کہا۔

”تم نے اپنی بہنوں پر بہت خرچا کیا ہے اور اب اپنی شادی پر بھی پیسا پانی کی طرح بہا رہے ہو ایسا نہیں کرو۔“

”ابا تم ٹھیک کہہ رہے ہو واقعی میں نے اپنی بہنوں کی شادی پر بہت خرچا کیا ہے اور اب میں اپنی شادی پر بھی کر رہا ہوں لیکن ایک بات بتائیں کہ کیا شادی روز روز ہوتی ہے۔ زندگی میں ایک بار شادی ہوتی ہے۔ پھر ہم اس پر بھی اتنی کنجوسی کریں۔ کیا اچھا لگے گا۔“

”میں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں بیٹا! پیسے درختوں پر نہیں اگتے کہ جب دل چاہا توڑ لیے۔ دولت بڑی محنت سے کمائی جاتی ہے اسے جو سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں وہ زندگی میں کبھی پریشان نہیں ہوتے۔“ ابا نے کہا۔

”بے فکر رہیں میں شادی پر خرچا کر رہا ہوں۔ شادی کے بعد احتیاط کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”اسلم بیٹے میں تمہارے بھلے کے لیے کہتا ہوں تمہیں برا لگتا ہوگا مگر میں اس لیے سمجھاتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو بہت دیکھا ہے جو کھلے ہاتھ کے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قرض میں پھنستے چلے گئے۔“ ابا نے کہا۔

”ابا یہ حقیقت ہے کہ انسان اگر ایک بار قرض کے لیے ہاتھ کسی اور کے آگے پھیلائے تو وہ پھر قرض میں پھنستا چلا جاتا ہے آپ بے فکر رہیں میں بھول کر بھی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا کہ آگے چل کر پچھتاوا ہو۔“ میں نے کہا۔

ابا اس وقت میرے سمجھانے پر وقتی طور پر مطمئن ہو گئے تھے۔ اس لیے شادی پر کھلا خرچا کرتا رہا۔ بیوی کے ناز نخرے اٹھانے میں مجھے ضرورت سے زیادہ خرچا کرنا پڑ رہا تھا۔ خرچ کرتے ہوئے مجھے یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ میں اچھا نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن دل کو پھر یہ کہہ کر سمجھا لیتا تھا کہ فکر کی بات نہیں ہے وقتی طور پر کرنا پڑتا ہے پھر بعد میں بیوی کو سمجھا دوں گا میری اتنی حیثیت نہیں کہ اس طرح خرچ کروں اور وہ مان جائے گی کیوں کہ نہیں مانے گی میری بیوی ہے۔ میرے دکھ درد کی ساتھی ہے۔ اسے خود بھی احساس ہوگا کہ شادی کے بعد میں نے اس کا کس طرح سے خیال رکھا ہے۔ پیسے کو بالکل بھی اہمیت نہیں دی۔ صرف اس کی محبت میں ہر وہ کام کرتا چلا گیا جو اس نے کہا۔ شادی کو مشکل سے ایک سال ہی ہوا تھا کہ میں ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ باپ بننے پر میرا ٹھیک ٹھاک خرچا آ گیا تھا۔ ڈیلیوری آپریشن سے ہوئی تھی۔ آپریشن و دوائیوں کے اخراجات بہت ہوئے تھے۔ اسپتال میں بیوی اور آنے والوں کو پریشانی نہ ہو یہ سوچ کر پرائیویٹ کمرہ لیا تھا۔ کمرے سے سہولت ضرور ہوئی تھی لیکن یہ سہولت بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ رشتہ داروں کو میرے بیٹے کا باپ بننے کی بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اس لیے ہر شخص مٹھائی کا تقاضہ کر رہا تھا اور میں خوشی خوشی ان کا تقاضا پورا کر رہا تھا۔ جو بھی گھر آتا اس کا منہ مٹھائی سے میٹھا ہو رہا تھا۔

اس موقع پر بھی ابا نے پھر مجھے سمجھایا۔ ”بیٹے اسلم ہاتھ کو ذرا دبا کر رکھو۔“

”ابا آپ بھی کیسی بات کر رہے ہیں بیٹا ہونے کی خوشی ایک بار ہوتی ہے بار بار نہیں ہوتی۔“ میں نے کہا۔

”میرا فرض تمہیں سمجھانا ہے آگے تمہاری مرضی۔“ ابا نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

مجھے ابا پر بہت غصہ آ رہا تھا کہ اس خوشی کے موقع پر وہ چاہتے ہیں کہ میں کنجوس بن جاؤں۔ میرے پاس اس وقت خزانہ ہوتا تو میں خزانے کا منہ کھول دیتا۔ خوب غریبوں و مسکینوں میں خیرات تقسیم کرتا لیکن میں ٹھہرا ایک دھوبی جتنی اوقات تھی اس سے بڑھ کر خرچ کر رہا تھا۔ میں واقعی بہت خرچ کر رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال کے اندر میں بہت سے لوگوں کا مقروض ہو گیا تھا۔ دکان کا کرایہ بھی بھاری پڑنے لگا تھا۔ میرا اصول تھا کہ کرایہ مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے دے دیا کرتا تھا لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ مالک دکان جب تک کرائے کے لیے خوب شور نہ کرلے کرایہ ادا نہیں کرتا تھا۔ مہنگائی کے طوفان نے سب کو ہی متاثر کیا تھا۔ اس لیے دکان میں کپڑے دھلنے بہت کم آنے لگے تھے۔ کپڑے کم آنے کا مطلب میری پریشانیوں میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ بیگم کی خواہش تھی کہ میں کھلا خرچ کروں اور اس کے ناز نخرے اسی طرح اٹھاؤں جیسے شروع کے دنوں میں اٹھایا کرتا تھا۔ لاکھ اسے سمجھایا کہ اب میری ویسی پوزیشن نہیں ہے جیسی شادی کے وقت تھی اس کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ آئے دن بیگم کی ناراضی بڑھنے لگی تھی۔ میکے جانے کی ضد کرنا شروع کر دی تھی۔ میں سب سمجھ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کس لیے ہو رہا ہے۔ میں بھی کیا کرتا مجبور تھا کسے اچھا نہیں لگتا کہ وہ اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا گھر میں تو تو میں میں ہونے لگی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے مجھ پر جادو ٹونا کرا دیا ہے۔ اس کا علاج کیے بغیر گزارا نہیں تھا۔ انسان کی نفسیات ہے وہ جو کچھ کرتا ہے اس کا جب پھل ملنے لگتا ہے تو وہ اپنی ناکامی دوسروں پر ڈال دیتا ہے۔ خود اپنے روز مرہ کی عادات پر غور نہیں کرتا کہ اس انجام پر وہ اپنے ہی ہاتھوں پہنچا ہے۔ میرے ساتھ بھی جو کچھ ہو رہا تھا وہ میرے کھلے خرچے کی بدولت ہوا تھا۔ لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ حاسدین نے جادو ٹونے سے میرے حالات خراب کر دیے ہیں۔ میں کئی عملیات کا کام کرنے والوں

سے ملا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ کسی حاسد رشتے دار نے میرے کام پر بندش کرادی ہے۔ میں بہت محنت کرتا ہوں لیکن اس کا صلہ اتنا نہیں ملتا جتنا ملنا چاہیے۔ اس بات نے میرے خدشات کو اور پکا کر دیا۔ عملیات کا کام کرنے والوں کے پاس وہی لوگ جاتے ہیں جو پریشان اور مالی بدحالی کا شکار ہوں اور عملیات کا کام کرنے والے اس کی مجبوری کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میری کمائی کا کچھ حصہ باقاعدگی سے عملیات کرنے والوں کی جیب میں جانے لگا تھا۔ کام ہونے پر پیسا چلا جائے تو انسان کو دکھ نہیں ہوتا۔ پیسا بھی خرچ ہو اور کام بھی نہ ہو تو اس وقت انسان کو بہت دکھ ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ عملیات کرنے والوں کے آستانے پر آنے والے لوگوں کی تعداد بہت ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کے کام بن جاتے ہیں اور وہ بابا کے لیے مٹھائی اور تحفے تحائف بھی لاتے رہتے تھے۔ میں انہیں حیرت سے دیکھتا اور دل میں سوچتا کہ وہ دن کب آئے گا جب میں بھی بابا کے لیے کام ہونے پر تحفے تحائف لاؤں گا۔

ایک دن میں بابا جمال الدین کے آستانے پر بیٹھا ہوا تھا اس وقت دو چار آدمی بیٹھے تھے۔ ان کے جانے پر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ میں نے ہمت کی اور بابا جمال الدین سے دل کی بات کہہ دی۔

''بابا آپ کے آستانے پر آتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے لیکن ابھی تک مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اور قرض دار ہوتا جا رہا ہوں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے میرے پاس کوئی الٰہ دین کا چراغ رکھا ہوا ہے جس کو گھس کر جن کو حاضر ہونے کا حکم دوں گا اور وہ پلک جھپکتے میں تمہارے مسائل حل کر دے گا۔'' بابا جمال الدین غصے میں آ گئے۔

''پر بابا یہ اتنے لوگوں کے کام ہوتے ہیں اور وہ مٹھائی اور تحفے لاتے ہیں ان کے کام کیسے ہوتے ہیں۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''دولت برسنے کا کوئی عمل ہوتا تو مجھے یہ ضرورت تھی کہ یہ آستانہ کھول کر بیٹھتا۔ میرے پاس جتنے بھی لوگ اپنے کاموں کے سلسلے میں آتے ہیں ان کے لیے میں دعا کرتا ہوں انہیں وظائف پڑھنے کو کہتا ہوں۔ جو میری ہدایت پر عمل کرتے ہیں ان کے کام بن جاتے ہیں جو وظائف پڑھنے کے چور ہوتے ہیں وہ کسی اور بابا کے پاس چلے جاتے ہیں۔'' جمال الدین بابا نے وظائف کی کتابیں مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''لوگوں کے کام ہونے میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ لوگوں کی اپنی محنت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا کیا سمجھے۔ میں نے تمہیں کتنے وظائف پڑھنے کو دیے تم بتاؤ تم نے ڈھنگ سے کوئی وظیفہ پڑھا۔''

بابا جمال الدین کی بات درست تھی۔ میں نے سنجیدگی سے ان کا بتایا ہوا کوئی بھی وظیفہ نہیں پڑھا تھا۔ میں نے بابا کے آستانے کے چکر لگانے سے زیادہ وظائف کو پابندی سے پڑھ لیا ہوتا تو شاید میرا کام بن جاتا۔ بابا کی بات سن کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ لوگوں کے کام ہونے میں بابا کی کرامت سے زیادہ وظائف پڑھنے سے لوگوں کے کام بنتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بابا جمال الدین کے کئی شاگردوں کے آستانے شہر میں کامیابی سے چل رہے تھے۔ میں بھی بابا کا شاگرد بن جاؤں تو میری ساری پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔ خود بخود لوگ میرے آستانے پر آ کر تحفے تحائف اور نذرانے دینے آنے لگیں گے۔ مالی پریشانی بھی دور ہو جائے گی۔

''بابا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے اپنی شاگردی

میں لے لو۔'' میں نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

بابا جمال الدین کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ میری بات سن کر مسکرائے۔

''مجھے تمہیں اپنا شاگرد بنانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تمہارے پاس جو فالتو وقت ہو اس وقت جپ کرو۔'' بابا جمال الدین نے کہا۔

بابا جمال کا زیادہ تر وقت وظائف و درود پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ وہ بہت کم بات کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس اپنے کاموں کے سلسلے میں لوگوں کے صبح و شام کے اوقات میں آنے کا وقت مقرر تھا۔ آنے والوں سے میں پہلے ہی ان کے مسائل پوچھ لیا کرتا تھا۔ آنے والوں کے مسائل چند ہی تھے۔ دشمنی، پسند کی شادی میں رکاوٹ دور کرانا، بے روزگاری، بے اولاد ہونا، ساس کو قابو میں کرنا، ساس کا بہو کو اپنے قابو میں کرنا، بچوں کی بیماری، محبوب کی بے وفائی، میں ان کے مسائل سن کر بابا جمال الدین کو بتا دیتا۔ جب وہ بابا کے پاس جاتے اور بابا ان سے پوچھے بغیر ان کا مسئلہ بیان کرتے تو ان پر حیرت طاری ہو جاتی کہ بابا نے بغیر پوچھے ہی بتا دیا کہ انہیں کیا مسئلہ درپیش ہے۔ بابا تو بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ آنے والوں کو مرعوب کرنا آستانے کو کامیابی سے چلانا واقعی میں بڑا فن ہے۔ جسے یہ سب آتا ہے اس کا آستانہ کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

بابا جمال الدین کی شاگردی میں رہ کر مجھے بھی یہ فن آ گیا تھا اور میرا ابھی زیادہ وقت وظائف پڑھنے میں صرف ہونے لگا تھا۔ بابا مجھ سے بہت خوش تھے۔ وہ اب مجھ سے کچھ رقم لینے کے بجائے دینے لگا تھا۔ جس سے وقتی طور پر میری مالی مدد ہو جاتی تھی۔ بڑھتی مہنگائی میں جب بابا کی دی ہوئی رقم میں گزارہ مشکل ہونے لگا تو مجھ میں آستانہ کھولنے کی خواہش شدت پکڑنے لگی۔ جب میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بالکل بھی برہم نہیں ہوئے اور مسکرائے۔

''تم نے میری بڑی خدمت کی ہے تم اپنا آستانہ کھول لو اس سے بڑھ کر میرے لیے کیا خوشی ہوگی۔ تم ضرور اپنا آستانہ کھولو۔ آستانہ کھولنے کے لیے وظائف کی پابندی ضروری ہے۔ وظائف کی برکت سے تمہارے آستانے پر آنے والے لوگوں کی جب مرادیں پوری ہوں گی تو وہ تمہاری عزت کریں گے تمہیں آسیب و جنات کو قابو کرنے میں کوئی پریشانی ہو تو بلا جھجک میرے پاس چلے آنا جو بھی پریشانی درپیش ہو بتا دینا میرے پاس ایسے ایسے وظائف ہیں جو جنات آسانی سے کسی لڑکی کا پیچھا نہیں چھوڑتا وہ ان وظائف سے ایسے بھاگتا ہے کہ پھر پلٹ کر نہیں آتا۔''

میں نے دل میں سوچا کہ بابا جمال الدین میری مدد کریں یا نہ کریں اس نے مجھے آستانے کی اجازت دے دی ہے میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔ بابا جمال الدین پر بزرگی بہت زیادہ آ گئی تھی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ان کے پاس جو علم ہے وہ ان کے شاگردوں کے کام آئے۔ ان کے کئی شاگرد اپنے اپنے آستانے بڑی کامیابی سے چلا رہے تھے۔ آستانے کو چلانے میں انسانی نفسیات کا ماہر ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ بابا جمال الدین کے پاس رہ کر انسانی نفسیات سے کھیلنا بہت اچھا آ جاتا ہے۔ بابا کے شاگردوں کے آستانے دیکھ کر مجھے آستانہ کھولنے کا خیال آیا تھا۔

مجھے بالکل بھی یہ امید نہیں تھی کہ میرے آستانہ کھولنے کی سب سے زیادہ مخالفت بیگم کرے گی۔ لیکن میں نے بیگم کی مخالفت کی کوئی پروا نہیں کی اور

آستانہ کھولنے کا مکمل ارادہ کرلیا۔ میرے آستانہ کھولنے کے ارادے پر بیگم گویا پھٹ پڑی۔

"تم آستانہ کیوں کھولنا چاہتے ہو؟"

"بیگم بات یہ ہے کہ میری دھوبی کی دکان بالکل ختم ہوگئی ہے۔ اس میں کرایہ نکالنا ہی مشکل ہوگیا ہے۔ بابا جمال کی طرف سے مالی مدد ہوتی ہے اس سے مہنگائی کے اس دور میں گزارا کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔" میں نے اس کو سمجھایا۔

"اگر آستانہ نہیں چلا تو ہم اس روکھی سوکھی کھانے سے بھی جائیں گے۔" بیگم نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"بیگم کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔"

"میرے تو نصیب ہی پھوٹ گئے تم سے شادی کرکے۔ سوچا تھا شادی کے بعد سکھ ملے گا لیکن سکھ تو دور کی بات یہاں کھانے کے لالے پڑے رہتے ہیں۔"

"بیویاں شوہروں کے حوصلے بڑھاتی ہیں تم کیسی بیوی ہو جو میرا حوصلہ کم کررہی ہو۔" میں نے غصے سے بیگم کو دیکھا۔

"حوصلہ ایسے شوہروں کا بڑھایا جاتا ہے جن سے کچھ امید ہو تم سے اپنی دھوبی کی دکان چلی نہیں آستانہ کھولنے کو چلے ہو۔" بیگم نے طنز کیا۔

"بیگم یہ وقت بتائے گا تم پہلے سے قیاس آرائی مت کرو۔" میں نے غصے سے کہا۔

میرے غصہ کرنے پر بیگم خاموش ہوگئی لیکن اس کا چہرہ بتارہا تھا کہ وہ مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہے۔

مجھے اپنے آستانے کی کامیابی کی اس لیے امید تھی کہ میری جس مارکیٹ میں دھوبی کی دکان تھی اس مارکیٹ میں کئی دکانیں مختلف لوگوں کے آستانے میں تبدیل ہوچکی تھیں۔ ان آستانوں پر بابا ہونے سے لوگوں کی آمدورفت بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ ان آستانوں پر لوگوں کی آمدورفت کیوں نہ ہوتی انہوں نے اپنے سائن بورڈ پر جو عبارتیں لکھوائی تھیں، کمزور عقیدہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے میں کشش رکھتی تھیں۔ ان عبارتوں کو پڑھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ ان آستانوں کی کامیابی میں ان عبارتوں کا زیادہ کمال ہے۔ دھوبی کی دکان ختم کرکے آستانہ کھولنے پر میں بہت پرامید تھا۔ اس عمارت میں جتنے بھی آستانوں کے سائن بورڈ پر جو عبارتیں لکھی ہوئی تھیں ان سے بڑھ کر میں نے دعوے کیے تھے۔ اگر کوئی کمزور عقیدہ ایک بار میرے سائن بورڈ کی عبارت پڑھ لے تو وہ آگے نہ بڑھ سکے اور سیدھا آستانے کے اندر چلا آئے۔ کئی دن گزر گئے ایک بھی گاہک نہ آسکا تھا۔ میں پھر بھی پرامید تھا حالانکہ گھر جانے پر مجھے بیگم کی خوب کھری کھری سننا پڑ رہی تھیں۔ بے کار اور نکھٹو جیسے طعنے سننے پڑ رہے تھے۔ لیکن میں ان طعنوں سے بالکل بھی نہیں گھبرا رہا تھا۔ کیونکہ میں خواتین کی نفسیات سے بخوبی واقف ہوچکا تھا۔ جب سے بیگم گھر میں آئی تھی زیادہ ہی عورتوں کی نفسیات سمجھنے لگا تھا۔ گھر میں پیسوں کی ریل پیل ہونے پر وہ خوش رہتی ہیں جیسے ہی پیسوں کی تنگی آئے وہ مردوں کو بے کار اور نکھٹو جیسے طعنے دینے میں دیر نہیں کرتیں۔ مجھے پوری امید تھی جیسے ہی آستانہ چل نکلتا ہے بیگم کی نظر میں مجھ سے اچھا کوئی نہیں ہوگا۔ دو ہفتے بڑے ہی خراب گزرے پھر میرا کام چل نکلا۔ حالات کے ستائے ہوئے غم کے مارے لوگ میرے آستانے پر آنے لگے تھے۔ ان کے قدم آستانے پر پڑتے ہی مجھ پر نوٹوں کی تو بارش ہوگئی تھی۔ بابا جمال الدین کے آستانے سے جو سیکھا تھا وہ اب کام آنے لگا تھا۔ نوٹوں کے دم سے گھر میں خوش حالی آگئی تھی۔ بیگم جو مجھ سے روٹھی روٹھی رہتی تھی اب خوش رہنے لگی تھی۔

بندش میں مجھے بابا جمال الدین سے مدد لینی پڑتی تھی خاص کر ایسے مسئلے جن میں آسیب عورتوں کو تنگ کرتے ہیں اور آسانی سے قابو نہیں آتے۔ اب میں خطرناک سے خطرناک آسیب کو آسانی سے بھگا دیتا تھا۔ جو بھاگتا نہیں تھا اسے اپنے عمل سے جلا کر بھسم کردیتا تھا۔

آج بھی اپنے آستانے پر میں بیٹھا ہوا تھا اور آئے ہوئے لوگوں کے مسائل سن رہا تھا اور انہیں تعویذ دے کر رخصت کررہا تھا آج زیادہ تر ایسے ہی لوگ آئے ہوئے تھے۔ جن کے کاروبار میں کسی نے بندش کرادی تھی چلتا کاروبار ختم ہوکر رہ گیا تھا۔ جس کا کاروبار ختم ہوجائے اس کا پھر دل دکان پر بیٹھنے کو کہاں کرتا ہے۔ بابا جمال نے کاروباری بندش کو توڑنے کے لیے بڑے اچھے تعویذ دیے ہوئے تھے۔ جو میرے کام آرہے تھے۔ یہ تعویذ میں نے جس بھی شخص کو دیے تھے اس کا کاروبار پھر سے چمک اٹھتا تھا اور وہ میرا مرید بن جاتا تھا۔

ایک نیم حکیم سا آدمی ایک عورت اور ایک لڑکی آستانے میں داخل ہوئے۔ ان کے آستانے پر آنے سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی اور بھی مخلوق ہے جو آستانے میں داخل ہونا چاہتی ہے لیکن میری عادت ہے میں آستانے میں داخل ہوکر حصار باندھ لیتا ہوں اس کی بدولت میں آسیبی طاقتوں سے محفوظ رہتا ہوں۔ آسیبی طاقتیں اپنی کوشش کے باوجود مجھ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ مجھے آسیبی مخلوق کی بے بسی پر ہنسی آرہی تھی۔ وہ مخلوق اندر آنے کو کس قدر بے چین ہے لیکن میرے حصار کی بدولت بے بس ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ تینوں میرے قریب آکر بیٹھ گئے تھے۔ لڑکی کی حالت بڑی خراب تھی آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے کی رنگت زرد ہورہی تھی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ نا جانے وہ کب سے بیمار ہو۔

"بابا ہماری بیٹی......!" آدمی نے کہنا چاہا۔

"ہاں میں نے وہ مخلوق دیکھ لی ہے جو اس لڑکی کو ستا رہی ہے وہ تمہارے ساتھ یہاں تک آگئی ہے لیکن اس مخلوق کی میرے آستانے کے اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں ہورہی ہے۔" میں نے کہا۔

"بابا ہماری بیٹی کا کسی طرح سے اس آسیبی مخلوق سے پیچھا چھڑا دو۔" آدمی نے کہا۔

"بابا ہماری پھول سی بیٹی کا اس مردود آسیبی مخلوق نے کیا حال کردیا ہے۔ یہ دیکھیں کیسی بیٹی تھی ہماری۔" عورت نے ایک تصویر دکھائی۔

تصویر دیکھ کر میں خود حیران رہ گیا کہ واقعی تصویر والی لڑکی کھلتے گلاب کی مانند تھی جبکہ میرے سامنے جو لڑکی بیٹھی تھی وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی تصویر دیکھ کر مجھے خود اس لڑکی پر افسوس ہورہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ لڑکی کو اس آسیبی مخلوق سے نجات دلانا ہے۔

"تم نے بہت اچھا کیا کہ اس کو یہاں لے آئے ہو۔ بے فکر رہو میں ایک تعویذ دے رہا ہوں لڑکی کے گلے میں ڈال دینا اور دو بوتلیں پانی کی دے رہا ہوں انہیں لڑکی کو پلانا بھی ہے اور گھر میں چھڑکنا بھی ہے۔" میں نے تعویذ اور بوتلیں دیتے ہوئے کہا۔

وہ آدمی جس نے اپنا نام داؤد اور بیٹی کا نام صائمہ بتایا تھا اپنی بیوی کے ساتھ خوشی خوشی چلا گیا لیکن آستانے سے جاتے ہوئے ہزار کے تین نوٹ میرے نذرانے کے ڈبے میں ڈالنا نہیں بھولا تھا۔ نذرانے کے طور پر اتنی رقم ڈالنے والا کوئی عام آدمی تو

نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پیسے والی اسامی تھی، میں لالچی نہیں تھا لوگ جو بھی نذرانے دے جاتے تھے اس پر خوش اور شاکر رہتا تھا۔ ان کے جانے پر وہ آسیبی مخلوق بھی چلی گئی تھی۔ وہ مخلوق مجھے بہت غصے میں دکھائی دے رہی تھی لیکن مجھے اس کی بالکل بھی پروا نہیں تھی۔ ایسی آسیبی مخلوق کا مقابلہ کرتے کرتے مجھے عادت ہو گئی تھی حالانکہ ابتدا میں بہت ڈرتا تھا کہ آسیب مجھے نقصان نہ پہنچا دے زیادہ تر آسیبی مخلوق میں جنات ہوتے ہیں جو بہت طاقتور ہوتے ہیں جہاں ان کا بس چلے وہ انسان کو چت کر دیتے ہیں وہ مخلوق اتنی آسانی سے لڑکی کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ مجھے لڑکی کا پیچھا چھڑانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑے گی۔ اس محنت کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ زیادہ تر آستانہ چلانے والے اس نوعیت کے مسائل سے اپنی جان چھڑا لیتے ہیں یا کسی دوسرے کے پاس بھیج دیتے ہیں۔

رات میں نے جب استخارہ نکالا تو مجھے کچھ عجیب سا منظر دکھائی دیا۔ یہ منظر دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا کچھ گڑبڑ تھی۔ صبح ہونے پر لڑکی کو دیا ہوا تعویذ میرے پاس آ گیا۔ جو اس بات کا ثبوت تھا اس آسیبی مخلوق نے کچھ ایسا عمل کیا ہے کہ لڑکی نے خود بخود وہ تعویذ اپنے گلے میں اتار پھینکا ہے۔ اکثر جنات ایسا کرتے ہیں کہ جس لڑکی پر عاشق ہو جائیں تو وہ نہیں چاہتے کہ آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑ دیں۔ اس مقصد کے لیے لڑکی سے وہ جھوٹ بولتے ہیں کہ اگر وہ تعویذ گلے سے اتار دے تو اس کا پیچھا چھوڑ دیں گے لیکن تعویذ اتروانے پر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے صرف دھوکا دیتے ہیں۔

وہ دونوں اپنی بیٹی کو لے کر آئے تو وہ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی پریشانی میں سمجھ گیا۔ لڑکی کے والد داؤد نے ابھی مجھے کچھ بتانے کے منہ کھولا ہی تھا کہ میں بول پڑا۔

"گھبراؤ نہیں تمہاری بیٹی نے اپنے گلے تعویذ نکال کر پھینکا تھا وہ مجھ تک واپس پہنچ صائمہ نے گھر والوں کو زیادہ پریشان کیا ہو گا۔" نے کہا۔

"ہاں، اس نے واقعی ہمیں پریشان کر دیا ہے۔ کہتی ہے کہ ہم اس کا علاج نہ کرائیں۔"

"لڑکی نہیں وہ آسیبی مخلوق ہے جو صائمہ علاج نہیں کرنے دیتی ہے تم بے فکر رہو۔ تمہاری کا علاج ہو جائے گا لیکن مجھے کچھ معلومات چا اس کے بغیر میں صائمہ بیٹی کا علاج نہیں کر پاؤں گا میں نے کہا۔

"آپ پوچھیں ہم سب بتائیں گے جو ہمارے علم میں ہے۔" داؤد نے کہا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا وہ بری مجھے نظر نہیں آئی اس کا مطلب ہے وہ یہاں آ سے کترا رہی تھی۔

"مجھے ایک نوجوان نظر آ رہا ہے جو پھانسی پر لٹکا ہے ایک لڑکی ہے جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔" میں نے استخارے میں جو نظر آیا تھا بیان کر دیا۔

داؤد کا ایک لمحے کو چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن قدرے مطمئن ہو گیا۔ وہ کچھ بتانے سے کترا رہا تھا کبھی اپنی بیٹی کو دیکھتا کبھی میری طرف دیکھتا۔ میں اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ وہ اصل حقائق بتانے ہچکچا رہا تھا۔ حقائق چھپانے پر میرے لیے صائمہ کا علاج ممکن نہیں ہوتا تھا۔

"جو منظر آپ کو دکھائی دیا ہے یہ بری آتما اس نوجوان کی ہے۔ اس نے جیل سے رہائی پر گھر

خودکشی کر لی تھی۔" داؤد نے خاموشی کو توڑا۔

"وہ جیل کیوں گیا تھا اور خودکشی کرنے کی وجہ کیا تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میرے والد میاں جی کو اصل حقائق کا علم ہے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ بیان کر سکیں۔"

"کیوں انہیں کیا ہوا ہے؟"

"میاں جی سب سے پہلے اس بری آتما کا شکار بنے تھے۔ ان پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ پھر اس بری آتما نے صائمہ بیٹی کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ کئی جگہ اس کا روحانی اور طبی علاج کرایا لیکن اس نوجوان کی بری آتما صائمہ کو ٹھیک نہیں ہونے دیتی۔ جب بھی صائمہ کے گلے میں تعویذ ڈالا جاتا ہے وہ دوسرے دن غائب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹری دوائیں صائمہ ایسے کھا جاتی ہے جیسے کھانا کھا رہی ہو۔ ہفتے بھر کی دوا ایک دن میں ختم کر دیتی ہے۔ دوائیاں کھانے پر ٹھیک ہونے کے بجائے سوکھ کر لکڑی ہوتی جا رہی ہے۔" داؤد نے بتایا۔

"اس لڑکی کا کیا قصہ ہے۔" میں نے پوچھا۔

میں چاہ رہا تھا کہ تفصیل سے مجھے معلومات مل جائے اس لیے میں داؤد کو کرید رہا تھا۔

"وہ لڑکی نجمہ ہے بری آتما نبیل کی بہن۔ نبیل کو جب چوری کے مقدمے میں جیل ہو جانے پر وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ میاں جی نے ترس کھا کر نجمہ کو گھر کے کام کاج کے لیے رکھ لیا تھا۔ ایک دن جب وہ کام پر نہیں آئی تو ہمیں تشویش ہوئی۔ ہمارے پرانے خادم نور خان کو نجمہ کے گھر بھیجا۔ نجمہ گٹھڑی بنی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی جب بولنے پر اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تو نور خان نے اسے ہلا کر دیکھا وہ مر چکی تھی۔ ہم نے ہی اس کی تدفین کی جب نبیل جیل سے سزا پوری ہونے پر آیا اور اسے بہن کی بے وقت موت کا

باکت کا علم ہوا اس رات نبیل نے خودکشی کر لی۔" داؤد نے کہا۔

"داؤد میاں مجھے تمہارے گھر چل کر دیکھنا ہو گا۔ میں رات وہیں گزاروں گا۔ پھر ہی کچھ بتا سکوں گا کہ صائمہ بیٹی کا علاج کس طرح ہو گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں جو آپ مناسب سمجھیں وہ کریں ہماری حویلی گاؤں میں ہے۔ جس دن آپ کا آنے کا پروگرام ہو فون کر دینا۔ میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔ وہ آپ کو گاڑی میں حویلی لے آئے گا۔" داؤد نے کہا۔

میں نے صائمہ کا تعویذ واپس اس کے گلے میں ڈال کر انہیں رخصت کر دیا۔ ایک کاغذ پر میں نے داؤد کا موبائل نمبر لکھ لیا۔ داؤد کی حویلی میں رات گزارنے کا میرا ایک خاص مقصد تھا۔ داؤد نے مجھے جو بات بتائی تھی اس پر میں مطمئن نہیں تھا۔ اس لیے میں داؤد کے گاؤں پہنچ گیا۔ اس کی حویلی بڑی شاندار تھی۔ حویلی میں میری خوب آؤ بھگت کی گئی۔ مختلف قسم کے کھانے تیار کیے گئے تھے۔ کھانے بڑے شاندار تھے۔ کھانا کھا کر طبیعت خوش ہو گئی تھی۔ رات سونے کے لیے میں جب اوطاق میں لیٹا میں نے جان بوجھ کر کمرے کا حصار نہیں باندھا تھا۔ صرف اپنی حفاظت کے لیے چارپائی تک کا حصار کیا تھا۔ اس طرح وہ بری آتما اندر آ سکتی تھی لیکن مجھے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میں بظاہر اس طرح لیٹا تھا کہ اوطاق کے اندر آنے والا شخص یہی سمجھے کہ میں سو رہا ہوں لیکن میں جاگ رہا تھا۔

داؤد کے والد میاں جی کو بھی میں نے دیکھ لیا تھا۔ واقعی اس کی حالت بڑی خراب تھی وہ نہ اپنی مرضی سے اٹھ اور بیٹھ سکتا تھا۔ نہ ہم اسے زندہ کہہ سکتے تھے اور نہ مردہ۔ نلکیوں کے ذریعے اس کے جسم میں خوراک دی جا رہی تھی۔ وہ چارپائی پر چت لیٹا ہوا

ہڈیوں کا ڈھانچہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ واقعی بڑی اذیت ناک صورت حال سے دوچار تھا۔

رات ایک بجے مجھے محسوس ہوا کہ میں جس کا منتظر تھا وہ شے آ گئی ہے۔ میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ اوطاق میں ایک نہیں دو روحیں تھیں۔ ایک روح کو میں جانتا تھا یہ وہی بری آتما تھی لیکن دوسری روح کو میں نہیں جانتا تھا۔

”تم اچھا نہیں کر رہے ہو اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ ورنہ تمہاری لاش یہاں سے جائے گی۔“ بری آتما شدید غصے میں دکھائی دے رہی تھی۔

”میں چلا جاؤں گا لیکن کچھ الجھن ہے میرے ذہن میں اسے دور کیے بنا نہیں جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے خودکشی کیوں کی اور داؤد کی بیٹی کو تم کیوں پریشان کر رہے ہو۔“

”داؤد کے والد میاں جی نے ہم دونوں بہن بھائیوں کی زندگی ختم کر دی ہے اور ہماری بے چین روحیں تسکین پانے کو اس خاندان کو پریشانیوں میں مبتلا رکھنا چاہتی ہیں۔“ بری آتما نے کہا۔

”میاں جی نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا جو ان کے خاندان کے دشمن بن گئے ہو۔“ میں نے کہا۔

”میری بہن بہت خوب صورت تھی گاؤں کا ہر نوجوان اس سے شادی کا خواہش مند تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد اس کی کفالت میرے ذمہ تھی۔ نجمہ پر میاں جی کی بری نیت تھی لیکن میرے ہوتے ہوئے وہ اپنی جنسی بھوک مٹا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے میاں جی نے مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے ڈرامہ رچایا۔ میں اس کے دوست منشی احمد کے پاس ملازم تھا۔ اس کی دکان میں مصنوعی چوری کا ڈرامہ رچا کر مجھے جال میں پھنسا دیا۔ مجھے چوری کے الزام میں ... ہو گئی۔ ادھر میاں جی نے ہمدردی حاصل کرنے کو ... کو اپنے یہاں نوکری دے دی۔ ایک رات میاں ... نے درندگی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنی جنسی بھوک ... کر نجمہ کا گلا گھونٹ دیا تا کہ اس راز سے پردہ نہ ... سکے۔ نجمہ کو مارنے کے بعد ہمارے گھر میں ... گٹھڑی کی شکل میں ایک کونے میں بٹھا دیا تا ... گاؤں کے لوگ سمجھیں کہ وہ کس چیز سے خوفزدہ ہو ... خوف کے مارے مر گئی ہے۔ میں جب جیل سے ... ہو کر گاؤں آیا اور نجمہ کے انتقال کی خبر سن کر ... اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے چور بنا کر جیل بھجوایا گیا تھا۔ لیکن میں اپنے شک کو دور کرنے میاں جی کی او... میں چلا گیا۔ رات کا وقت تھا میاں جی حقہ پی رہے تھے۔ میں نے جب میاں جی کے سامنے شور ... کرنے کو منہ کھولا تو یہ بات اسے اچھی نہیں لگی۔ ... نے اپنے آدمیوں کو آواز دی۔ وہ تیزی سے دوڑ... دوڑے آئے اور میاں جی کے اشارے پر مجھے ... لیا۔ میاں جی غصے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ... میرے پاس آئے اور غصے سے بولے۔

”آج تک میرے سامنے کسی کی اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ منہ کھول سکے تمہاری بہن کی طرح آج موت تمہارا مقدر بن گئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں ... ایک نوجوان کو اشارہ دیا۔ اس نے ایک ڈوری میری گردن میں ڈال دی۔ میں خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کر رہا تھا لیکن انہوں نے مجھے مضبوطی ... پکڑا ہوا تھا۔ میاں جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں نے آج تک جو چاہا ہے اسے پا کر رہا ہو... میں تمہاری بہن کو جان سے نہیں مارتا لیکن اس ... مجھے دھمکی دی تھی کہ وہ اپنی عصمت دری کی خبر پو... گاؤں کو بتائے گی اور میں کسی بھی صورت اپنی ر... نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے نجمہ کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔ یہ بات میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں تا کہ روح پرسکون ہو جائے۔“

یہ کہتے ہوئے میاں جی نے ڈوری پکڑے ہوئے نوجوان کو اشارہ کیا اور اس نے رسی کو میری گردن پر تنگ کرنا شروع کی اور میں نے تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دی۔ اس دن سے میری روح بے چین ہے میری روح کو جب تک قرار نہیں آئے گا جب تک میاں جی کے خاندان کا ایک ایک فرد ہلاک نہ ہو جائے۔ میاں جی کی حالت دیکھ لو۔ وہ نا زندوں میں ہے نا مردوں میں ہے۔ اس کی پوتی اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے۔“

”کیوں نجمہ میاں جی کے خاندان نے تمہارے ساتھ برا سلوک کیا تھا۔“ میں دوسری روح سے مخاطب ہوا۔

”نہیں میاں جی کے خاندان کے لوگوں کا مجھ سے ایسا سلوک تھا جیسے گھر والے کرتے ہیں۔“ نجمہ کی روح نے کہا۔

”دیکھو نبیل میاں جی کے خاندان نے تمہاری بہن کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی گھر والوں جیسا سلوک کیا تھا پھر بھی تم انہیں سزا دینا چاہتے ہو۔ میاں جی اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ کبھی بھی ان کی روح ان کا ساتھ چھوڑ سکتی ہے تمہارا انتقام پورا ہو چکا ہے۔ میاں جی نے جو تمہاری بہن کے ساتھ زیادتی کی ہے تم بھی میاں جی کے نقش قدم پر چلنے کے بجائے اس خاندان کو تنگ کرنے کا عمل چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ یہی انسانیت کا تقاضہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس خاندان سے بھرپور انتقام لوں گا۔“ نبیل کی روح نے کہا۔

”پھر مجھے وہ عمل کرنا پڑے گا جس سے تم دونوں کی روحیں جل بھن کر ختم ہو جائیں گی۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”ہاں بھلے ہو جائیں ہم اس خاندان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔“

”ٹھیک ہے میں اپنا عمل شروع کر رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے بری آتماؤں کو جلا کر بھسم کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ ابھی مجھے چند منٹ ہی ہوئے تھے وہ دونوں روحیں چیخ اٹھیں۔

”خدا کے لیے یہ عمل ختم کر دو ہم دونوں یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے اور پھر کبھی پلٹ کر نہیں آئیں گے۔“

ان کی یقین دہانی پر میں نے اپنا عمل روک دیا۔

وہ دونوں روحیں اسی وقت کمرے سے چلی گئیں۔

صبح ہونے پر میں ناشتا کر کے شہر چلا آیا۔ داؤد کو یہ یقین دہانی کرا کے کہ اب بری آتما اس کی بیٹی صائمہ کو تنگ نہیں کرے گی۔

دو ہفتے گزرنے کے بعد داؤد اپنی بیٹی کے ساتھ میرے آستانے پر آیا تو صائمہ پہچان میں نہیں آ رہی تھی۔ صحت یاب ہو کر وہ پھول کی مانند کھل اٹھی تھی۔ میں اسے دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ ایک بری آتما سے صائمہ اور اس کے خاندان کی جان چھوٹ گئی ہے۔

کندن

محترم مدیر نئے افق'

السلام علیکم!

قدرت کا ایک اصول ہے کہ وہ دنیا میں نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور بد کرداروں کے لیے ان ہی جیسی بیویاں دیتا ہے البتہ کبھی کبھار آزمائش کے لیے اس کا الٹ بھی کر دیتا ہے۔ زیر نظر کہانی ایک خود دار باپ کے غیرت مند بیٹے کی ہے جو عملی زندگی میں کس طرح اپنے باپ کی تربیت کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا اور اس نے ایسا کر بھی دکھایا۔ مجھے امید ہے یہ کہانی آپ کے اور خاص طور پر قارئین کے معیار پر پوری اترے گی۔

والسلام

محمد ثاقب عباس

میں ایک مقبول گیت گنگناتے ہوئے اپنے باتھ روم میں شیو بنا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی سنائی دی۔ میرے پاپا نے فوراً ہی ریسیور اٹھالیا۔ وہ کال میرے لیے تھی۔ پاپا نے مجھے آواز نہیں دی بلکہ اپنی عادت کے مطابق فون کرنے والے کو ہولڈ کرا کے خود میرے کمرے میں آگئے"ارسلان بیٹا' اعجاز کا فون ہے تمہارے لیے۔"

"تھینک یو پاپا' بس ایک منٹ میں آتا ہوں' تب تک آپ اس سے گپ شپ کریں۔" میں نے جلدی جلدی شیو کرتے ہوئے کہا۔

پاپا نے اعجاز سے چند ایک باتیں ہی کی تھیں کہ میں وہاں پہنچ گیا"ہاں اعجاز' کیا حال چال ہے؟"

"ٹھیک ہوں یار' اور سناؤ کیا ہو رہا ہے؟"

"بس ایم بی اے میں داخلے کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔" میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"کہاں کہاں اپلائی کر رہے ہو؟" اعجاز نے پوچھا۔

"اپلائی تو کئی جگہ کر رہا ہوں لیکن میری پہلی ترجیح پریسٹیج یونیورسٹی آف بزنس ہی ہے۔"

"لیکن وہ تو بہت مہنگی ہے یار' کم از کم چار پانچ لاکھ کا خرچہ ہے۔" اعجاز نے حیرانی اور تشویش کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

"ہاں یار' پرائیویٹ یونیورسٹی ہے نا' لیکن ان کا اسٹینڈرڈ بھی تو انٹرنیشنل لیول کا ہے۔ فائنل ٹرم ختم ہونے سے پہلے ہی نوکری کی آفرز آنے لگتی ہیں۔"

"بات تو یہ بالکل سچ ہے یار۔ وہاں سے ایم بی اے کر لیا تو فیوچر بن جائے گا تیرا۔" اعجاز کے لہجے میں حسرت سی پوشیدہ تھی۔

"تو میرے بھائی' تجھے فیوچر بنانے سے کس نے روکا ہے؟ میرے ساتھ ایڈمیشن لے لو۔"

"نہیں دوست' مجھے تو اب نوکری تلاش کرنا ہے اور وہ بھی جلد از جلد۔ سائرہ کے والدین شادی کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔"

"لیکن اعجاز جانی' یہ تو سوچو کہ بی کام کی بنیاد پر تجھے کون سی معقول نوکری مل سکتی ہے؟ میں جانتا ہوں سائرہ کے ماں باپ بڑی مشکل سے اس رشتے پر آمادہ ہوئے ہیں لیکن اب ان کی بیٹی کا مستقبل تم سے وابستہ ہے۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

"اپنے ساس سسر کو اعتماد میں لو۔ انہیں سمجھاؤ کہ تمہیں دو تین سال کی مہلت چاہیے کیوں کہ تم ان کی بیٹی کو روشن مستقبل دینا چاہتے ہو۔ مجھے یقین ہے وہ لوگ مان جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے یار' تم کہتے ہو تو بات کر کے دیکھ لیتا ہوں۔" اعجاز نے کہا۔

"ان کا جو بھی جواب ہو مجھے ضرور بتانا' ضرورت پڑی تو میں بھی بات کروں گا ان سے۔"

"ٹھیک ہے۔ اچھا اب اجازت۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ کر گنگناتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

پاپا میری اور اعجاز کی گفت گو غور سے سن رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر گہری سوچ اور فکر کی سلوٹیں نمایاں تھیں۔ کچھ دیر بعد میں کرکٹ کی کٹ پہنے کمرے سے برآمد ہوا"پاپا' آج ہمارا سیمی فائنل ہے شام تک واپسی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ رکھ لو۔" پاپا نے سو کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پاپا پیسے ہیں میرے پاس' مجھے ابھی ضرورت نہیں ہے۔"

"رکھو یار شام تک آؤ گے' ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

میں نے نوٹ جیب میں ڈال کر دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی نے روک لیا"السلام علیکم' آپ کون؟" میں نے ریسیور اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی' اب کیوں پہچانو گے ہمیں۔ آخر ماشاء اللہ کے بندے بن چکے ہو' اونچی ہواؤں میں اڑنے کا حق ہے۔" ایک رسیلی نسوانی آواز نے گلہ کیا۔

"اوہ' تم رخسانہ ہو نا؟ دراصل فون پر بات بھی تو بہت کم ہوتی ہے ہماری۔"

"چلو اب تمہاری یہ شکایت بھی دور ہو جائے گی۔" رخسانہ نے ناز و انداز سے بھرپور لہجے میں بتایا"لندن نے اجازت دے دی ہے تم سے بات کرنے کی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ آخر کزن ہیں ہم۔"

"صرف کزن؟" رخسانہ نے استفسار کیا۔

"فی الحال تو یہی رشتہ ہے ہمارے درمیان۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"لیکن لماں تو ہماری منگنی کی بات کرنے والی ہیں تمہارے پاپا سے۔"

"یہ ان بزرگوں کا معاملہ ہے' فی الحال تو میں تم سے اجازت چاہوں گا۔ ایک اہم میچ ہے میرا۔ امید ہے تم مائنڈ نہیں کرو گی۔"

"ٹھیک ہے' میں پھر کسی وقت فون کر لوں گی۔" رخسانہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

......☆☆☆......

پاپا ناشتہ تیار کر رہے تھے کہ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔

"ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میچ کی تیاری پکڑو نا!"

"آج ریسٹ ڈے ہے پاپا' فائنل کل ہوگا۔" میں نے بتایا۔

"ریسٹ ڈے ہے تو بیٹا جی اپنے کمرے میں ریسٹ کرو۔ ناشتا تیار ہو گیا تو آواز دے کر بلا لوں گا۔"

"کوئی ریسٹ ویسٹ نہیں۔ آج میں بھی ناشتا بنواؤں گا آپ کے ساتھ بلکہ دوپہر کا کھانا بھی۔ آج کا دن پاپا جانی کے نام۔"

"یعنی آج کا پورا دن میرے بھیجے کی دھجیاں بکھیرتے گزارو گے۔ ٹھیک ہے لیکن میری سلطنت یعنی کچن میں دراندازی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں اکیلا ہی ٹھیک ٹھاک کھانا بنانے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔"

"اوہ نو پاپا' ڈونٹ بی سیلفش۔" میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ اس پر پاپا چونکے"سیلفش سے یاد آیا آج تو فش فرائی ڈے ہے' تم ناشتے کے بعد مجھے ایک کلو پاپلیٹ لا دو۔"

"یو مین پامفریٹ پاپا؟" میں نے خالص

امریکن لہجے میں پوچھا۔
''ارے یار پہ مغربیت کہہ لو یا پاپلیٹ' آخر اسے آنا تو پلیٹ میں' بلکہ پیٹ میں ہی ہے نا۔''
ناشتے کے بعد پاپا نے پیسے میرے حوالے کرتے ہوئے تصدیق چاہی''یاد ہے نا؟ ایک کلو پاپلیٹ۔ تازہ۔ بھاؤ تاؤ کر کے؟''
''بالکل یاد ہے سر' خادم کی یادداشت اتنی بھی خراب نہیں کہ'' مجھے خیال آیا''اوہ مائی گاڈ' مجھے تو یاد ہی نہیں رہا' ٹھیک دس بجے اعجاز کا فون آنے والا ہے۔ وہ اپنے ساس سسر سے مذاکرات کا نتیجہ بتانے گا مجھے۔''
''تم فٹافٹ جاؤ اور مچھلی لے کر الٹے پاؤں لوٹ آؤ۔ میں کہہ دوں گا اعجاز سے گھنٹے بھر بعد فون کر لے گا۔ دیر ہو جائے تو اچھی مچھلی ختم ہو جاتی ہے۔''
''نہیں پاپا' اس بے چارے کے مستقبل کا سوال ہے۔ میں اس سے بات کر کے چلا جاؤں گا۔'' میں نے خلافِ عادت اصرار کیا۔
''اچھا بھئی' جیسے تمہاری مرضی۔'' پاپا نے دھیرے سے کہا۔
پھر دونوں باپ بیٹے اخبار بینی میں مشغول ہو گئے۔ تاہم پاپا وقفے وقفے سے گھڑی دیکھ رہے تھے۔ دس بج گئے لیکن فون کی گھنٹی نہیں بجی۔ میں نے کھیلوں کے صفحے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا''اس سیریز میں تو کئی ینگ پلیئرز کو چانس دے رہے ہیں۔ آخر عقل آ ہی گئی بورڈ والوں کو۔''
''یار نہیں تو عقل آ گئی لیکن تمہارا فون نہیں آیا۔ دیر سے جاگنے کا عادی تو نہیں ہے یہ اعجاز؟''
''نہیں پاپا' اس کا فون بس آنے ہی والا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ مچھلی مل جائے گی۔'' انھوں نے گردن ہلائی اور ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی جو سوا دس کا وقت دکھا رہی تھی۔ میں نے پاپا کے بار بار گھڑی دیکھنے کو بھانپتے ہوئے شرارتی لہجے میں پوچھا''کیا آپ کو بھی کسی کے فون کا انتظار ہے؟ سچ سچ بتائیے' کوئی ٹیلی فونک افیئر؟''
''فضول بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔''
عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں ایک جست لگا کر دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر بوسیدہ قمیص شلوار میں ملبوس ایک لمبا تڑنگا شخص کھڑا تھا جس کی کلائی پر رڈو گھڑی اور انگلیوں میں سونے کی موٹی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔
''جی فرمایئے؟'' میں نے روکھے لہجے میں سوال کیا۔ وہ شخص گہری نظروں سے مکان کے در و دیوار کا جائزہ لے رہا تھا''تیرا باپ ہے گھر پے؟ اسے بول گلاب خان آیا ہے۔''
''پاپا سے کوئی کام ہے آپ کو؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔
''ہاں بھئی کام ہے۔ ویسے ہی گھومنے تو نہیں آئے ہم۔'' گلاب خان نے اکھڑ لہجے میں کہا''تیرے باپ نے فون کر کے بلوایا ہے۔''
اسی اثنا میں پاپا بھی دروازے پر پہنچ گئے''ارے خان صاحب آپ؟ اندر تشریف لایئے نا۔''
''یہ ہیرو راستہ دے جبھی تو اندر قدم رکھے گا' پتا نہیں میرے کو کیا سمجھ رہا ہے۔''
''ارے بھائی گلاب خان ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ ارسلان تم خان صاحب کے لیے اچھی سی چائے بناؤ۔'' پاپا نے اسے بازو سے تھام کر گھر میں لاتے ہوئے کہا۔ گلاب خان اب بھی سر اٹھا اٹھا کر گھر کا جائزہ لے رہا تھا''مکان تو اچھا ہے پر قیمت کا اندازہ تم نے زیادہ لگایا ہے۔''
گلاب خان کی بات سن کر میں کچن کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پاپا گلاب خان کو خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میرے کچن میں جانے کے بعد پاپا نے دھیمے لہجے میں کہا''آپ نے گھر اچھی طرح دیکھ لیا ہے نا؟ اب باقی باتیں بعد میں طے کریں گے۔ ارسلان کے سامنے ذکر نہ کریں۔''
پاپا نہیں جانتے تھے کہ میں نے ان کی سرگوشی سن لی ہے۔ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔
چائے کا پانی چولھے پر رکھ کر میں نے کچن کی کھڑکی سے کان لگا کر اپنے پاپا اور گلاب خان کی بات سننے کی کوشش کی۔ گلاب خان اپنی آواز ہلکی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے الفاظ میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے''دیکھو جی' ڈھکی چھپی بات کی تو عادت نہیں میرے کو۔ مکان گروی رکھنے میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے تمہارا۔ چار لاکھ کے بدلے سات لاکھ دینا پڑے گا' پیسا وقت پر نہیں دیا تو مقدمے بازی' تھانہ کچہری الگ۔''
''لیکن مجھے رقم کی شدید ضرورت ہے۔'' پاپا نے مضطرب لہجے میں کہا''اور وہ بھی ایک ڈیڑھ ہفتے کے اندر۔''
''تو پھر میری بات مانو بھائی صاحب' بیچ دو یہ مکان۔ چار لاکھ سے اپنی ضرورت پوری کرو' باقی کسی کاروبار میں لگا دو۔ مکان تو پھر بھی بن سکتا ہے۔'' گلاب خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
''ایک ہفتے میں مکان کی پوری قیمت مل جائے گی؟''
''چار لاکھ کا بندوبست ہے میرے پاس۔ دس لاکھ اگلے مہینے لے لینا۔''
''چودہ لاکھ تو بہت کم ہیں اس گھر کے۔'' پاپا نے تذبذب کے ساتھ کہا۔
''میری بات کا اعتبار نہیں تو مارکیٹ میں قیمت لگوا لو صاحب۔ کسی نے تیس چالیس ہزار زیادہ لگا بھی دیے تو سودا پکا ہونے اور پے منٹ میں بہت تاخیر ہو جائے گی۔''
''ٹھیک ہے' میں سوچ کر تمھیں جواب دوں گا۔''
پاپا نے مجھے چائے لاتے دیکھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔ کچھ دیر بعد وہ گلاب خان کو رخصت کر کے آئے تو مجھ سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ میں نے انھیں اخبار میں منہ چھپانے کا موقع نہیں دیا''پاپا' اس فیصلے کی یقیناً کوئی بہت بڑی وجہ ہو گی!''
''اوہ' تو تم سب کچھ سن چکے ہو' خیر میں تمھیں بتانے والا ہی تھا۔''
''ایسی کیا مجبوری پڑ گئی اچانک؟'' میں نے پوچھا۔ پھر میں نے چونک کر اپنے باپ کو دیکھا''کہیں میرے ایڈمشن کے لیے تو یہ سب کچھ نہیں کر رہے آپ؟''
انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
''لیکن آپ کی گریجویٹی وغیرہ؟''
''رفتہ رفتہ سب خرچ ہو گیا بیٹا۔'' پاپا کے لہجے کی بے چارگی میرے لیے اجنبی تھی''پینشن سے تو گھر کا راشن بھی پورا نہیں ہوتا' تمہاری پڑھائی کے اخراجات۔''
میں نے انھیں بات مکمل نہیں کرنے دی''لیکن پاپا آپ کم از کم مجھے بتاتے تو سہی۔''
''تمہارے لیے پڑھائی کا بوجھ کیا کم تھا؟ یہ پریشانی دماغ پر ہوتی تو اتنے اچھے نمبروں سے کیسے پاس ہوتے؟''
''پاپا میں جانتا ہوں ممی اور آپ نے کتنی محنت سے یہ گھر بنایا تھا۔ میں اسے بکنے نہیں دوں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
''تمہارے مستقبل سے بڑھ کر تو نہیں ہے یہ

گھر بہت جلد تم خود ایسا گھر بنوانے کے قابل ہو جاؤ گے۔'' انھوں نے کہا۔
''میں کل کی چکا چوند کی خاطر آج اپنے سر پر موجود چھت سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ آپ یہ ارادہ بالکل ترک کر دیں۔''
''لیکن تمھاری اعلیٰ تعلیم، تمھارا مستقبل؟'' پاپا کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔
''اعلیٰ تعلیم کے علاوہ مستقبل کا دارومدار محنت اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی پر بھی تو ہوتا ہے نا؟ پھر ہمت ہارنے کی کیا ضرورت ہے؟''
''اچھا بیٹا، جیسے تمھاری مرضی، میں منع کر دوں گا گلاب خان کو۔'' پاپا نے کہا۔
''آج اور ابھی یہ نیک کام کر دیں۔ آپ کی مجبوری کے دام کھرے کرنا چاہتا ہے وہ۔ کم از کم بیس لاکھ کا مکان چودہ لاکھ میں اینٹھنے کی کوشش میں ہے۔''
اسی اثنا میں فون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور کان سے لگایا ''السلام علیکم، ہاں بھئی اعجاز، کیا بنا تمھارا؟''
''تم نے صحیح مشورہ دیا تھا یار، میرے ساس سسر مان گئے۔'' اعجاز نے خوشی سے معمور لہجے میں بتایا۔
''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے بھائی، اب تیاری پکڑو ایڈمشن کی۔ پراسپکٹس اور داخلہ فارم مجھ سے لے لینا۔''
''لیکن تم تو ایک ہی فارم لائے تھے یار، تمھیں ایڈمشن نہیں لینا کیا؟''
پاپا دکھی نظروں سے مجھے اعجاز سے محوِ گفتگو دیکھ رہے تھے۔ ''نہیں یار، ارادہ تبدیل ہو گیا ہے میرا۔ تم فارم لینے آؤ گے تو تفصیل سے بتاؤں گا، او کے بیدار ہے، اللہ حافظ۔''
ریسیور رکھ کر میں نے پاپا کی طرف دیکھا جنھوں نے آنسو چھپانے کے لیے اخبار کی آڑ لے لی تھی۔
میں گھر کے دروازے کی طرف بڑھا، پھر مڑ کے پوچھا ''ایک کلو پاپڑ، تازہ، بس ابھی گیا ابھی آیا۔''
☆☆☆
''مجھے نوکری مل گئی پاپا، آخر کار!'' میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی نعرہ لگایا اور پاپا سے لپٹ گیا۔ میرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔
''مبارک ہو بیٹا۔ اللہ کا شکر ہے تمھاری مہینوں کی محنت رنگ لائی۔ کون سی فرم ہے؟ کیا بزنس کرتی ہے؟''
''بہت بڑی کمپنی ہے پاپا۔ ایس اے الیکٹرونکس!''
''تمھارا کیا کام ہو گا؟'' پاپا نے پوچھا۔
''کمپنی کی طرف سے خط و کتابت، آرڈرز کا ریکارڈ رکھنا اور کلائنٹس کی شکایات اور سوالات کا جواب دینا وغیرہ۔''
''یہ تو بہت محنت اور ذمے داری کا کام ہے، تنخواہ کیا ہے؟''
''اوپننگ تو سات ہزار سے ہو گی لیکن جلد نظرِ ثانی کا وعدہ کیا گیا ہے۔''
''چلو جو خدا کی مرضی۔ دل لگا کے کام کرو گے تو ترقی بھی ہو جائے گی۔''
☆☆☆
کام میرے اندازے سے کہیں زیادہ محنت طلب ثابت ہوا۔ مجھے تقریباً روزانہ دفتری اوقات کے بعد بھی رکنا پڑتا جس کے لیے مجھے کوئی اضافی ادائیگی نہیں کی جاتی تھی۔ اسی طرح روزانہ بارہ تیرہ گھنٹے کی ڈیوٹی نبھاتے پورا سال گزر گیا۔ کام کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا مگر تنخواہ میں اضافے کے کوئی آثار نہ تھے۔ میرا حوصلہ جواب دینے لگتا تو پاپا میری دل جوئی کرتے ''تم بس محنت اور خلوصِ نیت سے اپنا کام کیے جاؤ۔ نتیجے اور صلے کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو جو سب سے بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ کم از کم تجربے کی دولت

تو تمھارے اکاؤنٹ میں جمع ہو رہی ہے نا؟''
''اس میں تو خیر کوئی شک نہیں۔ اچھا ٹھیک ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔''
☆☆☆
رات کے نو بجے تھے۔ میں حسبِ معمول دفتر میں تنہا کام کر رہا تھا۔ پورے ہال میں صرف میری ٹیبل کی لائٹ روشن تھی۔ اس اثنا میں مجھے سیکیورٹی گارڈ کے کسی سے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ اچھا خاصا فاصلہ تھا لیکن سناٹے کی وجہ سے ایک ایک لفظ واضح طور پر میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا ''سلام سیٹھ صاحب۔ آپ اس وقت یہاں؟''
''وعلیکم السلام ولی محمد خان۔ وہ میرا ایک اہم فیکس آنے والا ہے ولایت سے۔ تم ذرا دفتر کھول دو۔''
''دفتر تو کھلا ہوا ہی ہے صاحب، آپ چلے جاؤ اندر۔'' ولی خان نے بتایا۔
''اس وقت دفتر کیوں کھلا ہوا ہے ولی محمد؟'' سیٹھ شجاعت احمد کے لہجے میں مالکانہ تحکم در آیا۔
''وہ اپنا ارسلان صاحب کام کر رہا ہے ٹیبل پر۔''
''ارسلان؟ وہ کون ہے؟ اچھا میں خود دیکھتا ہوں۔'' شجاعت احمد کے لہجے میں تجسس اور ناراضی کی آمیزش تھی۔ وہ اندھیرے ہال میں داخل ہوئے اور سیدھے میری ٹیبل پر پہنچ گئے۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ کچھ دیر جائزہ لینے کے بعد انھوں نے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ میں نے انھیں سلام کیا۔
''وعلیکم السلام، کیا نام بتایا تھا؟ ارسلان صاحب، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دفتر بند ہونے کے اتنی دیر بعد آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' شجاعت احمد نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔
''دراصل خط و کتابت میری ذمے داری ہے، بہت سے خطوط کا فوری جواب دینا ضروری ہوتا ہے۔ میں وہی کر رہا ہوں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔
''لیکن آپ کو اپنا کام دفتری اوقات کے دوران مکمل کر لینا چاہیے مسٹر ارسلان۔''
''سر خطوط، شکایات اور آرڈرز کی تعداد ماشاء اللہ اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ شام تک سب کے جواب دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر میں خطوط کے جواب پینڈنگ چھوڑ دوں تو اگلے روز دگنا کام اکٹھا ہو جائے گا۔'' میں نے وضاحت کی۔
شجاعت احمد نے اثبات میں سر ہلایا ''ہونہہ، اوور ٹائم تو دفتر میں بند ہے، کیا آپ کو کوئی ایکسٹرا پے منٹ ہوتی ہے؟''
''جی نہیں۔''
''او کے آپ اپنا کام کریں۔ مجھے ایک فیکس کا انتظار ہے، کچھ دیر رکوں گا۔''
میں دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ شجاعت احمد نے وقت گزاری کے لیے ایک فائل اٹھا لی ''اویس انٹر پرائزز۔ بھئی یہ تو بہت اچھے اور پرانے کلائنٹ ہیں ہمارے۔''
''جی سر، ان سے بڑی تعداد میں موٹرز کے آرڈرز ملتے ہیں۔''
شجاعت احمد نے پسینہ پونچھتے ہوئے مجھ سے پوچھا ''یار یہ تم نے اے سی کیوں بند کر رکھا ہے؟ کتنی گرمی ہے یہاں!''
''اصل میں سر مجھے اپنے اکیلے کے لیے اے سی چلانا اچھا نہیں لگتا۔ میرے گھر میں اے سی نہیں ہے، اس لیے مجھے پنکھے کے نیچے کام کرتے ہوئے زیادہ گرمی محسوس نہیں ہوتی۔''
اسی اثنا میں شجاعت احمد اویس انٹر پرائزز کی فائل پڑھنے لگے۔ پہلی دستاویز ایک شکایت نامہ ثابت ہوئی۔ شجاعت احمد با آوازِ بلند متن دہرانے لگے ''پچھلے

کچھ عرصے کے دوران آپ کی سپلائی کردہ موٹروں کے بارے میں یہ شکایات نوٹس میں لائی گئی ہیں کہ موٹروں کی تیاری میں کوالٹی کنٹرول کا خیال نہیں رکھا جارہا۔ ہر سو میں سے پانچ موٹروں میں استعمال کے ایک ماہ کے اندر کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ صورتِ حال برقرار رہی تو ڈائریکٹرز کی آیندہ میٹنگ میں مزید خریداری بند کرنے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔“

شجاعت احمد نے پورا خط پڑھنے کے بعد مجھے دیکھا اور پھر خود کلامی کی ”اوہ‘ یہ تو بہت سیریس معاملہ ہے۔“ انھوں نے مجھے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ارادہ ترک کرکے دوبارہ فائل کی طرف متوجہ ہوگئے اور بدستور اپنے آپ سے بات کرتے ہوئے کہا۔ ”اتنا اچھا کسٹمر ہاتھ سے نکل گیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ اس شکایت کا جواب کیا دیا گیا ہے؟ ہاں‘ یہ رہی جواب کی نقل۔ لکھا ہے کہ جناب ہماری سپلائی کردہ موٹروں میں سے چند کی ناقص کارکردگی سے آپ کے ادارے کو جو زحمت ہوئی‘ اس کا ہمیں دلی افسوس ہے‘ لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ کوالٹی کی کڑی جانچ پڑتال کے ذریعے آپ کی شکایت دور کرکے ہم آپ کا اعتماد دوبارہ حاصل کرلیں گے۔ جہاں تک آپ کو اب تک سپلائی ہونے والی ناقص موٹروں کا سوال ہے‘ آپ ہمیں ان کی تعداد سے مطلع کردیں تو اتنی ہی تعداد میں نئی موٹریں سپلائی کرکے آپ کے نقصان کی تلافی کردی جائے گی۔ آیندہ بھی آپ کو اس ناخوش گوار صورتِ حال سے بچانے کے لیے درخواست ہے کہ کسی بھی کھیپ میں موصول ہونے والی ناقص موٹروں کی تعداد سے ہمیں بلاتاخیر آگاہ کیا جائے تاکہ آیندہ کھیپ میں اتنی ہی تعداد میں اضافی موٹریں سپلائی کرکے ناقص موٹریں واپس منگوالی جائیں۔“

شجاعت احمد نے فائل سے نظریں ہٹائیں۔ ان کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی ”اب تو پارٹی کو مطمئن ہو جانا چاہیے۔ یہ رہا اولیس انٹرپرائز کا اگلا خط۔ لکھتے ہیں آپ کا جوابی خط ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں زیرِ غور آیا اور ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے نہایت خوشی ہو رہی ہے کہ تمام ڈائریکٹرز نے خط میں کرائی گئی یقین دہانیوں پر متفقہ طور پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے آپ کی کمپنی سے موٹروں کی خریداری جاری رکھنے بلکہ آیندہ مالی سال میں آرڈر ڈبل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

فائل بند کرتے ہوئے شجاعت احمد کے چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی۔ انھوں نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اس وقت کمپیوٹر بند کرکے فائلیں سمیٹ رہا تھا۔ ”ارسلان صاحب‘ کام ختم ہوگیا؟“

”سر میں کام ختم ہوگیا کے بجائے کام مکمل ہوگیا کہنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔“

”بہت خوب۔ بہرحال جب یہ شکایت موصول ہوئیں تو کیا آپ نے کسی ذمہ دار   میرا مطلب ہے کسی سینئر ایگزیکٹیو کو اس کے بارے میں بتایا تھا؟“

”نہیں سر‘ میں نے ضروری نہیں سمجھا۔“ میں نے پُراعتماد لہجے میں بتایا۔

”کیوں ضروری نہیں سمجھا‘ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے؟“ شجاعت احمد کے لہجے میں چبھن موجود تھی۔

”سر اس خط میں کافی سخت الفاظ میں شکایت کی گئی ہے لیکن درحقیقت یہ تو ایک روٹین کا معاملہ ہے۔“

”روٹین کا معاملہ؟ وہ کیسے؟“ شجاعت احمد کا لہجہ مزید تیکھا ہوگیا ”آپ جانتے ہیں نا کتنا اہم کلائنٹ ہے یہ؟“

”بالکل جانتا ہوں سر۔ دراصل میرا مطلب ہے کہ چار پانچ فی صد موٹروں میں چھوٹا موٹا نقص

کوئی اتنی تشویش کی بات نہیں‘ اتنی گڑبڑ تو بے احتیاطی سے استعمال کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ کمپنی رولز میں ایسی شکایات کے ازالے کا طریقہ کار موجود ہے۔ میں نے کسٹمر کو مطمئن کرنے کے لیے وہی سادہ تکنیک آزمائی۔ خوش قسمتی سے نتیجہ توقع سے بہتر رہا۔“ میرے لہجے میں اطمینان کی جھلک تھی لیکن شجاعت احمد کچھ زیادہ مطمئن دکھائی نہیں دے رہے تھے ”ہاں‘ لیکن صورتِ حال بالکل الٹ بھی ہوسکتی تھی۔ بہرحال اس بارے آپ سے پھر کبھی بات ہوگی۔ آپ اب جاسکتے ہیں۔“

میں ان سے الوداعی مصافحہ کرکے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

چند روز بعد چاچا غلام نبی کے ذریعے شجاعت احمد نے مجھے طلب کیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا اس لیے میں قدرے اضطراب کے عالم میں ان کے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ دروازے پر دستک دے کر میں نے اندر جھانکا ”کیا میں اندر آسکتا ہوں سر؟“

”ہاں‘ آؤ‘ بیٹھو۔“ شجاعت احمد کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔

ان کے سامنے والی آرام دہ کرسی سنبھال کر میں شجاعت احمد کی طرف متوجہ ہوا۔

”جی فرمائیں۔“

”مسٹر ارسلان‘ میں نے یہ بتانے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے کہ میں اس پوسٹ سے آپ کو ڈسمس کررہا ہوں۔ فوری طور پر۔“ شجاعت احمد کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا ”اپنی ذمہ داریاں آج اور ابھی آفس سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کردیں۔“

میں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ مجھے یہ سن کر یقینی طور پر دھچکا لگا تھا۔ میرے تاثرات بھانپنا شجاعت احمد کے لیے بہت آسان تھا ”آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“

”صرف اپنا قصور جاننا چاہوں گا سر۔“

”یہی کہ آپ اس عہدے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ آپ کی کارکردگی کا گہرا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔“

”میں آپ کے فیصلے کو چیلنج تو نہیں کرسکتا سر‘ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے اپنی پوری صلاحیت کے مطابق اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کی ہے۔“ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بہرحال‘ آپ کو فیصلے کا اختیار ہے۔ اللہ حافظ۔“

”ٹھہریے مسٹر ارسلان۔ آپ کو یہ لیٹر بھی سائن کرنا ہے۔ اس کے بغیر آپ اپنی پوسٹ نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ دفتری کارروائی ہے۔“

”دکھایئے‘ کہاں سائن کرنا ہے مجھے؟“ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”یہاں‘ لیکن پہلے شرائط وضوابط پر ایک نظر ڈال لیں۔“

”اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے سر“ میں نے کاغذ پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا‘ اچانک میں چونک پڑا ”یہ... یہ کیا ہے سر؟“

”کیا تمھیں پڑھنا نہیں آتا مسٹر ارسلان؟“

”بالکل آتا ہے سر لیکن...“

”ہاں اب تم کلرک نہیں رہے‘ میں نے سیلز ڈپارٹمنٹ میں تبادلہ کردیا ہے تمہارا۔ اب تم سیلز ایگزیکٹیو ہو۔ جاؤ کمپنی کے سیلز ڈائریکٹر کو رپورٹ کرو۔ مجھے امید ہے تم اپنی نئی ذمہ داریاں بھی عمدگی سے نبھاؤ گے۔“

”میں پوری کوشش کروں گا سر‘ ان شاء اللہ۔ تھینک یو سر‘ تھینک یو ویری مچ۔“

اس شام میں مغرب سے پہلے ہی گھر پہنچ گیا۔ میں بہت خوش تھا لیکن خلاف معمول پاپا نے انتہائی

پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا"خیریت بیٹا' آج اتنی جلدی؟"

"ہاں پاپا۔ آج جلدی چھٹی مل گئی اور اب ان شاء اللہ میں روز جلدی گھر آیا کروں گا۔"

"اچھا؟! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" پاپا نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ ان کی یہ کیفیت مجھ سے بھلا کیسے چھپی رہ سکتی تھی "ارے پاپا یہ آپ اتنے ڈاؤن کیوں نظر آ رہے ہیں آج؟"

"کچھ نہیں بیٹا' تم کپڑے بدل لو تھوڑی دیر میں کھانا بھی تیار ہو جائے گا۔"

"نو پاپا پہلے اپنے ڈپریشن کی وجہ بتائیں۔"

"میں آج صبح کلثوم باجی کی طرف گیا تھا۔" پاپا دھیمے لہجے میں بولے "تمہارے اور رخسانہ کے رشتے کی بات کرنا چاہتا تھا لیکن ان کی باتوں اور رویے سے دل کو بہت ٹھیس پہنچی۔"

"میں نے آپ کو سمجھایا تو تھا پاپا' بہرحال کیا کہا انھوں نے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ مجھ سے بہت روکھے انداز میں ملیں۔ میں نے ان کا رویہ نظر انداز کر کے رشتے کی بات چھیڑنا چاہی تو پوری بات سننے سے پہلے ہی صاف انکار کر دیا کہ ایک معمولی کلرک ان کا داماد نہیں بن سکتا اور یہ کہ ان کی لاڈ پیار میں پلی بیٹی سات آٹھ ہزار روپلی میں گزارا نہیں کر سکتی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا پاپا۔ اس میں اتنا اداس ہونے کی کیا بات ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس میں خوش ہونے کی بھی کون سی بات ہے؟" پاپا نے حیرانی سے پوچھا۔

"خوشی کی بات تو ہے پاپا کہ خدا نے ہمیں ایسے زر پرست اور خود غرض لوگوں سے بچا لیا۔ اب وہ دوبارہ رشتہ جوڑنا بھی چاہیں تو صاف انکار کر دیجیے گا۔"

"وہ بھلا کیوں رشتہ جوڑیں گے بیٹا؟"

"وہ کوشش تو کریں گے پاپا کیوں کہ آپ کا بیٹا اب معمولی کلرک نہیں رہا بڑا افسر بن گیا ہے۔ کمپنی کی گاڑی اور بھاری تنخواہ ملے گی مجھے۔"

"اوہ' یہ تو بہت بڑی خوش خبری ہے بیٹا۔" پاپا کے چہرے پر خوشیوں کا چمن کھل اٹھا "تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے خدایا۔ تو نے میری دعائیں سن لیں۔"

☆☆☆

زندگی نے بڑی تیز رفتاری سے رنگ بدلے۔ ذمہ داریوں اور مصروفیات میں اضافے کے ساتھ میں ترقی کی منازل بھی غیر معمولی سرعت سے طے کرتا چلا گیا۔ اس روز صبح نو بجے میں نئے ماڈل کی گاڑی میں ایس اے الیکٹرونکس پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں قیمتی بریف کیس اور دوسرے میں نفیس قسم کا سیل فون تھا۔ حسب معمول چاچا غلام نبی بھی میرے ساتھ دفتر آئے تھے۔ میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کمپیوٹر آن کر کے ای میل چیک کی اور آپریٹر کو چند نمبر باری باری ملانے کی ہدایت کی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور انتہائی مصروف کاروباری دن کا آغاز ہو گیا۔

"ہاں چاچا غلام نبی' کوئی کام ہے مجھ سے؟" میں نے فائلوں سے نظر ہٹائی "ارے بیٹا' تم نے کام کی مصروفیت میں پھر چائے ٹھنڈی کر دی' کوئی بات نہیں میں دوسری لے آتا ہوں۔"

"نہیں چاچا' میں صاحب کے پاس جا رہا ہوں کافی تو وہ پلا ہی دیں گے۔"

میں چند فائلوں کے ساتھ شجاعت احمد کے کمرے میں داخل ہوا۔ "اچھا ہوا تم خود آ گئے' میں بلوانے ہی والا تھا' شجاعت احمد نے پرجوش لہجے میں کہا "راحت انڈسٹریز والی ڈیل کا کیا بنا؟"

"سر بس دو ایک دن میں ڈیل فائنل ہو جائے گی

لیکن ہمیں اپنی پروڈکشن بڑھانا پڑے گی۔" میں نے کہا۔

"تم فکر مت کرو اس کا انتظام کر رہا ہوں میں۔ دو ماہ کے اندر پروڈکشن میں تیس فیصد سے زائد اضافہ ہو جائے گا۔ اب جمال انٹر پرائزز پر کام شروع کر دو۔"

"وہ تو میں پہلے ہی شروع کر چکا ہوں۔ دو ہفتے کے اندر پوری تیاری کے ساتھ ان سے رابطہ کریں گے۔" میں نے یقین دہانی کرائی۔

"بہت خوب۔ اگلے ہفتے اندرون ملک کا بھی دورہ کرنا ہے تمہیں یاد ہے نا؟"

"بالکل یاد ہے سر۔ میری تیاری مکمل ہے۔"

میں اپنے کمرے میں آ کر دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔ چاچا غلام نبی وقتاً فوقتاً چائے لاتے رہے۔ ایک بار وہ خالی ہاتھ میرے پاس پہنچے تو میں نے پوچھا۔

"چاچا آپ خالی ہاتھ؟ میری چائے؟"

"اب گھر جا کر پینا چائے۔ کچن بند ہو چکا ہے۔"

"وہ' چھ بج گئے۔ وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ ٹھیک ہے آپ گاڑی میں بیٹھیں۔" میں نے گاڑی کی چابی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں صاحب سے بات کر کے دو منٹ میں آتا ہوں۔"

"صاحب تو کبھی کے جا چکے ہیں بیٹا" چاچا غلام نبی نے ہنستے ہوئے بتایا "جب سے تم نے کام سنبھالا ہے وہ کافی ریلیکس ہو گئے ہیں۔"

انھوں نے بریف کیس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے نظر انداز کر دیا۔ راستے میں چاچا غلام نبی نے مجھے مخاطب کیا۔ "تمہارے پاپا ٹھیک کہتے ہیں بیٹا' اب تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔ دلہن آنے سے جلدی ہی تمہارا گھر اصل گھر بنے گا۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے چاچا' جیسے ہی کوئی اچھی سی لڑکی ملی یہ نیک کام کر ڈالوں گا۔"

اسی وقت میرے موبائل فون کی مترنم گھنٹی بج اٹھی "ہیلو' میں ارسلان بات کر رہا ہوں' آپ کون؟"

"میں مظفر شیخ بات کر رہا ہوں' امید ہے مجھے جانتے ہوں گے آپ۔"

"جی ہاں' آپ شیخ گروپ آف انڈسٹریز کے چیف ایگزیکٹو ہیں' فرمائیے کیسے زحمت کی؟"

"میں تمہیں اپنا گروپ جوائن کرنے کی پیش کش کرنا چاہتا ہوں مسٹر ارسلان' تم جیسے باصلاحیت نوجوان کے لیے ہمارے گروپ میں ترقی کے زیادہ مواقع ہیں۔"

"مائنڈ نہ کریں سر تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ اتنے بڑے گروپ کے چیف ایگزیکٹو نے مجھ سے براہ راست رابطے کی زحمت کی؟"

"ہیرے کی قدر جوہری ہی جانتا ہے مسٹر ارسلان۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمارے گروپ کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہو۔ شجاعت احمد تمہیں صرف ساٹھ ہزار دے رہا ہے۔ ہمارے گروپ میں ڈیڑھ لاکھ کا پیکیج تمہارا منتظر ہے۔"

"اس قدر افزائی کا شکریہ سر' میں یقیناً آپ کی پیشکش پر غور کروں گا۔"

چاچا غلام نبی یہ تمام گفتگو نہایت غور سے سن رہے تھے۔ رابطہ ختم ہونے پر میں نے انھیں مخاطب کیا۔

"لو چاچا' بیٹھے بٹھائے ڈیڑھ لاکھ روپے ماہانہ کی بولی لگ گئی میری' شیخ گروپ کے مالک کا فون تھا۔"

"ڈیڑھ لاکھ تو بہت بڑی رقم ہے بیٹا۔ زندگی بدل سکتی ہے۔"

"میں اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہوں چاچا' صرف پیسے کی خاطر میں یہ کمپنی نہیں چھوڑ سکتا جہاں مجھے اتنی عزت اور مرتبہ ملا۔ ہاں ایک بات بالکل صحیح کہی شیخ صاحب نے۔ ہیرے کی قدر جوہری ہی

جلتا ہے اور اگر میں کوئی ہیرا قسم کی چیز بن بھی چکا ہوں تو یہ شجاعت صاحب کی قدر شناسی کا نتیجہ ہے۔ میں کسی قیمت پر احسان فراموش نہیں بن سکتا۔" میں نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔

"شاباش بیٹا' یہ ہے تمہاری خاندانی شرافت اور اچھی تربیت کا ثبوت' لو بھئی میرا گھر آ گیا' گاڑی سائیڈ میں کر کے اتار دو مجھے۔"

☆☆☆

اگلے چند ماہ میرے لیے شدید محنت طلب تھے۔ اس روز بھی میں بروقت دفتر پہنچا۔ چاچا غلام نبی حسب معمول میرے ساتھ ہی آئے تھے۔ چھٹی سے گھنٹا بھر پہلے مجھے ایک فون موصول ہوا۔ ریسیور رکھنے کے بعد میں سیدھا شجاعت احمد کے کمرے میں پہنچا "ہاں بھئی ارسلان آؤ۔"

"مبارک ہو سر" میں نے پرجوش لہجے میں کہا "عرفان سنز کا آرڈر مل گیا ہمیں۔"

"گڈ نیوز' ویل ڈن مائی بوائے' مجھے فخر ہے تم پر" شجاعت احمد نے گرم جوشی سے مصافحہ کر کے کہا۔

"یہ میرے کیریئر کا سب سے بڑا آرڈر ہے سر' میں بہت خوش ہوں۔"

"یہ ہماری کمپنی کا بھی سب سے بڑا آرڈر ہے ارسلان' شیخ گروپ میں تہلکا مچ گیا ہوگا یہ کلائنٹ چھن جانے پر۔" شجاعت احمد نے مسرور لہجے میں کہا۔

"انشا اللہ ایسے بہت سے آرڈر ملیں گے۔ آپ پروڈکشن سائیڈ کنٹرول میں رکھیں' کوالٹی میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ ہم کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔"

اسی اثنا میں چاچا غلام نبی کافی لے کر کمرے میں داخل ہوئے' شجاعت احمد نے اسے دیکھ کر کہا "تمہاری تو طبیعت خراب ہے نا غلام نبی' گھر نہیں گئے تم؟"

"ارسلان بابو کے ساتھ گھر جاتا ہوں جناب' بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔"

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا چاچا' چلو ابھی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن تمہاری کافی؟"

"گھر جا کے پی لوں گا۔ آئیے سہارا دوں آپ کو؟" میں نے پوچھا۔

"ارے نہیں اتنی بھی خراب نہیں ہے میری طبیعت۔ موسم کا اثر ہے۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

چاچا غلام نبی اور میں گاڑی میں سوار ہوئے۔ چاچا غلام نبی راستے میں بار بار غنودگی میں ڈوبتے ابھرتے رہے۔ ان کا گھر آنے پر میں نے شانہ پکڑ کر جھنجوڑا "اٹھو چاچا' گھر آ گیا ہے آپ کا۔"

چاچا غلام نبی نے سر جھٹکتے ہوئے کہا "بیٹا تمہیں زحمت تو ہوگی' مجھے گھر کے اندر پہنچا دو' چکر سے آ رہے ہیں' کہیں گر نہ جاؤں۔"

میں نے سہارا دے کر چاچا غلام نبی کو اتارا اور گھر کے دروازے پر لے جا کر دستک دی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی نے باہر جھانکا "فرمائیے' کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

میرے بجائے غلام علی نے جواب دیا "دروازہ کھولو مہ رخ بیٹی' یہ ارسلان صاحب ہیں' مجھے پہنچانے آئے ہیں' میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ' شاید پھر بلڈ پریشر لو ہو گیا ہے۔" مہ رخ نے دروازہ سے ہٹتے ہوئے کہا "آپ جلدی سے اندر آ جائیں۔"

میں غلام نبی کو گھر کے اندر لے گیا اور ایک بستر پر لٹا دیا۔ "چاچا آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں پھر میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" مہ رخ نے کہا "گھر میں دوائیں موجود ہیں' کچھ ہی دیر میں طبیعت سنبھل جائے گی۔"

میں نے چاچا غلام نبی کو دوا کھلانے میں مہ رخ کی مدد کی "بابا آپ کے بارے میں اکثر بتاتے رہتے ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" مہ رخ کے لہجے میں خلوص اور سادگی نمایاں تھی۔ اس لمحے وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میرا جی چاہا کہ مہ رخ بولتی رہے اور میں اس کا تابندہ چہرہ دیکھتا رہوں۔

"مہ رخ یہ کیا بداخلاقی ہے؟ ارسلان بابو پہلی بار ہمارے گھر آئے ہیں اور تم نے چائے کا بھی نہ پوچھا۔" غلام نبی نے سرزنش کی۔

"اوہ آئی ایم سوری' بس پانچ منٹ میں لاتی ہوں۔"

"چاچا دو تین دن مکمل آرام کریں گھر میں۔ آپ کی بیٹی ماشاءاللہ بہت سمجھ دار ہے' کہاں تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟"

"ایم اے کر لیا ہے۔ اب نوکری کے لیے ضد کرتی ہے لیکن میں نے اجازت نہیں دی۔ اپنے گھر کی ہو جائے بس یہی بہت ہے۔"

اسی اثنا میں مہ رخ چائے لے آئی۔ اس کے ساتھ کئی طرح کے نمکین و شیریں لوازم بھی تھے۔

"چند ہی منٹ میں اتنا سب کچھ؟ کوئی جن تو نہیں آپ کے قبضے میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی سمجھ لیں۔ دراصل مجھے مہمانوں کی آمد کا پہلے ہی پتا چل جاتا ہے۔" مہ رخ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا وہ کیسے؟ مہمانوں کی آمد کا پیشگی پیغام تو کسی زمانے میں کوے دیا کرتے تھے۔"

"کوے بے چارے تو خیر اب آؤٹ آف ایکشن ہو چکے ہیں۔ اب تو خود ہی پہلے سے تیاری کرنا پڑتی ہے۔"

"مہ رخ اکثر شامی کباب اور سموسے وغیرہ پہلے سے تیار کر کے رکھ لیتی ہے۔" چاچا غلام نبی نے بتایا۔

"اور جیسے ہی مہمان آئیں۔ چند منٹ میں پیش کر کے انہیں حیران کر دیتی ہے۔" میں نے ستائش آمیز لہجے میں کہا "بہت خوب۔"

چاچا غلام نبی اور مہ رخ سے رخصت ہو کر گھر جاتے ہوئے مجھ پر عجیب سرشاری طاری تھی۔ مہ رخ کی کھنکھناتی ہنسی اور دل کش مسکراہٹ راستے بھر میرے ساتھ رہی۔ میں مسکراتے اور گنگناتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ پاپا بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام بیٹا آج اتنی دیر کیوں ہو گئی؟"

"وہ دراصل چاچا غلام نبی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ انہیں گھر پہنچانے میں دیر لگ گئی۔" میں نے اپنی باغ و بہار کیفیت چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

"اوہ' یہ تو بہت تشویش کی بات ہے لیکن تمہارے موڈ سے لگ رہا ہے جیسے کسی "ڈیٹ" سے واپس آ رہے ہو۔"

"دراصل اب ٹھیک ہیں چاچا غلام نبی۔" میں نے جھینپتے ہوئے کہا "فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"اچھا تم کپڑے بدل کر فریش ہو جاؤ' میں کھانا لگاتا ہوں۔" پاپا نے حکم جاری کیا۔

"آئی ایم سوری پاپا' میں کھانے میں زیادہ ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ دراصل چاچا غلام نبی کے گھر کافی کچھ کھا لیا ہے میں نے۔ اصرار اتنا شدید تھا کہ میں مجبور ہو گیا۔"

"تم بیمار کو گھر پہنچانے گئے تھے یا دعوت اڑانے؟ مجھے تو بیٹا کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔"

''اور کیا معمہ ہوسکتا ہے پاپا؟ چاچا غلام نبی کے بارے میں تو آپ پہلے ہی جانتے ہیں۔''

''تم ایسے زبان نہیں کھوؤ گے۔ ٹھیک ہے' کل میں بھی چلوں گا بھائی غلام نبی کی عیادت کرنے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' پاپا نے تو سی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''نہیں۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟'' میں نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

''اور کون ہے بھائی غلام نبی کی فیملی میں؟''

''کوئی نہیں' میرا مطلب ہے بس ایک بیٹی ہے مہ رخ۔'' میں نے بتایا

''مہ رخ' اچھا نام ہے' ظاہر ہے شکل وصورت میں بھی نام کے مطابق ہی ہوگی۔ تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟''

''انگلش میں ماسٹرز کیا ہے۔'' میں نے حتی الامکان بے نیازی سے بتایا۔

''بہت خوب' یعنی تعلیمی رتبے میں تم سے برتر ہیں صاحب زادی۔ اب تو بھائی غلام نبی کی عیادت بہت ہی ضروری ہوگئی ہے۔''

''بہتر ہے تو پھر کل شام تیار رہیے گا۔''

''ٹھہرو میاں' معاملہ کافی پیچیدہ نظر آرہا ہے۔ میں بھی موقع ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ اگر کہو تو کل ہی ہاتھ مانگ لوں؟'' پاپا نے پوچھا۔

''اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ پہلے ان لوگوں کی جانچ پرکھ تو کرلیں' ہوسکتا ہے مہ رخ مجھے اپنے قابل نہ سمجھے۔'' میں نے نظریں چرا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''یعنی تم اسے اپنے قابل تسلیم کرتے ہو؟ بہت خوب۔ چلو کل صورت حال کے مطابق فیصلہ کریں گے۔''

☆☆☆

شجاعت احمد اپنے کمرے میں کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ میں دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ شجاعت احمد نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ سوچنے لگے۔ قدرے توقف کے بعد میں نے انہیں مخاطب کیا۔

''سر آپ کی سیٹ کنفرم کرادی گئی ہے۔'' شجاعت احمد نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ''آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں سر خیریت تو ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔''

میں نے پوچھا ''پھر بھی؟ کیا کوئی ڈیل؟''

''نہیں' پرسنل معاملہ ہے' کیا تم جانتے ہو میری ایک بیٹی بھی ہے؟''

''جی نہیں۔ کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی آپ سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''سحر ہے اس کا نام..... کافی ذہین اور ہنس مکھ بلکہ شرارتی ہے۔ بس ایک مسئلہ ہے جو اب پریشانی بنتا جارہا ہے۔'' شجاعت احمد کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

''وہ کیا سر؟'' میں نے پوچھا

''میرے بے پناہ لاڈ پیار نے اسے ضدی بنادیا ہے۔ جو جی میں آئے وہی کرتی ہے' پسند ناپسند کے معاملے میں بھی انتہا پسند ہے۔''

''یہ تو اتنی فکر کی بات نہیں ہے سر' آپ ماشاءاللہ اس کی ہر فرمائش پوری کرسکتے ہیں۔''

''کاش ایسا ہوتا' اس کی من مانی صرف اشیا تک محدود نہیں ہے۔ وہ شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے لیکن میں جو بھی لڑکا اس کے لیے پسند کرتا ہوں وہ بلا تکلف ریجیکٹ کردیتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے وہ پہلے ہی کوئی لڑکا پسند کرچکی ہو؟''

''بھئی مجھے تو یہ بھی منظور ہے' لیکن اسے تو کوئی پسند آتا ہی نہیں۔ پاکستان میں نہ وہاں لندن میں۔ اب جارہا ہوں تو ایک بار پھر راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔'' شجاعت احمد نے کہا پھر انہوں نے قدرے چونک کر پوچھا ''اوہ ہاں' اب غلام نبی کی کیسی طبیعت ہے؟''

''اب بہت بہتر ہیں سر' آج شام جاؤں گا ان کی طرف۔''

''میری طرف سے بھی پوچھ لینا۔ پرانا ساتھی ہے میرا۔'' شجاعت احمد نے ہدایت کی۔

......☆☆☆......

غلام نبی نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ چاچا غلام نبی چند ہی منٹ میں پاپا سے ایسے گھل مل گئے جیسے برسوں پرانا رشتہ ہو۔ ''ارسلان ماشاءاللہ بالکل آپ کا عکس ہے۔ ذہین' نیک اور خوش مزاج۔''

''ارے اتنی تعریف۔ نئے زمانے کا لڑکا ہے بھائی۔ کہیں اوور فلو نہ ہوجائے۔''

اسی اثنا میں مہ رخ مشروبات لیے آگئی ''ارے مہ رخ بیٹا' ہم چائے شربت پر ٹلنے والے نہیں ہیں۔ ارسلان نے تمہارے ہاتھ کے ذائقے کی بہت تعریف کی ہے۔ ہم تو کچھ کھا کر ہی جائیں گے۔''

''کھانا تو تقریباً تیار ہی ہے انکل۔ بس پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔''

''ٹھیک ہے' ارسلان تم کھانے کی تیاری میں مہ رخ کا ہاتھ بٹاؤ' تب تک ہم دونوں بھائی گپ شپ لگائیں گے۔'' پاپا نے کہا

''مابدولت آپ کی کون سی مشکل آسان کرسکتے ہیں؟'' میں نے کچن میں پہنچ کر شاہانہ انداز میں مہ رخ کو مخاطب کیا۔

''آپ کے شایان شان کام ہے عالم پناہ چھری ٹماٹر اور پیاز پیش خدمت ہیں ذرا کچومر بنادیں۔''

''افسوس ہم اس کام کے لیے مطلوبہ بے حسی سے محروم ہیں کیونکہ ان معصوم پیازوں کے قتل عام پر ہمارا دل اور آنکھیں دھاروں دھار آنسو بہاتی ہیں۔''

''پھر آپ بریانی کی خبر گیری کیجیے' اس کی بھی تاب نہیں تو رائتے کے لیے دہی کی پھینٹی لگائیں۔''

مہ رخ کی بات سن کر میں نے گردن ہلائی۔

''ہاں' یہ ہمارے مزاج کے قریب تر ہے دہی ہمیں سونپ دیں۔''

☆☆☆

''بھئی کھانا تو میں بھی بہت خوب بناتا ہوں'' کھانے کے بعد پاپا نے کہا ''لیکن ماننا پڑے گا کہ مہ رخ بیٹیا کا جواب نہیں۔''

''تو پھر آپ شاگرد بن جائیں ان کے۔ شاید اس طرح میرا کھانے پینے کا ذوق بہتر ہوجائے۔'' میں نے دبے لہجے میں کہا۔ پاپا نے گھور کر مجھے دیکھا ''یہ بیان تم گھر میں جاری فرماتے تو میں بھی ذرا وضاحت اور شدت سے ردعمل ظاہر کرتا۔ بہرحال ہم دونوں بھائی اس چھوٹی سی ملاقات میں ایک بڑے فیصلے پر پہنچ چکے ہیں۔''

''کیسا فیصلہ پاپا؟'' میں نے پوچھا لیکن جواب چاچا غلام نبی نے دیا ''یہی کہ مہ رخ اور تم ایک دوسرے کے لیے بالکل موزوں ہو' اگر تم دونوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......''

''اعتراض کی حد تک تو بات ٹھیک ہے۔'' پاپا نے بات آگے بڑھائی ''انکار قبول نہیں ہے ہمیں۔''

''یہ تو سراسر ڈکٹیٹر شپ ہے!۔ بہرحال مجھے آپ دونوں کا فیصلہ منظور ہے۔''

پاپا نے مہ رخ کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر سر جھکالیا۔

''مبارک ہو بھائی غلام نبی' دونوں بچے راضی ہیں۔''

''آپ کو بھی مبارک ہو بھائی رحمان احمد' میرا خیال ہے منگنی کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔'' پاپا نے اپنے ہونے والے سمدھی کی تائید کی ''بالکل ٹھیک۔ بس ڈائریکٹ شادی ہی ہوگی اور وہ بھی بہت جلد۔''

مہ رخ اور میں نے ایک دوسرے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر حیا کے بوجھ سے مہ رخ کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔

......☆☆☆......

شجاعت احمد کے باہر جانے کے باوجود کاروباری معمولات بخیر وخوبی چل رہے تھے۔ میں نے چھٹی سے کچھ دیر پہلے گھر فون کیا ''پاپا جانی آپ تیار ہیں نا؟ میں بس آدھے پونے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ آپ فون کرکے چاچا غلام نبی کو بھی بتادیں کہ ہم آ رہے ہیں۔''

میں نے ریسور رکھا ہی تھا کہ بیل پھر بج اٹھی۔ دوسری طرف شجاعت احمد تھے ''السلام علیکم سر' واپس کب پہنچے آپ؟''

''گھنٹے بھر پہلے۔ تم کیا کر رہے ہو اس وقت؟ زیادہ مصروف تو نہیں ہو؟''

''نو سر' بس گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا'' میں نے بتایا۔

''ویری فائن' تو پھر ذرا میرے گھر کی طرف سے ہو کر چلے جاؤ۔ اہم بات کرنا ہے تم سے۔ اچھی سی کافی پلاؤں گا۔''

''بہتر ہے میں کچھ دیر میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے ریسیور رکھ کر اپنے آپ سے کہا ''لو جناب سارا پروگرام مٹی میں مل گیا۔ بڑے میاں پتا نہیں کب اجازت دیں گے۔ پاپا کو آگاہ کرنا پڑے گا۔''

شجاعت احمد نے غیر معمولی گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا ''یار میں نے ایک خاص کام سے بلکہ یوں کہو کہ ایک بہت بڑی خوش خبری سنانے کے لیے بلایا ہے تمہیں۔ انتظار کی تاب نہیں تھی۔''

''کیسی خوش خبری جناب'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا ''کیا کوئی بڑی ڈیل...؟''

''نہیں' کوئی کاروباری ڈیل نہیں' بس یہ سمجھ لو کہ تمہاری قسمت کھلنے کا وقت آ گیا' جب کہ میری دلی خواہش بھی یہی ہے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھا جناب'' میں نے کہا۔ میں نے شجاعت احمد کو پہلے کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

''میں سمجھاتا ہوں' دراصل میں اپنی کمپنی کی سالانہ رپورٹ بھی اپنے ساتھ انگلینڈ لے گیا تھا۔ سحر نے اس میں تمہاری تصویر دیکھی اور کافی دل چسپی سے تمہارے بارے میں میری رائے سنی' ظاہر ہے میں نے تمہاری محنت اور دیانت کی جی بھر کے تعریف کی۔ اگلے روز باتوں باتوں میں سحر نے ایک بار پھر تمہارا ذکر چھیڑا تو میرے دل میں امید بندھی۔ مختصراً یہ کہ سحر نے تمہیں پسند کرلیا اور شادی کے لیے ہاں کہہ دی ہے۔''

شجاعت احمد کی بات سن کر میں سناٹے میں آ گیا

''ارے بھئی' تم یوں بت بنے کیوں بیٹھے ہو؟ اچھا سمجھ گیا' اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا' تم واقعی خوش نصیب ہو ارسلان' اتنی اچھی لڑکی قسمت والوں کو ملتی ہے' میری تمام جائیداد اور کاروبار بھی تمہارا اور اس کا ہی ہوگا۔''

میں بدستور خاموش رہا' میں اس لمحے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''بھئی کچھ تو بولو کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچ رہا ہوں آپ کا دل توڑنے کے گناہ سے کیسے بچوں۔ کاش آپ کے ہر حکم کی طرح میں آپ کی یہ خواہش پوری کرنے پر بھی قادر ہوتا۔''

''کیا مطلب؟'' شجاعت احمد نے چونک کر پوچھا ''کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ......''

''ہاں جناب' میں آپ کی بے پناہ عزت کرتا ہوں۔ آپ رحمت کا فرشتہ ہیں میرے لیے۔ آپ کی بیٹی بھی آپ کی طرح قابلِ قدر اور قابلِ رشک ہوگی' لیکن افسوس......''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' شجاعت احمد نے مجھے بات پوری نہ کرنے دی ''جانتے ہو تم کیا ٹھکرا رہے ہو؟ لاکھوں نوجوان سحر سے شادی کی آس میں تڑپ رہے ہیں!''

''میں آپ کی بیٹی کو ٹھکرانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا سر' محض اپنی مجبوری کا اظہار کر رہا ہوں۔''

''تم' تم اس کی تصویر تو دیکھو۔ لاکھوں میں ایک ہے وہ۔''

''اگر وہ معمولی شکل کی بھی ہوتیں تو میں آپ کی بات نہ ٹالتا' لیکن افسوس! اب یہ ممکن نہیں' میں اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کرچکا ہوں'' میں نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''کیا وہ شکل وصورت اور مالی حیثیت میں میری بیٹی سے بڑھ کر ہے؟ بتاؤ مجھے؟'' شجاعت احمد کے لہجے کی تیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے نفی میں سر کو جنبش دی ''مجھے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا جناب' مہ رخ چاہے ہر لحاظ سے سحر سے کم تر ہو لیکن میں اسے دل وجان سے چاہتا ہوں اور میں زبان بھی دے چکا ہوں' وہی میری بیوی بنے گی۔''

''کون مہ رخ! غلام نبی کی بیٹی؟'' حیرت سے شجاعت احمد کی آنکھیں پھیل گئیں ''تم ایک چپراسی کی بیٹی کی خاطر میری بیٹی کو ٹھکرا رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو تم؟''

''بالکل ہوش میں ہوں سر' بہکنا ہوتا تو کروڑوں کی جائیداد اور کاروبار کی امید پاتے ہی بہک چکا ہوتا۔ مہ رخ کے باپ کی کوئی بھی حیثیت ہو' میں اسے بیوی کے طور پر قبول کرچکا ہوں۔'' میرا لہجہ اٹل تھا۔

''دیکھو ارسلان' تم مجھے بے حد عزیز ہو۔'' شجاعت احمد نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''سحر کو ہزاروں لڑکوں میں سے صرف تم پسند آئے ہو' اب وہ کسی اور کا نام بھی سننے کی روادار نہ ہوگی۔ تم نہ ملے تو خدا جانے وہ کیا کر گزرے۔ پلیز میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''آپ بھی تو میری پوزیشن سمجھیں جناب۔'' میں نے انتہائی عاجزی سے کہا ''میں ایک شریف انسان کی معصوم بیٹی سے وعدہ کرچکا ہوں۔ آپ کے احترام یا دولت کے لالچ میں آ کر اس کا دل توڑنا مجھے ہرگز گوارا نہیں ہے۔''

''چاہے تمہارے اس فیصلے سے میرا سب کچھ لٹ جائے؟'' شجاعت احمد نے تیکھی نظروں سے گھورا ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے خود غرض اور احسان فراموش ہوسکتے ہو۔''

''میں آپ کی کیفیت سمجھ رہا ہوں سر'' میں نے پژمردگی سے کہا ''آپ بیٹی کی محبت سے مجبور ہو کر یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں' لیکن میں مجبور ہوں۔''

''یہ مجبوری تمہیں بہت مہنگی پڑ سکتی ہے ارسلان۔ میں تمہیں کل تک مہلت دے رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔''

''میرا جواب کل بھی یہی ہوگا جناب'' میں نے نرم لیکن بے باک لہجے میں کہا۔

''اب تم جاؤ ہو سکے تو اپنے والد سے بھی مشورہ کرلینا' کل پھر یہیں ملاقات ہوگی' گڈ نائٹ۔''

"گڈ نائٹ سر" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور جھکے جھکے قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ شجاعت احمد پہلے ہی اندر جا چکے تھے۔

......☆☆☆......

پاپا اور میں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ دونوں کے چہروں پر گہری سنجیدگی تھی "میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی نا پاپا جانی؟" میں نے پوچھا

پاپا نے خود کو سنبھال کر چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "ارے نہیں بیٹا میرا سر فخر سے بلند کر دیا تم نے۔ اب مجھے یقین آ گیا کہ میری تربیت رائیگاں نہیں گئی۔"

"لیکن اب مشکل حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ وہ میرے انکار کو اپنی توہین سمجھ رہے ہیں۔"

"سمجھ رہے ہیں تو سمجھتے رہیں۔" پاپا نے مضبوط لہجے میں کہا "دولت کی خاطر انسانیت کا دامن تو نہیں چھوڑ سکتے ہم۔ زیادہ سے زیادہ نوکری چھین لیں گے نا؟ یہ بھی کر کے دیکھ لیں۔ رزق تو اللہ دیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے اب مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ لیکن کہیں۔"

"ہاں ہاں بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟" پاپا نے پوچھا

"یہی کہ کہیں میری نوکری کے چھوٹتے ہی چاچا غلام نبی بھی آنکھیں نہ پھیر لیں جیسے کہ رخسانہ کے گھر والوں نے۔"

"وہ ایسے کم ظرف لوگ نہیں ہیں ارسلان۔ بالفرض ایسا کچھ ہوا بھی تو ہمیں کیا فرق پڑے گا؟ اللہ نے رخسانہ سے اچھی لڑکی تمہارے لیے بھیجی تھی نا؟ مہ رخ نہ سہی اس سے بھی بہتر لڑکی ملے گی تمہیں۔ اب تم آرام کرو باقی باتیں صبح کریں گے۔"

پاپا کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں بستر پر دراز ہو کر اپنے آپ سے مخاطب ہوا "واہ پاپا جانی آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا مہ رخ نہیں تو کوئی اور لڑکی مل جائے گی۔ آپ کو کیسے بتاؤں میری زندگی میں اب مہ رخ کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔ اسے کھو کر تو میرے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ کیا وہ خود میرے علاوہ کسی اور کو قبول کر سکتی ہے؟ دل نہیں مانتا۔ بہت مضبوط ارادوں کی مالک ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں مانے گی وہ۔" کافی کوشش کے باوجود میں رت جگے تک نہیں سو پایا۔

......☆☆☆......

اگلی صبح میں دفتر کے لیے روانہ ہوا۔ چاچا غلام نبی کو مقررہ مقام پر منتظر نہ پایا تو سوچا کہ شاید انہوں نے مزید آرام کا مشورہ مان لیا ہے۔ دفتر پہنچ کر میں نے فرصت پاتے ہی چاچا غلام نبی کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ خاصی دیر تک گھنٹی بجتی رہی مگر کسی نے فون نہ اٹھایا "کمال ہے۔ ان باپ بیٹی کا صبح سویرے کہاں کا پروگرام بن گیا؟"

پچیس تیس منٹ بعد میں نے پھر کوشش کی لیکن وہی نتیجہ رہا۔ کچھ سوچ کر میں نے گھر کا نمبر ملایا

"السلام علیکم پاپا جانی۔"

"وعلیکم السلام کیا صورت حال ہے بیٹا؟" پاپا نے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں شجاعت صاحب تو آج دفتر ہی نہیں آئے۔"

"اچھا؟ غلام نبی سے بات ہوئی اس سلسلے میں؟"

"نہیں پاپا وہ آج اپنی مقررہ جگہ نہیں ملے۔ صبح سے کئی بار فون کر چکا ہوں ان کے گھر لیکن کوئی نہیں اٹھاتا۔ پتا نہیں کیا چکر ہے؟"

"خدا خیر کرے کل رات ہی تو پہنچنا تھا ہمیں ان کے گھر شجاعت صاحب کی وجہ سے نہ جا سکے۔ انہوں نے انتظار کیا ہو گا۔ لیکن یہ راتوں رات ان کا

کہاں جانے کا پروگرام بن گیا؟"

"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں" میں نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"مجھے تو وسوسے ستانے لگے ہیں کہیں شجاعت احمد نے اپنی بیٹی کی محبت میں دیوانے ہو کر۔"

"ایسا نہ کہیں پاپا" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "شجاعت صاحب اس حد تک نہیں گر سکتے۔ ان کے غائب ہو جانے کی کوئی اور وجہ ہو گی۔ امید ہے شام تک لوٹ آئیں گے وہ لوگ" میں نے خود کو تسلی دی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو میں بھی رابطے کی کوشش کرتا رہوں گا ان سے۔ تم شجاعت احمد سے ملاقات کی تیاری کرو۔"

میں اس روز حسب معمول دفتری ذمے داریاں نبھاتا رہا۔ غلام نبی اور مہ رخ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر میں کافی پریشان تھا لیکن میں کام میں کوتاہی کا عادی نہیں تھا۔ چھٹی کا وقت قریب آنے پر میں نے اپنی ذاتی چیزیں سمیٹ کر بریف کیس میں رکھ لیں "لو بھئی مسٹر ارسلان اپنا بوریا بستر باندھ لو پتا نہیں دوبارہ یہاں کبھی آ دیا نہ آؤ۔ کہیں اور قسمت آزمانے کا وقت آ گیا ہے شاید۔"

شجاعت احمد کے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا "تو کیا فیصلہ کیا تم نے؟" شجاعت احمد نے آتے ہی پوچھا۔

"وہی جو کل میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ آپ کے احسانات ساری عمر یاد رکھوں گا البتہ مرتے دم تک پچھتاتا رہے گا کہ آپ کو ناخوش کر کے رخصت ہوا ہوں۔"

"اپنے انکار کا انجام بھی یقیناً تم نے سوچ لیا ہو گا؟" شجاعت احمد کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔

"بہت اچھی طرح۔ سب کچھ چھوڑنا پڑے گا۔ لیکن مجھے یہ منظور ہے۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ اور گاڑی کی چابی نکال کر شجاعت احمد کی طرف بڑھائی "میرا استعفیٰ اور گاڑی کی چابی۔"

"یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں کہیں اور نوکری مل جائے گی۔" شجاعت احمد نے گرج کر کہا "میں اخبارات میں اشتہار چھپوا دوں گا تمہارے خلاف۔"

"میں آپ کے اثر و رسوخ سے واقف ہوں سر جو سر پر پڑے گی بھگت لوں گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا

شجاعت احمد نے گھور کر دیکھا۔ "تم غلام نبی اور اس کی بیٹی کے لیے اپنی زندگی اور کیریئر برباد کر رہے ہو نا؟ اگر وہ لوگ خود رشتے سے انکار کر دیں تو؟"

"مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہو گا۔ وہ کم ظرف لوگ نہیں ہیں۔"

"کم ظرف نہ سہی کم وسیلہ تو ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ اب وہاں شادی نہیں ہو سکتی تمہاری۔" شجاعت احمد نے فیصلہ کن لہجے میں بتایا۔

"کیوں نہیں ہو سکتی سر؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں نے ان لوگوں کی مجبوریوں کا سودا کر لیا ہے۔ منہ مانگی رقم لے کر وہ راتوں رات اس شہر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں۔ میں ان کا مکان بھی دگنی قیمت پر خرید چکا ہوں۔"

"بالفرض ایسا ہے تب بھی آپ کامیاب نہیں ہوئے۔ مجھے کسی بھی قیمت پر نہیں خرید سکتے آپ۔ میں بکاؤ مال نہیں ہوں۔ نہ ہی کوئی کھلونا جسے آپ اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے حاصل کر لیں۔"

اپنا استعفیٰ اور گاڑی کی چابی میز پر رکھ کر میں ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا ہی

تھا کہ مہ رخ اور چاچا غلام نبی کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں چونک کر ٹھہر گیا "آپ دونوں اس وقت یہاں؟"

انہوں نے جواب دینے کے بجائے مسکراتے ہوئے شجاعت احمد کی طرف دیکھا "اب تو یقین آ گیا نا' میرا انتخاب غلط نہیں ہو سکتا۔" شجاعت احمد نے فخریہ لہجے میں پوچھا۔

"واقعی جناب۔" غلام نبی نے ستائش آمیز لہجے میں شجاعت احمد کی تائید کی "ماننا پڑے گا کہ ہیرے کی قدر جوہری ہی جانتا ہے۔"

شجاعت احمد تب مہ رخ کی طرف متوجہ ہوئے "اور آپ کا کیا فیصلہ ہے مائی ڈیر لیڈی؟"

"وہی جو آپ کا ہے۔" مہ رخ کا چہرہ خوشی سے گل نار ہو رہا تھا۔

"آپ لوگ یہ کیا باتیں کر رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے سوال کیا "مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"میں سمجھاتی ہوں۔" مہ رخ نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ ڈیڈی میرے لیے جو بھی لڑکا پسند کرتے تھے وہ میری خوبیوں کا نہیں ڈیڈی کی دولت کا متوالا ثابت ہوتا تھا۔ ذرا سی کوشش سے پول کھل جاتا اور میں اسے ریجیکٹ کر دیتی تھی۔ آخر کار ان کی سوئی تم پر آ کر اٹک گئی۔"

"ٹھہرو ٹھہرو' کیا تم شجاعت صاحب کی بات کر رہی ہو؟" میں نے حیران و پریشان ہو کر مہ رخ کو ٹوکا۔

"آف کورس' یہی تو میرے ڈیڈی ہیں!" مہ رخ نے بتایا۔

"اور چاچا غلام نبی؟" میری حیرت کا ٹھکانا نہ تھا۔

"یہ بھی میرے لیے باپ کا درجہ رکھتے ہیں' مجھے اولاد سے بڑھ کر پیار دیا ہے۔ مجھے انہوں نے ہی پالا ہے۔"

"تو آپ سب نے مل کر بے وقوف بنایا ہے مجھے۔" میں نے بھویں چڑھائیں۔

"نہیں' دراصل تمہاری آزمائش کے لیے یہ ناٹک کرنا پڑا ہے ہمیں۔" شجاعت احمد نے بتایا "میں ثابت کرنا چاہتا تھا کہ تم ایک محنتی' دیانت دار اور لالچ سے عاری نوجوان ہو۔"

مہ رخ نے اپنے باپ کی بات آگے بڑھائی "اور میں یہ چاہتی تھی کہ میری شادی اس شخص سے ہو جو میرے ڈیڈی کی دولت کو نہیں' مجھے اپنا بنانا چاہتا ہو' اس لیے میں چاچا غلام نبی کی بیٹی بن کر ان کے گھر رہنے لگی' جہاں ہماری ملاقات کی راہ ہموار کی گئی۔"

"لیکن تمہارا نام؟"

"غلط نہیں بتایا تھا بیٹا۔" اب چاچا غلام نبی بولے "بٹیا کا پورا نام مہ رخ سحر ہے' آیا کچھ سمجھ میں؟"

"میں تو سمجھ گیا لیکن پاپا کو سمجھانا آپ سب کی ذمہ داری ہے۔ میرے ساتھ ساتھ انہیں بھی بے وقوف بنایا ہے آپ نے۔"

"بھئی ان کو تو ہاتھ پاؤں جوڑ کر منا لیں گے۔" چاچا غلام نبی نے کہا "آخر ہمارے ہونے والے سمدھی ہیں وہ۔"

ہم سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔ شجاعت احمد کے چہرے پر ایسی اطمینان بھری مسکراہٹ تھی جو مہ رخ اور غلام نبی نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ صرف شجاعت احمد ہی سمجھ سکتے تھے کہ اس روز وہ خود بھی بڑی آزمائش میں سرخرو ہوئے تھے۔

❁

بھائی جان

محترم عمران احمد قریشی'
السلام علیکم!
یہ انسانی نفسیات ہے کہ وہ جب تک ٹھوکر نہیں کھاتا سنبھلتا نہیں مگر بعض اوقات یہ ٹھوکر اسے خاصی مہنگی پڑ جاتی ہے۔ زیر نظر کہانی ایک ایسے شخص کی ہے جو دوسروں کی عزت سے کھیلنا کھیل سمجھتا' پھر ایک شخص نے اسے اس کی اپنی زبان میں جواب دیا تو... امید ہے یہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

سلمیٰ غزل
کراچی

قائداعظم کی قدآدم تصویر کے آگے کھڑے پروفیسر حمزہ دکھ سے سوچ رہے تھے۔

"کیا یہ وہی اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا اور جسے قائداعظم نے تعبیر دی اور سندھ اسمبلی نے سب سے پہلے اس کے قیام کے لیے قرارداد منظور کی۔ انگریزوں کے زمانے میں ہم ان کے غلام تھے لیکن گھر کی بہو بیٹیوں کی ایسی بے حرمتی نہ کبھی دیکھی نہ سنی سندھ دھرتی تو آشتی و امن کا گہوارہ تھی لیکن آزادی کے بعد جمہوری نظام میں تو جیسے ماحول ہی بدل گیا ہے۔ غنڈہ گردی' چوری چکاری' ڈاکا' قتل اور اسمگلنگ جیسی برائیاں عام ہیں اور اس کی جڑیں پولیس کے محکمے میں ملتی ہیں۔ ہر واردات پولیس کے پہرے میں ہوتی ہے اور ہر جرم کا منافع پولیس کی جیبیں گرم کرتا ہے ہر تھانہ اور ہر سیکٹر نیلام ہوتا ہے اور نیلام کی رقم بڑے بڑے بارسوخ اور عزت دار لوگوں تک پہنچتی ہے ہر نظر جانتی ہے اور ہر نگاہ پہچانتی ہے لیکن سب ہی کی زبان خاموش ہے۔ لفظ گونگے ہو چکے ہیں اور آنکھیں اندھی۔ آنسو پروفیسر حمزہ کی آنکھوں سے رواں تھے اور دل دکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔

❁ ❁ ... ❁

پروفیسر حمزہ کا پورا محلہ گرویدہ تھا بے حد منکسر المزاج متین سنجیدہ اور بااخلاق ہر ایک کے کام آنے والے ہر کسی کے دکھ درد میں شریک۔ وہ جس علاقے میں رہتے تھے وہ بڑی گنجان آبادی والی بستی تھی کسی زمانے میں اس علاقے کی بڑی اہمیت تھی ناظم آباد میں رہنا لوگ باعث فخر سمجھتے تھے پھر رفتہ رفتہ لوگوں کی ذہنیت بدلی مادہ پرستی' ہوس و لالچ اور خودغرضی و مطلب پرستی' اخلاق مروت' رواداری اور بھائی چارگی پر حاوی آ گئے لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوا تو رہن سہن کے انداز ہی بدل گئے اور رفتہ رفتہ جسے موقع ملا وہ گلشن اقبال' ڈیفنس اور پی ای سی ایچ ایس شفٹ ہو گیا۔ لیکن پروفیسر حمزہ خان اور ان کی بیگم کا رکھ رکھاؤ اور وضعداری جوں کا توں رہا۔

یہاں سبھی فرقوں کے مختلف کاروباری لوگ رہائش پذیر تھے۔ متعدد تعلیمی ادارے' چھوٹے بڑے ہوٹل' اسپتال' پارک اور کھیل کے میدان غرض ہر سہولت میسر تھی بڑے بڑے سیاسی لیڈر تو کب کے یہ علاقہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ لیکن پھر بھی کئی سیاسی اور سماجی رہنما اور چھوٹے موٹے لیڈروں کی رہائش گاہیں یہیں تھیں۔

درحقیقت ترقی اور خوشحالی کی ضامن بھی یہی تمام سہولیات ہیں اور لوگوں کے بہتر سماجی معیار کی نشاندہی بھی انہیں سے ہوتی ہے۔

❁ .... ● .... ❁

پروفیسر حمزہ خان کے تینوں بیٹے جب اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گئے تو وہیں سیٹل ہو گئے لیکن شادیاں انہوں نے پاکستان میں ہی کی تھیں۔ مگر پروفیسر حمزہ اور ان کی بیگم ایک دوسرے کی رفاقت میں بے حد خوش اور مطمئن تھے اور گاہے بگاہے بیٹوں کے پاس امریکا بھی جاتے رہتے تھے مگر پروفیسر حمزہ خان کو زندگی کا شدید دھچکا اس وقت لگا جب اچانک ان کی رفیق حیات ان کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ اچھی بھلی سوئیں اور موت کے فرشتے نے کچھ کہنے سننے کی مہلت بھی نہیں دی اس صدمے نے پروفیسر حمزہ کو ادھ موا کر دیا۔ تینوں بیٹے پاکستان آئے اور باپ کی حالت دیکھ کر انہیں اپنے ہمراہ امریکا لے گئے چھ مہینے پروفیسر صاحب نے امریکا میں گزارے مگر وہاں ان کا دل نہیں لگا۔ بچے اسکول' میاں بیوی جاب پر اور وہ تنہا۔ بچوں کے اصرار کے باوجود وہ واپس آ گئے۔ اپنا ملک اپنا ہوتا ہے محلّہ بھی اپنا تھا اور لوگ بھی اپنے۔ پھر لوگوں نے لاکھ سمجھایا کہ دوسری شادی کر لیں کیونکہ پروفیسر صاحب کہیں سے بھی بوڑھے نہیں لگتے تھے بے حد اسمارٹ اور چاق و چوبند۔ دونوں بیٹے جوان ہوئے تو مذاق کرنے لگے۔

''یار ابو آپ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں تو ہماری ویلیو ڈاؤن ہو جاتی ہے۔'' چھوٹا بھی لقمہ دیتا۔

''سچ کہتے ہیں آپ ابو کی موجودگی میں تو کوئی لڑکی ہمیں گھاس ہی نہیں ڈالتی ہر لڑکی کی نگاہوں کا مرکز ہمارے ابو ہوتے ہیں۔''

پروفیسر صاحب اپنے بچوں کی باتوں سے بڑے محظوظ ہوتے اور اپنی بیگم کو چھیڑنے لگتے۔

''دیکھ زوجہ محترمہ اس عمر میں بھی ہمارا نیک... فرضی کالر جھاڑتے اور بجائے غصے کے نازش کو ہنسی آ جاتی انہیں اپنے شوہر کی عادات و اخلاق پر فخر محسوس ہوتا جن کا ہر شخص گرویدہ تھا۔

❁ .... ● .... ❁

شادی کے لیے تو وہ راضی نہیں ہوئے لیکن انہوں نے ایک کوچنگ سینٹر ضرور کھول لیا جہاں غریبوں کے لیے مفت اور امیروں کے لیے نومنل فیس تھی۔ نازش کی زندگی میں ہی ایک ادھیڑ عمر کی ملازمہ کام کرنے گھر آتی تھی بے حد نیک اور شریف دونوں میاں بیوی اور بچے اس کی بڑی عزت کرتے تھے کیونکہ جوانی میں بیوگی کے باوجود وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے سہارے زندگی گزار رہی تھی جو اسکول میں پڑھتی تھی۔ یہ چھوٹی سی بچی بچپن ہی سے میاں بیوی کی چہیتی تھی پروفیسر حمزہ کو ابو اور نازش کو امی کہتی جو اکثر نازش مذاق کہتی تھیں۔

''لگتا ہے پروفیسر صاحب آپ بیٹی کی کمی میمونہ سے پوری کرتے ہیں۔''

پورا محلہ پروفیسر حمزہ کی شرافت اور وضعداری کا قائل اور معتقد تھا اور ابھی لوگوں کی آنکھوں میں شرم وحیا باقی تھی اس لیے کسی نے انگلی نہیں اٹھائی۔

❁ ● ❁

ایک دن بوا رحمت آئیں تو پریشان اور سہمی ہوئی تھیں۔ اب روئیں کہ جب روئیں۔ پروفیسر صاحب نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''رحمت بوا کیا بات ہے کچھ پریشان لگ رہی ہو؟''

''کیا بتاؤں صاحب میمونہ کے کالج کے سامنے روزانہ ایک پولیس والا آ کر کھڑا ہو جاتا ہے کہتا تو کچھ نہیں مگر روزانہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے گھر تک آتا ہے اور جونہی وہ گلی میں مڑتی ہے غائب ہو جاتا ہے آپ کو تو معلوم ہے میرا گھر کالج کے پیچھے ہی ہے۔''

''تو بھئی اس میں پریشانی والی کیا بات ہے اس نے بھی کچھ کہا تو نہیں۔''

''صاحب آپ جانتے ہیں پولیس والوں کی دشمنی بھی بری اور دوستی بھی میمونہ بے حد پریشان ہے۔ آپ تو جانتے ہیں پولیس کا محکمہ ویسے ہی بہت بدنام ہے۔'' بوا ایک دم رونے لگیں۔

''اچھا' اچھا تم پریشان مت ہو کل میں خود دیکھ لوں گا کہ مسئلہ کیا ہے؟'' حمزہ خان نے بوا رحمت کو تسلی دی۔

❁ ● ❁

شام کو پروفیسر حمزہ ٹہلتے ہوئے باہر نکلے تو ایک جگہ محلے کے چیدہ چیدہ لوگوں کو اکٹھا دیکھ کر اس طرف بڑھ گئے۔

''اب تو حد ہو گئی ہے نہ کسی کی عزت محفوظ ہے نہ کسی کی جان۔ ان پولیس والوں نے تو بے غیرتی کی حد کر دی ہے لگتا ہی نہیں کہ ہم ایک آزاد اسلامی ملک میں رہ رہے ہیں اور جب سے یہ نیا ایس ایچ او آیا ہے اس وقت سے تو غریبوں اور شریفوں کی پگڑیاں خوب ہی اچھل رہی ہیں۔ اس تھانے دار نے تو اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ راستے چلتے میاں بیوی کو پکڑ کر نکاح نامہ مانگتے ہیں۔ بھلا بتاؤ کیا لوگ جیبوں میں نکاح نامہ لے کر گھومتے ہیں اور پھر حدود آرڈیننس میں اندر بند کرنے کی دھمکی دے کر جیبیں خالی کرا لیتے ہیں۔ اچھی خاصی شریف لڑکیوں پر بدچلنی کا الزام لگا کر تھانے میں بند کر دیتے ہیں اور بے چارے غریب لوگ جن کی کوئی سفارش نہیں ہے رقم دے دلا کر بچی لاتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں کہ عزت محفوظ رہ گئی۔'' پروفیسر صاحب کو اپنے درمیان دیکھ کر ایک بزرگ جوش سے بولے۔

''پروفیسر صاحب آپ کا تو کافی اثر و رسوخ ہے خدا کے لیے آپ ہی کچھ کیجیے اس تھانے دار کے لیے ہم غریب کس کے پاس فریاد لے کر جائیں۔ جب عزت کے محافظ اور رکھوالے ہی لٹیرے بن جائیں تو پھر اس قوم کا اللہ ہی حافظ ہے۔''

❁ ● ❁

آج کل پروفیسر بڑے خوش اور مگن رہنے لگے تھے۔ وجیہہ اور شکیل تو وہ پہلے ہی تھے بننے سنورنے اور خوب صورت لباس نے ان کی شخصیت میں ایک ایسا نکھار سا پیدا کر دیا تھا بوا بھی حیران تھیں اور سارا محلہ پریشان کہ اچانک یہ پتھر میں جونک کیسے لگ گئی کیونکہ وہ آج کل ایک لڑکی کے ساتھ دیکھے جا رہے تھے۔ مگر ان کی شرافت اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ کسی کو پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی لیکن بوا رحمت خود کو نہ روک سکیں۔

''بیٹا میں یہ کیا سن رہی ہوں۔''

''کیا رحمت بوا'' وہ بے پروائی سے اپنے اوپر ڈھیروں ڈھیر اسپرے کرتے ہوئے بولے۔

''تم ایک لڑکی کے ساتھ گھومتے رہتے ہو۔''

''بوا رحمت تمہیں کس بات پر اعتراض ہے لڑکی پر یا گھومنے پر۔'' انہوں نے مذاق میں بات اڑا دی۔

''صاحب سیدھی صاف بات ہے اس سے اچھا ہے کہ آپ شادی کر لیں۔''

''شادی۔ بوا میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ نازش کے بعد میری زندگی میں کسی کی گنجائش نہیں۔ تمہاری بیگم صاحبہ کی رفاقت اور محبت اتنی کمزور نہ تھی جو آسانی سے بھلائی جاسکے ابھی تو میرے چاروں طرف ان کی یادوں کی برات ہے۔'' وہ افسردہ ہوگئے۔

''تو پھر یہ کسی لڑکی کے ساتھ گھومنے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' بوا نے اعتراض کیا۔

''کمال ہے ایک لڑکی کے ساتھ گھومنے پھرنے کا مطلب شادی تو نہیں وہ میری صرف دوست ہے۔''

''اس سے پہلے تو آپ نے کبھی کسی لڑکی کو دوست نہیں بنایا۔'' بوا جل کر بولیں۔

''تو اب بنالیا ویسے وہ میری بیوقوفی تھی اچھا چھوڑیں یہ بتائیں میمونہ کیسی ہے۔''

پروفیسر حمزہ نے موضوع بدلا تو بوا خوش ہو کر بولیں۔

''بہت خوش سارا وقت آپ کو جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں دیتی ہے اور میرے منہ میں تو وہ زبان ہی نہیں جس سے میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔ جس طرح آپ نے عزت سے میری بیٹی کو رخصت کیا ہے اس کے لیے میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔'' بوا شکر کے مارے آبدیدہ ہوگئیں۔

''خدا کے لیے بوا مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹیں آپ جانتی ہیں تین بیٹوں کے بعد جب ہم نے بیٹی کی امید چھوڑ دی تو یہ میمونہ ہی تھی جس نے بیٹی کی کمی پوری کی تو پھر باپ کا فرض تو نبھانا تھا نا۔'' کہتے کہتے ان کی نگاہوں میں چھ ماہ پہلے کا زمانہ گھوم گیا۔

❁ ❁ ❁

کالج کی چھٹی ہوتے ہی میمونہ اپنی گلی میں [illegible] ہوئی اور جونہی کانسٹیبل واپس پلٹا اور پروفیسر صاحب جو اس کے تعاقب میں تھے انہوں نے فوراً اسے جالیا۔

''بیٹھو۔'' گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

یہ شاید پروفیسر صاحب کی بارعب شخصیت تھی کہ کانسٹیبل خاموشی سے کچھ کہے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''کب سے اس لڑکی کا پیچھا کر رہے ہو اور کیوں؟'' پروفیسر صاحب نے نسبتاً سنسان روڈ پر گاڑی موڑتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو تم مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرو ورنہ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔''

''میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں پروفیسر حمزہ صاحب اور میرا نام فرحان ہے اور میں میمونہ کا پیچھا نہیں کرتا اس کی حفاظت کرتا ہوں۔''

''تم نے اس کی حفاظت کا ٹھیکہ کب سے لیا؟'' پروفیسر صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

''جب سے اس سے پیار ہوا ہے۔'' فرحان نے دھڑلے سے جواب دیا۔ ''شادی کرنا چاہتا ہوں میمونہ سے اس لیے اس کی عزت و ناموس کی وجہ سے روز اس کو گھر تک چھوڑ کر جاتا ہوں۔''

پروفیسر صاحب نے بے ساختہ بریک لگائے اور فرحان کی طرف گھوم گئے۔

بعد کی کہانی بہت سیدھی سادی تھی۔ فرحان حیدر آباد کا رہائشی تھا اور بیروزگاری سے تنگ آ کر اس نے پولیس کی ملازمت اختیار کی تھی ورنہ وہ ایک شریف نیک اور پڑھا لکھا لڑکا تھا۔ جانے کب اور کہاں اس نے میمونہ کو دیکھا اور اس کے بارے

میں معلومات حاصل کیں اور پھر اس سے شادی کا ارادہ کرلیا۔

پروفیسر حمزہ اس کی صاف گوئی سے بے حد متاثر ہوئے ہر طرح سے اس کے بارے میں اطمینان کرنے کے بعد انہوں نے میمونہ کا رشتہ اس سے طے کردیا۔ شادی چھ ماہ بعد قرار پائی تاکہ میمونہ گریجویشن کرلے۔ اسی دوران پروفیسر صاحب کی کوششوں سے فرحان کو حیدر آباد کے کالج میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ سب خوش تھے اور ابھی فرحان نے حیدر آباد میں جوائن نہیں کیا تھا کہ وہ حادثہ ہوگیا جس نے اس خاندان کی خوشیوں کو آگ لگادی۔

پروفیسر صاحب ابھی کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ فرحان آگیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں چہرہ زرد اور سانس پھولا ہوا تھا۔ ''پروفیسر صاحب غضب ہوگیا میمونہ کو کسی نے کالج سے نکلتے ہوئے اغوا کرلیا۔''

''تم کہاں تھے اس وقت؟'' پروفیسر حمزہ کے پیروں سے زمین نکل گئی میمونہ ان کو بیٹی کی طرح عزیز تھی۔

''میں وہیں تھا اچانک ایک کار اس کے نزدیک آکر رکی اور زبردستی دو افراد نے اسے گاڑی میں دھکیل دیا دوپہر کا وقت تھا گلی بھی سنسان تھی میں کچھ بھی نہ کرسکا اور فائدہ بھی نہ تھا سوائے اس کے کہ میمونہ کی بدنامی ہوتی مگر میں جانتا ہوں میمونہ اس وقت کہاں ہوگی۔ میں تو کچھ نہیں کرسکتا مگر آپ ضرور اسے بچا سکتے ہیں۔ اس علاقے کے ایس ایچ او کا کام ہی خوب صورت اور غریب لاوارث لڑکیوں پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔''

''تم اس کا ٹھکانہ جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح بس آپ میرے ساتھ چلیں۔''

''مجھے کچھ سوچنے دو اس طرح جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' پروفیسر حمزہ نے ڈائری اٹھائی اور ایک نمبر ملا کر کسی سے انگلش میں بات کی۔ وہ ایک مشہور کالج سے ریٹائرڈ ہوئے تھے اور ان کے شاگرد آج بڑی بڑی پوسٹوں پر تھے اور وہ پروفیسر صاحب کی بہت عزت بھی کرتے تھے کیونکہ تعلیم کو کبھی پروفیسر صاحب نے کمائی کا ذریعہ نہیں سمجھا تھا یہ ان کا شوق، لگن، عبادت اور جذبہ تھا۔ ہر طالب علم ان کا مداح اور ان سے محبت اور عقیدت رکھتا تھا اور پھر ان کی بھاگ دوڑ اور کوششوں سے شام ہونے تک میمونہ ان کے سامنے تھی۔ پروفیسر صاحب کو دیکھتے ہی وہ ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''ابو میں بچ گئی ابو میں آپ کی وجہ سے آج بے موت مرنے سے بچ گئی۔'' میمونہ کا ایک ایک آنسو ان کے دل پر شعلوں کی طرح دہک رہا تھا اور ان پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایس ایچ او نے انہیں کینہ توز نظروں سے گھورا مال کا اس طرح نکل جانا اس کے لیے تازیانے سے کم نہ تھا مگر وہ بے بس تھا پروفیسر کی نظروں میں اس کا چہرہ کھب گیا تھا۔ پھر انہوں نے میمونہ کی شادی کرنے میں دیر نہ کی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوسکی کہ میمونہ کتنے بڑے حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچ گئی۔ مگر پروفیسر صاحب کے سینے کی آگ بجھ نہ سکی۔

❁ ❁ ❁

''آخر آپ مجھے اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتے۔'' سی ویو پر پروفیسر حمزہ کے ساتھ ٹہلتے ہوئے اس خوب صورت سی لڑکی فضاء کا اصرار تھا۔

''دیکھو جس محلے میں، میں رہتا ہوں وہاں میری

عزت ہے ساکھ ہے اور مقام ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو لوگ خوامخواہ باتیں بنائیں گے اور خود سے زیادہ مجھے تمہاری عزت پیاری ہے اور ذرا یہ تو بتاؤ تم مجھے اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتیں۔ اپنے بھائی جان سے کیوں نہیں ملواتیں۔'' انہوں نے سوال کیا۔

''نا بابا میں ایسا نہیں کرسکتی بھائی جان کو مجھ پر بڑا مان ہے بڑا فخر اور غرور ہے وہ ابھی اتنے آزاد خیال نہیں ہوئے کہ اپنی بہن کے دوستوں سے ملیں اور وہ بھی مرد۔ وہ تو لڑکیوں سے بھی نظر اٹھا کر بات نہیں کرتے بے حد شریف اور نیک انسان ہیں۔ کالج آنے کی بھی بڑی مشکلوں سے اجازت ملی ہے۔ روزانہ ایک چوکیدار مجھے لینے اور چھوڑنے آتا ہے وہ تو آپ کی خاطر میں کلاس بیچ میں چھوڑ کر آجاتی ہوں اور پھر چھٹی سے پہلے کالج کی بھیڑ میں جاکر شامل ہوجاتی ہوں۔''

''تو نہ کلاس چھوڑا کرو مت آیا کرو میں تمہیں مجبور تو نہیں کرتا۔'' پروفیسر حمزہ نے بے پروائی سے کہا۔

''یہ میرے بس میں نہیں۔'' فضاء بے بسی سے بولی۔ ''آپ کی شخصیت' آپ کا لہجہ' آپ کا بات کرنے کا انداز اف مجھ پر سحر سا طاری ہوجاتا ہے۔ بے بس ہوجاتی ہوں میں مجھے اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ نہ بھائی جان کی عزت نہ وقار نہ رعب نہ دبدبہ یاد رہ جاتی ہے تو صرف آپ کی شخصیت اور آپ کی باتیں میں کیا کروں۔'' فضاء بے بسی سے رو پڑی۔

''دیکھو فضاء اگر تمہارے بھائی جان کو پسند نہیں تو تم مجھ سے ملنے مت آیا کرو میں تمہارا دوست ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔'' پروفیسر حمزہ کو فضا کے رونے سے تکلیف ہورہی تھی۔

''تو آپ اس دوستی کو کوئی جائز نام کیوں نہیں دے دیتے۔'' فضاء نے جھجکتے ہوئے شرما کر کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' پروفیسر صاحب نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

''میرا مطلب ہے آپ مجھ سے شادی کرلیں۔'' وہ ہکلا کر بولی۔

''پاگل ہوئی ہو اپنی اور میری عمر کا فرق دیکھا ہے۔'' پروفیسر حمزہ جھنجلا کر بولے۔

''میں کسی فرق کو نہیں جانتی۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں اور آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''دیکھو فضاء...!'' پروفیسر حمزہ تحمل سے گویا ہوئے۔ ''تم ابھی بچی ہو اور وقتی جذبات کا شکار ہو رہی ہو۔ میں ریٹائرڈ ہوچکا ہوں۔ تین جوان بیٹوں کا باپ ہوں۔ کیا سوچیں گے وہ اور یہ پورا معاشرہ کہ اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے شادی کرلی۔ میں تو مذاق بن کر رہ جاؤں گا لوگ مجھے ہوس زدہ بڈھا کہہ کر پکاریں گے۔''

''کیا ہوگیا ہے آپ کو کیوں خود کو ڈی گریڈ کر رہے ہیں نہ آپ کہیں سے ساٹھ سال کے لگتے ہیں اور نہ میں اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے پچیس سال کی۔'' فضاء نے جھنجلا کر کہا۔

اور یہ حقیقت تھی کہ اپنے لمبے قد اور فربہ ڈیل ڈول کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے بڑی لگتی تھی اور پروفیسر صاحب تو تھے ہی عمر چور۔

''پھر ایسا کرو کسی روز اپنے بھائی جان سے ملوا دو۔''

''یہی تو مشکل ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''بھائی جان کبھی بھی راضی نہیں ہوں گے۔ ویسے تو آپ کے پاس سب کچھ ہے عزت' دولت' شہرت

اور نیک نامی لیکن ہمارے خاندان سے باہر شادی نہیں ہوتی اپنے علاوہ رشتہ نہ دیتے ہیں نہ لیتے ہیں۔''

''تو مان لو یہ بات ناممکن ہے۔'' پروفیسر حمزہ نے اس کی بات کاٹی۔

''کیسے مان لوں میرا دل نہیں مانتا۔ آپ کے بغیر سوچوں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ زندگی بے معنی ہوجاتی ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''اچھا سنو اس موضوع پر کسی پرسکون جگہ چل کر بات کریں گے کسی دن آجاؤ شام کو۔''

''پرسوں شام کیسا رہے گا بھائی جان کو کسی کام سے جانا ہے۔ پرسوں رات وہ دیر سے آئیں گے۔''

۞ ۞ ۞
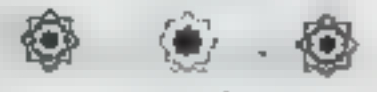
پروفیسر حمزہ نے پہلے ہی ایک ہٹ ہاکس بے پر بک کرائی تھی اتوار کی تفریح کی وجہ سے ساحل سمندر پر بے پناہ رش تھا لیکن یہ ہٹ کافی ہٹ کر ایک سنسان جگہ پر تھی۔ ایک روز پہلے شہر میں ہنگاموں کی وجہ سے زیادہ تر ہٹس خالی تھیں۔ ہر ہٹ کا دروازہ کوریڈور میں کھلتا تھا لیکن سیڑھیاں جدا جدا تھیں۔

پروفیسر حمزہ کے ساتھ فضاء آ تو گئی لیکن کمرے میں آکر خوف زدہ ہوگئی۔

''آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں دیکھیے اب تو اندھیرا بھی پھیلنا شروع ہوگیا ہے۔'' وہ سہمے اور ڈرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کیا تم مجھے نفس کا مارا ہوا شیطان سمجھتی ہو مجھ پر بھروسا نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولے لیکن بے چینی ان کے چہرے سے مترشح تھی۔

''نہیں نہیں آپ پر تو خود سے زیادہ بھروسا ہے لیکن دیر ہوگئی تو امی پریشان ہوجائیں گی۔ ان سے ایک دوست کے گھر کا بہانہ کرکے آئی ہوں۔''

اسی لمحے پروفیسر صاحب کا موبائل بج اٹھا۔

''ایکسیوزمی۔'' وہ موبائل لے کر دور چلے گئے اور دھیمی دھیمی سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ اس دوران فضاء ہٹ کا جائزہ لینے لگی جو کشادہ اور خوب صورت تھی۔

''میں دو منٹ میں آرہا ہوں تم گھبرانا نہیں بس ذرا دروازہ بھیڑ لو۔''

بغیر آہٹ پیدا کیے وہ پھرتی سے برابر والی ہٹ میں داخل ہوگئے ان کی نگاہیں اپنی ہٹ کی سیڑھیوں پر لگی تھیں اور کان اس آہٹ پر جو کسی کے سیڑھیاں چڑھنے سے پیدا ہورہی تھیں۔ انہوں نے تیزی سے سوئچ دبایا اور یکلخت ہر طرف گھمبیر اندھیرا چھا گیا اور اسی لمحے کسی نے پروفیسر صاحب کی ہٹ کا دروازہ کھولا پروفیسر حمزہ کو اسی وقت کا انتظار تھا وہ ایس ایچ او کو بھولے نہیں تھے انہوں نے پھرتی سے سوئچ آن کردیا اور فضاء کی چیخ سے ہٹ گونج اٹھی۔

''بھائی جان......!''

پروفیسر حمزہ نے نیچے اتر کر اس گاڑی میں بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی جس کو فرحان ڈرائیو کررہا تھا۔ وہ سیٹ سے ٹیک لگا کر پرسکون ہوگئے۔ انہوں نے طمانیت سے آنکھیں بند کرلیں۔ آج انہوں نے ایس ایچ او سے میمونہ کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا تھا۔ شاید اپنی بہن کو ''اپنے شکار'' کے طور پر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل جائیں۔

☐

قسط نمبر 13

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

"تم نے نوٹ نہیں کیا کہ تمہاری اور آنٹی روشن کی شکل آپس میں کتنی زیادہ ملتی ہے.....!" اس نے معنی خیز اور انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"کیا.....؟" میں بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو حشام... تمہارا مطلب ہے کہ... تمہارا مطلب یہ ہے کہ... وہ... وہ میری ماں ہوسکتی ہیں......!" میں نے اپنے چکراتے ہوئے ذہن اور لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ تحیر زدہ لہجے میں کہا۔

"سو فیصد!" اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ذہن ایک دم ماؤف ہوگیا تھا' میری زندگی کا یہ سب سے اہم انکشاف تھا' اتنا بڑا شاک تو مجھے اس وقت بھی نہیں لگا تھا جب مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ امی میری سگی امی نہیں ہیں اور اس وقت بھی نہیں جب یہ معلوم ہوا کہ نواب سطوت ہی میرا وہ ظالم باپ ہے جو میری جان کا دشمن تھا اور میری ماں اسی ظالم کے پنجوں سے بچا کر مجھے گھر سے لے کر بھاگی تھی اور راہ چلتے ہوئے ایک اجنبی کے حوالے کردیا تھا۔

میری زندگی میں میرے لیے کتنے جھٹکے ہیں۔ روشن آنٹی ہی میری ماں ہیں تو پھر بابا نے انہیں کیوں نہیں پہچانا اور اگر پہچان لیا تھا تو یہ اتنی اہم بات مجھ سے کیوں چھپائی۔

میرے ذہن میں لاتعداد سوالات کلبلا رہے تھے اور تمام سوالوں کے جوابات مجھے اپنے گھر میں موجود لوگوں ہی سے مل سکتے تھے۔ میرا ذہن بار بار ان سب کی جانب سے نیگیٹو اور پازیٹو ہو رہا تھا۔ آخر مجھ سے یہ سب چھپانے کی کیا وجہ ہے......؟

بابا تو اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میرے دل میں اپنے ماں باپ کو پانے کی کتنی تڑپ تھی' خاص کر اپنی ماں سے...... میں نے بار بار بابا اور امی کے آگے یہ بات کہی تھی کہ اگر مجھے میری ماں مل جائے تو میں اس سے یہ سوال ضرور کروں گی' کہ تم نے کیا سوچ کر مجھے ایک اجنبی کے حوالے کردیا' اور میرے باپ کی نشانیاں وہ مال و متاع اس کے حوالے کردیا' نہیں ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ انجانا شخص کیوں کر تمہاری اولاد کو لے گا' ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے جان سے مار کر کہیں پھینک دیتا اور سارا مال ہڑپ کر جاتا' اسے کون پوچھنے والا تھا' یا یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ مجھے غلط ہاتھوں میں فروخت کردیتا' انہیں کیوں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ وہ جس کے حوالے مجھے کر رہی ہیں وہ مجھے ضرور زندہ رکھے گا اور میری پرورش بھی بہتر انداز میں کرے گا۔

"کیا سوچ رہی ہو سرمئی...؟" حشام نے بڑے پیار سے اپنی انگلی سے میری تھوڑی کو چھو کر میرا جھکا ہوا سر اونچا کیا اور میری نمکین پانی سے بھری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا' لیکن میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے دوبارہ بٹھاتے ہوئے خود بھی میرے قریب بیٹھ گیا اور دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو میں نے بولنا چاہا لیکن الفاظ میرے حلق میں جیسے پھنس کر رہ گئے تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میرا مطلب تھا کہ کچھ بھی تو نہیں۔

"تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو' یہ تو اچھی بات ہے کہ تمہیں تمہاری امی مل گئیں' تمہاری تو ہر ٹینشن ہی دور ہوگئی۔" اس نے اپنی لرزتی انگلی سے میری آنکھ سے بہہ آنے والے شریر پانی کے قطرے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ حشام میرے اتنے قریب بیٹھا تھا ورنہ اس نے میرے ہاتھوں کو میرے چہرے کو چھوا تھا' ورنہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا اور کون سی کیفیت تھی کہ میں نے خود بخود حشام کے کندھے سے اپنا سر ٹکا دیا۔ اور میری سسکیاں تیز ہوتی چلی گئیں۔

میری اس غیر متوقع حرکت سے حشام دم بخود رہ گیا۔ اسے میری اس بے ساختہ حرکت کا جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا اور پھر سرشاری کے انداز میں اس نے اپنا بازو میرے گرد حمائل کردیا اور مجھے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

حشام کے دل کے دھڑکنے کی صدا مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ میری پشت سہلا رہا تھا۔

اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہ کیا حرکت کی ہے تو میں اس کے بازوؤں میں کسمسائی تو اس نے اپنے بازو میرے گرد سے ہٹالیے' وہ بہت مسرور دکھائی دے رہا تھا اور پرشوق نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

"سوری... !" میں نے جھینپ کر کہا۔

"سوری! فار واٹ......؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس بچکانہ حرکت کے لیے' جو مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔" میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے کہا۔

"اور میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے ان جذباتی لمحات میں مجھے اپنا سمجھا اور میرے قریب آگئیں۔"

"اچھا فضول باتیں مت کرو... ورنہ سر پھاڑ... !"

"وں ہوں!" اس نے جھٹ میرے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے جملہ پورا کرنے نہیں دیا اور میری آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"اب نہیں... جو کچھ تم نے کیا وہی تو میرا حق ہے۔"

"لیکن حشام..."

"بس!" اس نے ایک بار پھر وہی حرکت دہرائی اور خمار آلود لہجے میں بولا۔ "آج میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ میرے دل میں جو ایک سوال نہ جانے کب سے

مجھے ستار ہا تھا آج مجھے اس کا جواب مل گیا ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ میرے دل میں تمہاری محبت کی جو چنگاری سلگ رہی تھی' اس کی آنچ تمہارے دل تک بھی پہنچ گئی ہے اور اس ہلکی لو دیتی آنچ نے ایک کٹھور کے دل کو بھی پگھلا دیا ہے' میں سچ کہہ رہا ہوں نا... !"

"مجھے نہ جانے کیوں حشام سے شرم آنے لگی' اور میں نے اپنے آپ کو اس کیفیت سے جلد ہی نکال لیا اور حشام سے سوال کیا۔

"حشام کیا تم یہ بات اتنے وثوق سے صرف اسی لیے کہہ رہے ہو کہ روشن آنٹی ہی میری سگی ماں ہو سکتی ہیں کہ ان کی اور میری شکل اتنی ملتی ہے؟"

"ظاہری بات ہے۔" اس نے جھٹ کہا۔

"جب ہی تو روشن آنٹی کو دیکھ کر مجھے بار بار ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے۔ میں جب جب آئینے میں خود کو دیکھتی اور مجھے ایسا ہی لگتا تھا لیکن یہ نہیں سوچا کہ ان کی اور میری شکل بہت ملتی ہے۔"

پھر میں نے اپنے ذہن میں آنے والے سارے سوال حشام کے آگے دہرا دیئے تو وہ پر سوچ لہجے میں بولا۔

"اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"نہیں نہیں میں تمہاری کسی بات کا قطعی برا نہیں مانوں گی' جو بھی تمہارے ذہن میں آرہا ہے تم بلا جھجک کہہ دو۔" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے' تمہاری مرحومہ امی نے اور شمسو بابا دونوں نے تم سے غلط بیانی سے کام لیا ہے' روشن آنٹی ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں اور ان سے اس حماقت کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ یوں برسات کی اندھیری رات میں یوں تمہیں کسی اجنبی کے حوالے کر جاتیں۔ کیا تمہارا ذہن اس بات کو مانتا ہے' کم از کم میرا ذہن تو اس بات کو قطعی تسلیم نہیں کرتا' روشن آنٹی یقیناً تمہاری مرحومہ امی کو پہلے سے جانتی تھیں اور انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر تمہیں ان کے حوالے کیا تھا۔"

"لیکن امی تو..." میں یہ بات کہتے کہتے رک گئی کہ امی تو مشہور زمانہ سرمئی بائی تھیں' میں نے حشام کو سب کچھ بتا دیا تھا سوائے اس ایک راز کے... اور اس راز کو میں کبھی کسی کے سامنے آشکار نہیں کر سکتی تھی' کسی بھی قیمت پر۔

"لیکن کیا؟" حشام نے کہا۔

"چھوڑو اس بات کو' شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو اب ساری حقیقت کیا ہے یہ تو انہیں بتانی ہی پڑے گی۔" میں نے کہا۔

"اچھا دیکھو تم گھر جاؤ تو ذرا طریقے سے بات کرنا... یہ نہیں کہ حسب عادت جاتے ہی ان لوگوں پر فائرنگ شروع کر دینا۔" حشام نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں ہر وقت گن ہاتھ میں لے کر گھومتی ہوں۔" میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"تمہاری زبان کسی گن سے کم ہے کیا؟" اس نے سابقہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' میں جا رہی ہوں' اور ہاں اب تم اپنے آپ کو مجھ سے بچا کر رکھنا... !" میں نے تیزی سے سائڈ میں رکھا ہوا بیگ موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھائی اور دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

"ارے کیا ناراض ہو کر جا رہی ہو' میں تو مذاق کر رہا تھا' ابھی تو ہماری خوش گوار دوستی کا آغاز ہوا ہے اور تم نے ناراضگی کی ابتداء بھی کر دی۔" حشام بھاگ کر میرے سامنے آگیا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"پھر تم مجھے تنگ کیوں کرتے ہو۔" میں نے منہ بنا کے کہا۔

"میں تو تمہاری ٹینشن دور کر رہا تھا' میں چاہتا ہوں کہ تم بہت ہلکی پھلکی ہو کر گھر جاؤ' اور بہت ریلیکس ہو کر ساری بات کرو۔" اس نے جھٹ میرا ہاتھ تھام کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے گرم گرم ہاتھوں کے مس کو محسوس کر کے میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوئی' اور ایک عجیب سے سکون اور طمانیت کا احساس میرے رگ و پے میں سرائیت کرنے لگا۔ میرے لبوں پر خود بخود مسکراہٹ عود آئی اور میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آئی وش یو اے گڈ لک۔" اس نے دھیرے سے میرے ہاتھ کو اپنے لبوں سے لگا کے چھوڑ دیا اور میں بمشکل اپنے لرزتے وجود کو سنبھالتی ہوئی اپنی گاڑی تک آگئی۔ حشام میرے پیچھے پیچھے چلا آیا' میری پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے آگئے۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اگنیشن میں چابی گھمائی تو وہ کھڑکی سے جھانکنے لگا' میں نے اس سے نگاہیں چراتے ہوئے اسے گڈ بائے کہا' کیونکہ اس کی نگاہوں کا والہانہ پن میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا' نہ جانے کیوں اس کے سامنے مجھے وہ تمام دیواریں گرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں جو میں نے اپنے اردگرد بنا رکھی تھیں' حشام کی محبت کا سیلاب ان تمام پتھریلی دیواروں کو بہا کے لیے گیا تھا۔

راستے بھر میرا دماغ مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں بات کہاں سے شروع کروں گی۔

گھر پہنچی تو سب کچھ نارمل تھا' لاؤنج میں اماں بابا اور آنٹی تینوں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تینوں نے ہی خوشی کا اظہار کیا لیکن میرے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کو دیکھ کر وہ فکر مند ہو گئے۔ بابا بولے۔

"خیریت تو ہے ناں بٹیا' حشام بیٹے کے ہاں سب ٹھیک ہے۔"

"جی!" میں نے مختصر جواب دے کر اپنا سر صوفے کی پشت گاہ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

"لگتا ہے حشام بیٹے سے لڑائی ہو گئی ہے۔" اماں نے کہا۔

"نہیں تو!" میں نے آنکھیں کھول کر سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا اور میری نگاہیں آنٹی کے چہرے پر ٹک گئیں۔ میں بہت غور سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے میں اپنے خدوخال تلاش کر رہی تھی۔ مجھے اپنی جانب تکتے ہوئے دیکھا تو بولیں۔

"کچھ تھکی ہوئی لگ رہی ہو' چائے لاؤں تمہارے لیے...؟"

"نہیں میں ابھی پی کر آئی ہوں۔" میں ان کے انتہائی محبت سے کہے گئے جملے کو برداشت نہ کر سکی اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی' میں کچھ دیر کے لیے سونا چاہتی تھی۔ اس لیے بیڈ پر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر میں ہی میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھی کہ رات ہو گئی ہے' پتا نہیں کیا ٹائم ہو گیا' میں نے اندھیرے میں ہی ٹیبل پر ہاتھ مارا تو موبائل ہاتھ میں آگیا' میں نے سونے سے پہلے موبائل فون سائلنٹ پر کر دیا تھا' دیکھا تو حشام کی دس بارہ مس کالز آئی ہوئی تھیں میں سمجھ گئی کہ وہ بہت پریشان ہو رہا ہوگا اور جب میری جانب سے رپلے نہیں ملا ہوگا تو اور زیادہ پریشان ہو رہا ہوگا اس لیے میں نے اسے ایس ایم ایس کر دیا کہ میں تھوڑی دیر میں تمہیں کال کرتی ہوں۔ موبائل پر ٹائم دیکھا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ بے وقت سونے کی وجہ سے سر بھی

بھاری ہورہا تھا' ایک گرم چائے کی طلب ہورہی تھی' اس لیے میں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

لاؤنج میں سناٹا پڑا تھا' بابا کے کمرے میں جھانکا تو وہ کرسی پر بیٹھے عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے۔ کچن میں جھانکا تو اماں وہاں بھی نہیں تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ اماں آنٹی کے کمرے میں ہیں۔

میں دبے قدموں آنٹی کے کمرے کی جانب بڑھی دروازہ بند تھا' اندر سے دونوں کی باتوں کی آوازیں آ تو رہی تھیں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' پہلے تو میں نے سوچا کہ اندر چلی جاؤں پھر کچھ سوچ کر میں دروازے سے ہٹ کر گیلری سے ہوتے ہوئے کمرے کے پچھلی طرف کھڑکی کی جانب بڑھی' کھڑکی کھلی تھی اور اس پر پردہ پڑا تھا' میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی' اب اندر جو باتیں ہورہی تھیں' وہ مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں' اور ان باتوں کو سن کر میرا دماغ چکرانے لگا' اور میں اپنے چکراتے ہوئے دماغ کے ساتھ نیچے بیٹھتی چلی گئی' اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

سلمان کو میں نے یہی بتایا تھا کہ میں نے ایک حسین پری کو اپنے فلیٹ پر بلایا ہے' ہوسکتا ہے کہ میں آج رات نہ بھی آؤں' یہاں کا سب تم سنبھال لینا اور دیکھو میری اس بات کی خبر کسی اور کو نہ ہو۔

"یار شہروز میں تو کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن تمہیں پھر میرا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ یار بھی نواب صاحب نہیں ہوں تو ایک چانس مجھے بھی دینا' بہت عرصہ ہوا ہے کہ۔" اس نے فحش انداز میں ایک آنکھ بند کر کے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"تو فکر نہ کر اور کسی سے ذکر نہ کر' پھرتے موجاں ای موجاں۔ ۔ !" میں نے ہنستے ہوئے اس کی کمر پر ہاتھ مارا تو میرے ایک ہی ہاتھ کے دھکے سے وہ تھوڑا سا جھک گیا۔

"اوئے ہتھ ذرا ہولاں رکھیں ۔ ۔ !" اس نے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔

"تمہارے اندر دم خم کم ہے جب ہی تو میں تمہیں چھوٹی دنیا کہتا ہوں۔" میں نے مذاق سے کہا۔

"دم خم ۔ ۔ !اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور اپنی انگلی کنپٹی پر مارتے ہوئے بولا۔

"اپنا سارا دم خم یہاں ہے' یہاں۔"

"بالکل بالکل یار میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا۔ تم اتنے کام کے بندے نہ ہوتے تو نواب صاحب کی نگاہوں میں کیسے جچتے۔"

میری زبان سے تعریف سن کر وہ پھولے نہیں سمایا اور اترا کر کالر جھاڑنے لگا۔

سلمان سے جان چھڑا کر میں گلشن اقبال کی جانب روانہ ہوگیا اور اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ میں بڑی بے صبری کے ساتھ ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا پھر انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اچانک میرے موبائل فون کی گنگناہٹ سنائی دی' میں سمجھا اس جرنلسٹ سرمئی کا فون ہوگا' لیکن نمبر دیکھا تو سلمان کا فون تھا' میں نے آتے ہوئے اسے اپنا نمبر دے دیا تھا اور احتیاطاً اس کا نمبر بھی لے لیا تھا کہ اگر بالفرض کوئی غیر معمولی بات ہو تو فوراً مجھے کال کرے' سلمان کا نمبر دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے' اس لیے جلدی سے بٹن پش کر کے کان سے لگایا اور کہا۔

"ہاں سلمان کیا ہوا؟ سب خیریت تو ہے" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں یار خیریت نہیں بھی ہے اور ہے بھی' بس فوراً چلے آؤ۔" سلمان نے کہا۔

"لیکن کیوں ۔ ۔ ؟ آخر ہوا کیا ہے' ابھی میں آیا تھا تو سب ٹھیک تھا۔" میں نے اچنبھے سے کہا۔

"تمہارے جانے کے فوراً بعد ہی نواب صاحب کا فون آیا تھا کہ وہ یہاں آ رہے ہیں۔" سلمان بولا۔

"حیرت ہے' میری ان سے بات ہوئی تھی تب تو انہوں نے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔"

"ہوسکتا ہے تم سے بات کرنے کے بعد ان کا پروگرام بن گیا ہو۔ بہرحال اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم آتے ہو یا نہیں۔ میرا فرض تھا کہ تمہیں اطلاع دے دوں۔" سلمان نے کہا۔

"بہت شکریہ دوست' تم نے بہت اچھا کیا کہ مجھے بروقت اطلاع کردی' میں فون کر کے اس کو یہاں آنے سے منع کر دیتا ہوں۔ بس پھر ادھر سے نکلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

مجھے یہ سوچ کر ہی بہت غصہ آ رہا تھا کہ نواب کمبخت کو بھی ابھی آنا تھا۔ اتنی مشکلوں سے سلمان سے اتنے سارے جھوٹ بولنے پڑے بہانے بنانے پڑے تب جا کر یہ موقع ہاتھ آیا تھا اور اب یہ نواب آ رہا ہے' میں نے ابھی اس سے بات کی تھی تب تو اس نے منع کردیا تھا' کل ہی آ جاتا' خیر میں اب یہاں بیٹھے رہنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا' اس لیے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے آج کی اس ملاقات کو منسوخ کر دینا چاہیے' لیکن کیسے۔ ۔ ؟ میں سوچنے لگا کہ میرے پاس تو سرمئی کا موبائل نمبر ہی نہیں ہے' پھر خیال آیا کہ نیوز چینل فون کر کے اس کا نمبر لے لیتا ہوں۔

نیوز چینل والوں نے ڈھیروں سوالات کرنے کے بعد مجھے اس کا نمبر دیا اور میں نے اسے اپنے الفاظ میں ساری سچویشن بتا کر معذرت کرلی۔ سرمئی کو فون کرنے کے بعد میں ابھی باہر نکلنے ہی والا تھا کہ ڈور بیل بج اٹھی۔

ڈور بیل کی آواز سن کر میں چونک پڑا کہ یہاں کون آسکتا ہے۔ فوری طور پر میرا دھیان سلمان کی جانب چلا گیا کہ صرف اس کو میری یہاں موجودگی کا علم تھا' کہیں وہی تو مجھے چیک کرنے کے لیے نہیں آ گیا اور میں نے سوچ لیا کہ اگر اس نے ایسی حرکت کی ہے تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میں غصے میں بھناتا ہوا تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا اور دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ یک دم رک گیا اور سوچا کہ مجھے یوں ایک دم سے ہی دروازہ نہیں کھولنا چاہیے' بھلا دروازے پر سلمان کیسے ہوسکتا ہے اس نے ابھی تو فون کر کے مجھے نواب کے آنے کی اطلاع دی ہے' اتنے میں بیل دوبارہ بجی' میں نے ڈور مرر میں آنکھ لگا کر باہر دیکھا تو کوئی دکھائی نہیں دیا' جو کوئی بھی تھا وہ سائڈ میں کھڑا تھا' تب ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"پلیز اوپن دی ڈور مسٹر شہروز......"

یہ جملہ سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔ ۔ ۔

یہ کون عورت ہے جو مجھے میرے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے اور اسے یہ بھی پتا ہے کہ میں اس وقت یہاں اس فلیٹ میں موجود ہوں۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہا' تب وہ دوبارہ بولی۔

"یوں خاموش رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے مسٹر شہروز خاموش رہ کر آپ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ جیسے یہاں کوئی نہیں ہے' لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ نہ صرف فلیٹ میں موجود ہیں بلکہ اس وقت اس دروازے کے پیچھے کھڑے ہیں۔ گھبرائیں مت' مجھے اپنا دوست ہی سمجھیں۔ میں خود آپ سے ملاقات کرنے آئی ہوں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میرا اور آپ کا دشمن ایک ہی ہے' اور ہماری یہ ملاقات نہایت سود مند ثابت ہوگی۔"

"آپ کون ہیں اور مجھے کیسے جانتی ہیں اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں ......؟" میں اس کی اتنی جانکاری کو محسوس کر کے حیران رہ گیا اور بلآخر بول ہی پڑا۔

"کیا ساری باتیں ہم اسی طرح دروازے کے قریب کھڑے ہو کر کریں گے' شاید آپ ڈر گئے ہیں' مجھ سے خوف زدہ ہو رہے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میری ذات سے آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا مجھے آپ اپنے دوستوں میں پائیں گے' پلیز اوپن دی ڈور . . ." اس نے بہت نرم اور مہذب لہجے میں کہا تو میں نے چند لمحے رک کر سوچ پھر اپنی بیلٹ سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لی' اور ہاتھ میں لے کر دروازے کے پیچھے ہو کر دروازہ کھول دیا' میں نے دائیں ہاتھ میں پستول تھامی ہوئی تھی اور بائیں ہاتھ سے لاک کھول کر ہینڈل اپنی جانب کھینچ لیا' میں فوری طور پر دروازے کے پیچھے ہو گیا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی تیز خوشبو کا جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا' اور وہ سراپا رنگ و روشنی اندر آ گئی' میں نے تیزی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا اور اس کی جانب پستول تانتے ہوئے کہا۔

"آگے چلو۔"

وہ خراماں خراماں میرے آگے آگے چلنے لگی' میں نے اس کمرے کی جانب اشارہ کیا جہاں صوفے اور میز پڑی تھیں۔ یہ شاید ڈرائنگ روم تھا' وہ اندر جا کر ایک صوفے پر بیٹھنے لگی' لیکن بیٹھنے سے پہلے اس نے بھی اپنی جینز کی پینٹ میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالا اور سامنے میز پر رکھ دیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر مردوں کے اسٹائل میں بیٹھ گئی' اس نے بلیک کلر کی ٹائٹ جینز اور بلیک اور ریڈ لائنوں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں جوگرز تھے' بوائے کٹ سنہری بال تھے اور سرخ و سفید رنگت کی حامل وہ دراز قامت چھریرے بدن کی لڑکی تھی' بڑی بڑی کٹورہ سی براؤن آنکھیں کمان ابرو' قدرے موٹے اور بھرے بھرے ہونٹ تھے جن پر لائٹ براؤن لپ اسٹک لگی ہوئی تھی' میں نے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایک ہی نگاہ میں اس کا جائزہ لے ڈالا' البتہ پستول بدستور اس کی جانب تانا ہوا تھا۔

"میں نے اپنا پستول آپ کے سامنے میز پر رکھ دیا ہے' پلیز آپ بھی اسے رکھ دیں اور تسلی سے بیٹھ کر مجھ سے بات کریں۔" اس نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں نے پستول میز پر تو نہیں رکھا بلکہ صوفے پر اپنے قریب رکھ لیا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اب فرمایئے . . .!"

"آپ کے ذہن میں سب سے پہلا سوال یہی آ رہا ہوگا کہ میں کون ہوں اور آپ کو کیسے جانتی ہوں تو مسٹر شہروز میں اپنا تعارف کرواتی ہوں کہ میرا نام روزی ہے ...... آئی مین سب مجھے میڈم روزی کے نام سے جانتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا اصل نام کچھ اور ہے اور آپ کی پہچان میڈم روزی ہے۔" میں نے درمیان میں کہا۔

"بالکل ٹھیک سمجھے ہیں آپ۔" اس نے کہا۔

"لگے ہاتھوں اپنا اصل نام بھی بتاتی جایئے۔" میں نے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ سوال فضول ہے کہ میں پہلے کون تھی' کیا نام تھا' آپ صرف اتنا جان لیں کہ میں میڈم روزی ہوں اور میڈم روزی مجھے اس شخص نے بننے پر مجبور کیا ہے جو آپ کا بھی دشمن ہے۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟" میں نے اپنے لبوں پر مسلسل مچلنے والا سوال کر ڈالا۔

"میں آپ کو کیا؟ آپ کے ماضی کے بارے میں بھی اچھی طرح سے جانتی ہوں ڈاکٹر شاہ زمان صاحب ......!" اس کے لہجے میں چھپی پراسراریت کو محسوس کر کے میں بری طرح چونک پڑا' اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں اندر ہی اندر چونک تو گیا تھا لیکن میں نے اپنی یہ کیفیت اس پر قطعی ظاہر نہیں ہونے دی اور بظاہر حیرت کے انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر شاہ زمان ...... یہ کون موصوف ہیں ......؟"

میری بات سن کر وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑی ...... اور اس نے بڑی روانی کے ساتھ میرا ماضی میرے سامنے دہرانا شروع کر دیا۔ شیر افضل اور شیر زادہ خنک والے معاملے سے لے کر جرگے کا بیٹھنا' ارمان کی موت' بابا اور اماں کی موت' فائزہ کا اغوا اس کی بے حرمتی اور اس کا قتل' سب کچھ اس نے میرے سامنے بیان کر دیا۔

وہ میرا ماضی میرے سامنے دہرا رہی تھی اور اسے سن کر اور یاد کر کے میری آنکھوں میں خون اترنے لگا' دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی اور جسم کا سارا خون کنپٹیوں میں جمع ہو گیا۔

"ریلیکس ہو جایئے ڈاکٹر صاحب ......" اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ تو میں بھی بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور میرا ہاتھ خود بخود میرے دائیں جانب رکھی پستول پر چلا گیا۔

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ میرے نزدیک صوفے پر آ کر بیٹھ گئی اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "جس طرح آپ کو ایک معزز انسان ڈاکٹر شاہ زمان سے شہروز بننے پر مجبور کر دیا گیا اسی طرح مجھے بھی رومانہ سے روزی بننے پر مجبور کر دیا گیا' آپ نے بھی مجبوراً انسانیت کا لبادہ اتار کر حیوانیت کا لبادہ اوڑھ لیا اور میں نے بھی اپنے گھر کی چار دیواری سے نکل کر بے حیائی کی چادر اوڑھ لی۔"

پھر اس نے اپنا ملائم ہاتھ میرے سخت ہاتھوں پر رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "میں نے بلآخر ایک ایسا شخص تلاش کر ہی لیا جس کو میں اپنا دوست کہہ سکوں اور جس کی مدد سے میں اپنے دشمن کو ٹھکانے لگا سکوں۔ آپ بہت عرصے سے میرے آدمیوں کی نگاہوں میں تھے' اور آج جب میں آپ کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہوں تو میں آپ کے پاس ہاتھ ملانے کے لیے آ گئی۔"

"کون ہے آپ کا دشمن ......؟" میں نے آہستگی سے اس کے ہاتھ کے نیچے دبا اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔

"وہی جو آپ کا ہے ......" اس نے ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یعنی ......؟" میں نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"نواب سطوت الاسلام ...... ہمارے ملک کا جانا پہچانا نام ...... مشہور روحانی پیشوا اور ایک سماجی رہنما ...... شاداب پور کا مالک ...... بہت سے ان پڑھ اور ناسمجھ لوگوں کا پیر ......!" اس نے حقارت اور نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"میرے بارے میں تو آپ سب جانتی ہیں' کچھ اپنے بارے میں بھی بتایئے ...... یعنی رومانہ سے میڈم روزی بننے تک کا سفر ......!" میں نے اس مرتبہ سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں اب اس کی جانب سے مطمئن ہونے لگا تھا' اور سمجھ گیا تھا کہ اس کا انداز جارحانہ نہیں ہے۔ اور وہ میرے پاس کسی برے ارادے سے نہیں آئی۔ اور میں نے اتنا بھی سمجھ لیا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے اس کا یقیناً کسی بڑے گروہ سے تعلق ہے اور اس کا نیٹ ورک بھی مضبوط ہے جب ہی

وہ میرے بارے میں اتنا سب کچھ جان پائی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں نے یہ فلیٹ کرائے پر حاصل کیا ہے اور آج اس وقت میں یہاں تنہا موجود ہوں۔

"آپ سے دوستی کرنے اور آپ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے مجھے آپ کو وہ سب کچھ بتانا ہوگا جسے میں بھلانا چاہتی ہوں۔ وہ سب کچھ میرے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ ہے' میں وہ سب بھلانا چاہوں تو نہیں بھلا سکتی اور سچ کہوں تو میں وہ سب بھلانا بھی نہیں چاہتی' اس وقت تک جب تک میرا دشمن نواب زندہ ہے۔ میں روز رات کو اپنے زخموں کو کریدتی ہوں' اور ان زخموں سے اٹھنے والی ٹیسوں کو برداشت کرتی ہوں " اس نے ایک نقطے پر اپنی نگاہیں مرکوز کیے ہوئے جواب دیا۔

"سچ کہتی ہیں آپ' اپنے زخموں کو بھلانا آسان نہیں ہے اور ان زخموں کو یاد ہی رکھنا چاہیے اس طرح انتقام کی آگ بھی جلتی رہے گی اور یہ آگ اس وقت ہی ٹھنڈی ہوگی جب ہمارا انتقام ٹھنڈا ہوگا۔" میں نے کہا۔

وہ ابھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے یاد آیا کہ مجھے واپس کلفٹن پہنچنا ہے' نواب واپس آرہا ہے' اور اگر اس وقت میں اس کی داستان سننے کے لیے بیٹھ گیا تو پتا نہیں کتنا وقت لگ جائے۔ اس لیے اس سے کہا۔

"آئی ایم سوری میڈم روزی . . !"

"اوہ ہوں' میڈم نہیں صرف روزی میڈم تو میں دوسرے لوگوں کے لیے ہوں آپ اور میں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور اب یقیناً دوست بھی ہیں تو آپ مجھے صرف روزی کہہ سکتے ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا اس کا انداز شاہانہ تھا۔ "ہاں تو کیا کہہ رہے تھے آپ۔" اس نے مجھے بیچ میں ٹوکنے پر معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"اصل میں مجھے واپس نواب کی کوٹھی پر پہنچنا ہے کیونکہ وہ شاداب پور سے نکل چکا ہے اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی مجھے کوٹھی پہنچنا ہے' ہم دوبارہ تفصیلی ملاقات ضرور کریں گے' آپ مجھے اپنا سیل فون نمبر دے دیں اور میرا نمبر بھی لے لیں۔ میں جانا تو نہیں چاہتا' لیکن مجبوری ہے جانا تو پڑے گا۔"

"اوہ . . !" اس کے ہونٹ سیٹی کے انداز میں گول ہوگئے۔ "تو وہ آرہا ہے . . !"

"جی!" میں نے کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے' جب آپ کو ٹائم ملے آپ کال کرلیجیے گا ہم اسی فلیٹ پر ملیں گے۔" اس نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر ہم نے ایک دوسرے کو اپنے سیل فون نمبرز دیئے' وہ مجھ سے ذرا پہلے فلیٹ سے نکل گئی۔ بہت سی باتیں تھیں جو مجھے اس سے پوچھنی تھیں۔ بہت سی کہانیاں سننی تھیں وہ بھی نواب کی ڈسی ہوئی تھی' مجھے خوشی تھی کہ مجھے اپنا کوئی ساتھی مل گیا تھا۔

میڈم روزی کے جانے کے پندرہ منٹ بعد میں باہر نکلا اور فلیٹ کو لاک کرکے تیزی سے اپنی گاڑی کی جانب بڑھا' میں نے ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی' کیونکہ میں جانتا تھا کہ میڈم روزی کے ہرکارے یہیں کہیں موجود ہوں گے جو میری ہر ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں گے۔

کار ڈرائیو کرتے ہوئے میں یہ بات سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ میڈم روزی کے بندے خاصے شاطر اور ہوشیار ہیں وہ نہ جانے کب سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے اور میرے علم میں نہیں آسکا کہ کوئی مجھے مسلسل واچ کر رہا ہے۔

آدھے گھنٹے کا سفر ٹریفک کی بھرمار کی وجہ سے پون گھنٹے میں پورا ہوا' سلمان کا فون میرے پاس تقریباً ڈھائی تین گھنٹے قبل آیا تھا' اگر نواب نے نکلنے کے بعد

سلمان کو فون کیا تھا تو اب وہ پہنچنے ہی والا تھا۔

کوٹھی پہنچا تو غیر معمولی چہل پہل محسوس ہوئی' نواب آرہا تھا اس لیے ملازمین میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مگر ان سب میں سلمان مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تو اپنے روم میں پہنچ کر میں نے اسے کال کی۔

"آگئے تم !" اس نے میرا نمبر دیکھ کر سمجھ لیا کہ میں ہوں اس لیے چھوٹتے ہی کہا۔

"ہاں تم کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اپنی جگہ پر . . لیکن یہ بتاؤ کہ میں نے تمہیں اتنی دیر قبل فون کرکے بتادیا تھا' بڑی دیر لگادی تم نے کیا اس پری کے پاس سے اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا !" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں یار میں نکلنے ہی لگا تھا کہ وہ آگئی . . پھر میں نے سوچا کہ نواب صاحب کو آنے میں تو ٹائم لگے گا اس سے تھوڑی دل پشوری ہی سہی. !" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے' لیکن تمہیں اپنا وعدہ تو یاد ہے ناں' کہ میں بھی !" اس نے معنی خیز انداز میں کہہ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ارے تم فکر ہی نہ کرو. ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ ویسے یار تم تو خود چھوٹی دنیا ہو' تمہارے لیے بھی کوئی چھوٹی دنیا ہی تلاش کرنی پڑے گی۔" میں نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

"یار چھوٹی ہی سہی . . دنیا تو ہوئی... اور اس دنیا کی سیر کا اپنا ہی مزہ ہے۔"

اس نے اوباشوں کے انداز میں کہا تو میں نے دل ہی دل میں اسے ایک گالی دی اور ہنس پڑا۔

فون بند کرنے کے بعد میں بیڈ پر چت لیٹ گیا اور میڈم روزی کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہی خیال آیا کہ وہ بھی شاید نواب کی زیادتی کا شکار اسی طرح ہوئی ہوگی جس طرح میری بہن فائزہ ہوئی' فرق یہ تھا کہ وہ ماردی گئی اور یہ زندہ بچ گئی۔ اور پھر کسی طرح ایک گینگ میں شامل ہوگئی' یہ سب کس طرح ہوا ہوگا' یہ تو مجھے اس کی زبانی پتا چلے گا' پھر میرا دھیان نواب کی جانب چلا گیا کہ وہ آکر خود مجھے طلب کرے گا یا مجھے خود اس کے پاس جانا ہوگا۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ باہر سے شور کے ساتھ بہت سے قدموں کی دھمک سنائی دی' میں سمجھ گیا کہ وہ مجسم شیطان نواب آگیا ہے' میں نے گھڑی میں ٹائم دیکھا' رات کے گیارہ بج گئے تھے اور میں نے ابھی تک رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا' اس لیے میں کھانا کھانے کے ارادے سے باہر نکل گیا اور سیدھا کچن میں جاکر کھانے کا کہا تو اس نے مجھے نواب کے آنے کی اطلاع دی۔

"ارے یار تو کیا آج کھانا نہیں ملے گا !" میں نے ازراہ مذاق کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے' میں تو آپ کو اطلاع دے رہا تھا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے' تم کھانا میرے کمرے میں پہنچادو۔"

اس سے کہہ کر میں کمرے میں آگیا اور ہاتھ منہ دھو کر لباس تبدیل کرلیا' باتھ روم سے باہر آیا تو کھانے کی ٹرالی کمرے میں موجود تھی' میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا' چائے پی رہا تھا کہ نواب کا بلاوا آگیا۔

میں نے ایک بار پھر ہاتھ منہ واش کیا اور نواب کے کمرہ خاص کی جانب چل دیا۔ اس وقت بارہ بجنے والے تھے۔ اور کوٹھی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سوائے اندر رہنے والے گارڈز کے مجھے کوئی اور دکھائی نہیں دیا' نواب کا بلاوا لے کر بھی گارڈ ہی آیا تھا۔

میں نے کمرے کے بند دروازے پر ہلکی سی ناک کی تو اندر سے نواب کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔

"یس کم آن شہروز !" اس جواب کا مطلب تھا

کہ اسے معلوم تھا کہ آنے والا میں ہی ہوں۔ میں آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ سامنے موجود شاندار اور قیمتی سوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی شان اور تمکنت سے بیٹھا تھا' دایاں ہاتھ اس نے سوفے کی پشت پر پھیلا رکھا تھا۔

"السلام علیکم نواب صاحب۔" میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی بہت مؤدب لہجے میں اسے سلام کیا۔

"ہوں!" اس نے ہلکے سے سر کے خم کے ساتھ ہنکاری بھری .. نواب کی یہ عادت مجھے زہر لگتی تھی کہ وہ کبھی بھی زبان سے سلام کا جواب نہیں دیتا تھا' بس سر ہلا تا تھا۔

"آپ نے یاد فرمایا تھا نواب صاحب...... میں خود بھی حاضر ہونا چاہتا تھا۔" میں نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ وہ بولا۔

"ہاں مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گے تعزیت کرنے. لیکن بہر حال... موت کا وقت مقرر ہے' سب ہی کو واپس پلٹ کر جانا ہے' اس کا بھی وقت پورا ہو گیا تھا' کیا کر سکتے ہیں۔ سوائے صبر کے .دنیا کے کام بھی چلتے ہی رہتے ہیں۔ ایں دے آؤ بیٹھو..... میں نے تمہیں ایک ضروری کام سے بلایا تھا۔"

اور میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کیا بات پوچھنا چاہ رہا ہے' اس نے جس دن مجھ سے روشن آرا بیگم کے بارے میں بات کی تھی' اسی وقت حویلی سے اس کا فون آ گیا اور وہ حویلی چلا گیا' آج آیا ہے تو اسے سب سے پہلے اسی بات کا خیال آیا ہے۔

"فرمایئے!" میں اس سے قدرے دور ہٹ کر دوسرے سوفے پر ذرا سا ٹک کر بیٹھ گیا۔

"ارے اطمینان سے بیٹھو یار تم سے ذرا تفصیلی گفتگو کرنی ہے۔" اس کا لہجہ ہلکا پھلکا تھا۔ تو میں پیچھے ہو کر اطمینان سے بیٹھ گیا اور اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ وہ کام ہوا یا نہیں جو میں نے تم سے کہا تھا۔" اس نے یہ دیکھنے کے لیے کہ مجھے یاد بھی ہے یا میں ٹل گیا . اصل بات پوچھنے کے بجائے اشارہ کیا۔

"جی نواب صاحب آپ نے مجھ سے روشن آرا بیگم کے بارے میں بات کی تھی' لیکن اس وقت وہ تکلیف دہ خبر آ گئی اور آپ کو جانا پڑا . پھر میں بھی آپ کے بتائے ہوئے ایڈریس پر کھوکھرا پار کے اس مکان پر پہنچ گیا تھا' رات کا وقت میں نے اس لیے منتخب کیا تھا کہ وہ گھر میں ہی موجود ہوں گی' لیکن میں آپ سے بہت معذرت کے ساتھ یہ بات کہوں گا کہ میرے پہنچنے سے تھوڑی دیر قبل ہی انہیں وہاں سے کوئی لے گیا۔ شاید وہ کوئی ایک آدمی تھا' میں جب وہاں پہنچا تو مجھے ایسا لگا جیسے اندر کوئی موجود ہے' میں گھر کی دیوار پھاند کر اندر گیا' لیکن وہ جو کوئی بھی تھا گھر کی پچھلی دیوار پھلانگ کر انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا کہ دیوار کے ساتھ ایک کرسی رکھی تھی اور وہیں ان کی چپلیں پڑی تھیں۔ ایک ہلکے رنگ کا دوپٹہ بھی دیوار سے لٹک رہا تھا' گھر خالی تھا' میں تیزی سے باہر کی جانب لپکا' اور گھوم کر دوسری جانب پہنچا مگر اتنی دیر میں وہ وہاں سے جا چکی تھیں . !"

میں بول رہا تھا اور نواب کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ میں چپ ہوا تو نواب نے غصے میں ایک ہاتھ کی مٹھی دوسرے ہاتھ پر ماری اور روشن آراء کے لیے اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُمڈ آیا۔

"وہ ضرور لودھی کے آدمی کے ساتھ وہاں سے نکل گئی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ اسے میری سن گن مل گئی ہوگی۔" نواب نے ایک بار پھر روشن آراء کو ایک نازیبا

خطاب سے نوازتے ہوئے کہا۔

"میں بہت زیادہ شرمندہ ہوں سر اپنی ناکامی پر آپ کو اختیار ہے اس کی جو چاہے سزا آپ مجھے دے سکتے ہیں۔" میں نے مسکین سی صورت بنا کے کہا۔

"ارے نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے' دراصل مجھے یہی اطلاع ملی تھی کہ لودھی کے بندے اس کے پیچھے لگے ہیں وہی اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ مجھے صرف یہ خطرہ ہے کہ کہیں وہ اس کو میرے خلاف نہ استعمال کریں . اگر اس نے سامنے آ کر بک بک کر دی تو . بڑی مشکل ہو جائے گی۔" نواب کی پیشانی پر فکر مندی کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔

"آپ اس طرح کی چھوٹی موٹی مشکلات سے کیوں گھبراتے ہیں' اول تو میرا خیال یہی ہے کہ وہ سامنے آنے کی حماقت نہیں کریں گی' کیونکہ یقیناً انہیں آپ کی پاور کا اندازہ ہوگا' دوسرے یہ کہ وہ لودھی بھی اتنی آسانی سے آپ کے سامنے انہیں ظاہر نہیں کرے گا' اور اگر کوئی بات ہوئی بھی تو آپ بہت آسانی سے ان کی کہی ہوئی ہر بات سے لاتعلقی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کے ساتھ تو ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔" میں نے کہا تو وہ میری شکل دیکھنے لگا' میں نے پوچھا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔"

"ہاں بولو!" اس نے کہا۔

"روشن آراء بیگم کے پاس نکاح نامہ تو نہیں ہوگا نا۔" میں نے اپنی معلومات کے لیے پوچھا۔

"نہیں نہیں اس کے پاس نکاح نامہ نہیں تھا' لیکن اگر لودھی چاہے تو کورٹ سے نکلوا سکتا ہے۔" نواب نے کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو اسے بھی دیکھ لیں گے' آپ فکر نہ کریں' ایسے چھوٹے موٹے کاموں کو ہینڈل کرنے کے لیے میں ہوں تو آپ کیوں فکر کرتے ہیں' ویسے یہ لودھی کون ہے ؟" میں نے اسے تسلی دینے کے بعد سوال کیا۔

"لودھی ہے ایک الو کا پٹھا . برسوں سے ہماری دشمنی چلی آ رہی ہے . یہ میرا سگا چچازاد بھائی ہے' اور سارا معاملہ گدی نشینی کا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے اسے اس چیز سے محروم ہونا پڑا ہے اور اب وہ اس بات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا کہ چونکہ میری اولاد نرینہ نہیں ہے' اس لیے اسے یہ گدی مل جائے .. لیکن جب تک میں زندہ ہوں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میری موت کی صورت میں ہی اسے یہ گدی مل سکتی ہے' لیکن میری زندگی میں وہ مرا تو اس کا بیٹا اس گدی کا وارث ہوگا' اس لیے وہ چاہتا ہے کہ میرے بارے میں معہ ثبوت ایسی باتیں لوگوں کے سامنے لائے کہ میں اس سے محروم ہو جاؤں حالانکہ وہ خود مجھ سے بڑا عیاش و بدمعاش ہے۔"

اتنا کہہ کر نواب چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا اور میرا دل اس گراں قدر معلومات کو حاصل کر کے بلیوں اچھلنے لگا' میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے خود نواب ہی کی زبانی اتنی اہم بات معلوم ہو جائے گی اور میرا دل بے چین ہونے لگا کہ یہ بات میں جلد از جلد روشن آراء بیگم تک پہنچا دوں. نواب سے انتقام لینے کے لیے ایک بہت ہی بہترین آئیڈیا میرے دماغ میں آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرا دماغ میڈم روزی کی جانب گھوم گیا کہ ہو نہ ہو میڈم روزی کا تعلق ضرور لودھی سے ہوگا۔

"کیا سوچ رہے ہو......؟" نواب نے مجھے سوچوں میں گم دیکھا تو پوچھا۔

نواب کی آواز سے میں چونک کر فوراً اپنی سوچوں

کے حصار سے باہر نکل آیا اور کہا۔ "بس یہی سوچ رہا تھا کہ اگر ایسی کوئی صورت حال پیش آئی تو اس کا سدباب کس طریقے سے کیا جائے گا۔"

"تو پھر آیا کوئی آئیڈیا تمہارے ذہن میں؟" نواب نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"آئیڈیاز تو بہت سے ہیں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے اعتماد سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"اتنے اعتماد سے تم کس بناء پر کہہ سکتے ہو۔" نواب نے میرے لہجے میں پوشیدہ اعتماد کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے نواب صاحب کہ ان محترمہ کو آپ کی زندگی سے نکلے بہت عرصہ بیت چکا ہے اگر وہ کچھ کرنا چاہتیں تو کچھ نہ کچھ ضرور کرتیں۔ اب میرا خیال ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا آپ بھول جائیں اس بات کو۔" میں نے بے فکر لہجے میں کہا تو نواب بھی کچھ مطمئن دکھائی دینے لگا چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔

"میں نے دراصل کسی اور کام کے لیے تمہیں بلایا تھا مگر پھر مجھے اس بات کا خیال آ گیا تو میں نے تم سے اس کے بارے میں پوچھ لیا۔ دیکھو شہروز تم مجھے بہت عزیز ہو اور میں تم پر بہت اعتماد بھی کرتا ہوں۔ حالانکہ یہ میری عادت نہیں ہے میں عام لوگوں پر اتنی جلدی بھروسہ نہیں کرتا لیکن نہ جانے تمہارے اندر ایسی کون سی بات ہے کہ تم مجھے پہلی نگاہ میں ہی اچھے لگے میرا دل خود بخود تمہاری جانب کھنچنے لگا اور میں نے مستقل تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کرلیا اور مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میرا فیصلہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

دیکھو شہروز تم بھی اسی دنیا میں رہتے ہو اور میں بھی بلکہ کروڑوں لوگ اس دنیا میں بستے ہیں۔ ہم سب لوگ مختلف نسلوں مذاہب اور طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر ایک کا زندگی گزارنے کا اپنا ہی طریقہ ہے اور وہ اسی انداز سے زندگی گزارتا ہے ہم جیسے لوگ بھی انسان ہیں اور اپنے انداز سے زندگی گزارتے ہیں۔ ہماری زندگیوں میں بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے ہر مسئلے کو ہر ایک کے آگے ڈسکس نہیں کرسکتے دوسرے لوگوں پر ظاہر بھی نہیں کرسکتے۔

جب انسان کے پاس رتبہ حیثیت زمینیں اور دولت ہو تو اس کی زندگی الگ ڈھب پر ہی بسر ہوتی ہے چاہے کچھ بھی ہو ہمیں اپنی عزت جو دوسرے لوگوں کی نگاہ میں ہماری ہوتی ہے اسے بچانا ضروری ہوتا ہے پھر چاہے ہمیں اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی ہو ہم صاحب حیثیت اور صاحب اقتدار لوگ ہیں ہمارے لیے دنیا میں ہر وہ کام اور ہر وہ بات جائز ہوتی ہے جو عام لوگوں کے لیے ناجائز ہوتی ہے۔ ایسا ہم سمجھتے ہیں کیوں.... ؟" اس نے خود ہی سوال کیا پھر بولا۔ "وہ اس لیے کہ ہمیں اللہ نے عام لوگوں پر کچھ درجے زیادہ فوقیت دی ہے۔ تم سمجھ رہے ہو ناں کہ میری اس گفتگو کا مقصد کیا ہے۔" اس نے مجھے چپ چاپ اپنی جانب تکتے ہوئے محسوس کرکے پوچھا۔

"جی نواب صاحب!" میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

"بس تو پھر یوں سمجھو کہ ہمارے ہر کام میں ہماری کچھ مجبوریاں ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں وہ کام کرنے پڑتے ہیں اس لیے کہ ہمیں اپنی بقاء اور اپنی عزت کا بھرم قائم رکھنا ہے۔" وہ اپنا کوئی کام کروانے کے لیے میرے آگے تمہید باندھ رہا تھا۔

"آپ فرمائیے نواب صاحب میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔" میں اس کی بے جا تمہید اور لفاظی سے اکتا سا گیا لیکن اپنے لہجے میں ادب کا پہلو نظر انداز نہیں کیا۔

"تم عرفان رسول کے نام سے واقف ہو....؟" اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔

"کون عرفان رسول.....؟" میں نے پوچھا۔

"وہی مشہور سماجی رہنما..... جس کا ایک ادارہ ہے۔ بے سہارا خواتین اور بچوں کا مرکز جہاں ایک انڈسٹریل ہوم بھی قائم ہے۔" نواب صاحب نے عرفان رسول صاحب کا تفصیلی تعارف کرواتے ہوئے کہا تو مجھے یاد آ گیا۔ عرفان رسول صاحب ایک بہت نیک دل اور خدا ترس انسان تھے خاصے دولت مند بھی تھے۔ پہلے وہ غریبوں سے بہت نفرت کرتے تھے اپنی زندگی عیاشیوں میں بسر کرتے تھے ان کی بیوی اور ایک بیٹی بھی تھی لیکن ایک مرتبہ سگنل پر ایک فقیرنی کو جب انہوں نے دھتکارا تو اس نے روتے ہوئے انہیں بددعا دی کہ جا تو اور تیرا خاندان تباہ اور برباد ہو جائے گا اور یہ اتفاق تھا یا واقعی اس غریب عورت کی بددعا کہ ذرا دور چلنے کے بعد ان کی گاڑی کا زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا جس میں ان کی بیوی تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی اور بیٹی کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی چوٹ آئی کہ وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئی وہ خود بھی زخمی ہو گئے تھے۔

لیکن پھر اللہ نے ان کے دل کی کایا پلٹ دی انہیں اپنے اللہ کا خوف ستانے لگا اپنے سارے گناہ اور زیادتیاں یاد آنے لگیں جو وہ غریبوں پر کرتے رہے تھے انہوں نے اللہ سے سچی توبہ کی اور فقیر منش زندگی گزارنے لگے ان کی بیٹی جو حادثے کے وقت گیارہ سال کی تھی تقریباً سات سال کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں دنیا چھوڑ گئی۔

پھر انہوں نے سچ مچ دنیا سے کنارہ کشی کی زندگی اپنالی اپنا سب کچھ انسانی فلاح و بہبود پر لگا دیا اپنی وہ کوٹھی جس میں وہ کبھی بڑی شان اور تمکنت کے ساتھ رہتے تھے اسے بے سہارا خواتین اور بچوں کا مسکن بنا دیا اس ادارے کا نام ہی انہوں نے "مسکن" رکھا ہوا تھا۔ یہیں پر انہوں نے خواتین کے لیے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ کے ہنر سے اپنی روزی کما سکیں "مسکن" کے زیادہ تر اخراجات وہ خود اٹھاتے تھے کچھ اخراجات خواتین کے ہنر کی فروخت سے پورے ہوتے تھے اور کچھ لوگ جو خوف خدا رکھتے تھے ان عورتوں کی مدد کے لیے چندہ دیا کرتے تھے۔

نواب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ عہد جوانی میں عرفان رسول اس کا بہت اچھا دوست رہ چکا ہے اس لیے وہ نواب کی زندگی کے بہت سے اہم رازوں سے بھی واقف ہے اور نواب بھی عرفان رسول کی جوانی کی غلطیوں سے آگاہ ہے پھر جب عرفان رسول کی زندگی میں اتنی اہم تبدیلی آئی تو ان کی دوستیاں بھی تبدیل ہو گئیں بلکہ کچھ باتوں پر ان کے اختلافات بھی ہو گئے اور آج یہ اختلافات اتنے زیادہ بڑھ گئے ہیں کہ نواب انہیں اپنے دشمنوں میں شمار کرنے لگا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ نواب میرے ذریعے عرفان رسول کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے یکایک میرا دل چاہا کہ میں فوراً یہاں سے اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ میں ذاتی طور پر عرفان رسول جیسے انسان کو نقصان پہنچانے کے حق میں نہیں تھا لیکن اگر نواب نے مجھے ایسا کچھ کرنے کا حکم دیا تو میں انکار بھی نہیں کرسکوں گا روشن آرا بیگم کو تو میں نے اس کے عتاب سے بچالیا تھا لیکن عرفان رسول..... خیر جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا میں نے سر کو جھٹک کر سر اوپر اٹھایا تو نواب کو بغور اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔

"عرفان کے بارے میں سوچ رہے تھے۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں ایک مرتبہ ان کا انٹرویو ایک رسالے میں پڑھا تھا پھر ذہن سے ان کا نام نکل گیا تھا آج آپ

نے یاد دلایا تو یاد آ گیا۔ وہی سوچ رہا تھا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس کے پاس جانا ہے اور بہت ہی اہم کام کرنا ہے تمہارے ساتھ میں کسی اور کو بھی بھیجوں گا اور اس مرتبہ تمہیں ناکام نہیں لوٹنا ہے۔" نواب نے لفظوں کو چبا چبا کر کہا تو میں چونک گیا کہ نواب نے یہ کیوں کہا کہ اس مرتبہ تمہارے ساتھ کسی اور کو بھی بھیجنا ہے کیا روشن آراء بیگم والے معاملے میں میری ناکامی پر نواب کو کوئی شک ہو گیا ہے یا پھر اسے میرے اوپر اعتماد نہیں رہا اس لیے میں نے کہا۔

"کسی اور کو میرے ساتھ بھیجنے کی وجہ...... کیا آپ کو میرے اوپر اعتماد نہیں رہا۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے اس کا ساتھ ضروری ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ اس کی مدد کے بغیر تمہارا کام مکمل نہیں ہو سکتا۔" نواب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ایسا کون سا کام ہے جو میں تنہا نہیں کر سکتا اور کون ہے وہ جس کو آپ میرے ساتھ بھیجنا چاہتے ہیں۔" میں نے چونک کر کہا۔

"میں نے اسے بھی بلوایا ہے کل وہ آ جائے تو تمہارا تعارف بھی اس سے کروا دوں گا اور کام بھی بتا دوں گا پھر تم خود ہی کہو گے کہ ہاں اس کی مدد کے بغیر کام مکمل نہیں ہو سکتا۔" نواب کا لہجہ بدستور معنی خیز رہا۔

"آپ نے مجھے الجھا دیا ہے نواب صاحب کچھ تو بتائیں۔" میں نے الجھ کر کہا۔

"اب تم جاؤ یہ تو تمہیں کل ہی معلوم ہوگا اور ہاں وہ والا کام مکمل کرنے کے بعد تمہیں میرا ایک کام اور کرنا ہے اور وہ یہ کہ میری بیٹی کی وفات کے سلسلے میں میرے پاس تعزیت کے بہت سے پیغامات آ رہے ہیں تمہیں وہ سارے پیغامات دیکھنے ہوں گے اور ان سب کے جوابات دینے ہوں گے بہت سی میلز ہیں سب دیکھ لینا۔" نواب نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لازماً میں بھی اٹھ کھڑا ہوا یہ اشارہ تھا اس بات کی جانب کہ اب مجھے بنا ایک لفظ کہے اس کمرے سے چلے جانا ہے میں اسے سلام کر کے اپنے کمرے میں جانے لگا۔

تب ہی مجھے ایک تیز شش کاری سنائی دی میں نے پلٹ کر دیکھا تو راکھی ایک کمرے کے دروازے سے ذرا سا چہرہ باہر نکالے ہوئے تھی میں تیزی سے چلتے ہوئے رک گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا تو میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دبے قدموں اس کی جانب بڑھا اور قریب جا کر سرگوشی میں پوچھا۔

"کیا بات ہے آج بڑی بے خوف ہو رہی ہو نواب اپنے کمرے میں موجود ہے۔" میں نے کن انکھیوں سے نواب کے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے اسے خبردار کیا۔

"معصوم ہے۔" اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔ "میرا بہت دل چاہ رہا تھا تمہارے پاس آنے کا۔"

"ہوش میں رہو کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی مروانا چاہتی ہو جب تک نواب کوٹھی میں موجود ہے ایسا سوچنا بھی مت۔" اور اس کے ساتھ ہی مجھے کوٹھی کے اندر گشت کرنے والے گارڈ کے بھاری بوٹوں کی آہٹ سنائی دی تو میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ راکھی تیزی سے اندر ہو گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

اپنے روم کی جانب جاتے ہوئے میری گارڈ عبدالرحیم سے مڈبھیڑ ہوئی تو میں اس کی جانب دیکھ کر مسکرا دیا۔ جواباً وہ بھی مسکرا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں نواب سے مل کر واپس اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ وہی میرے پاس نواب کا بلاوا لے کر آیا تھا۔

اس کوٹھی میں نہ جانے کتنی تعداد تھی ان گارڈز کی

کتنے ہی اندر پہرہ دیتے تھے اور کتنے ہی باہر۔ نواب جب کہیں بھی جاتا تھا تو اس کے ذاتی محافظوں کا ایک پورا دستہ اس کے ساتھ چلتا تھا اور کوٹھی کے اندر بھی دن رات گارڈز گھومتے پھرتے تھے میں دل ہی دل میں یہ سوچتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا کہ چاہے تو اپنے ارد گرد کتنے ہی پہرے بٹھا لے اسلحہ برداروں کی پوری فوج ساتھ لے کر چل لیکن جب اللہ کی جانب سے تیرا بلاوا آ جائے گا تو تیرے یہ گارڈز بھی تجھے موت سے نہیں بچا سکیں گے۔

انسان نہ جانے کیوں اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا ہے کہ موت اپنے مقررہ وقت پر ہی آئے گی اور اس مقررہ وقت سے لمحہ بھر پہلے یا لمحہ بھر بعد نہ تو اسے کوئی موت دے سکتا ہے اور نہ ہی بچا سکتا ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کو اپنی پوری سچائی کے ساتھ تسلیم کر لے تو اس کے اندر لمحہ بہ لمحہ پلنے والا موت کا خوف ختم ہو جائے گا۔

اپنے روم میں آ کر میں نے شب خوابی کا لباس تبدیل کیا اور سونے کے ارادے سے بیڈ پر آ گیا۔ پھر دراز میں سے اعصاب کو پرسکون رکھنے کی ٹیبلیٹ کھائی اور لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر تک اپنے اور نواب کے درمیان ہونے والی گفتگو کی جزئیات پر غور و فکر کرتا رہا پھر نہ جانے کب میں دبے قدموں نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

رات کو سوتے میں اماں بابا ارمان اور فائزہ کو خواب میں دیکھا ہمارا نتھیا گلی والا مکان ہے ہم سب صحن میں بیٹھے ہنس بول رہے ہیں۔ پھر یکایک فائزہ چارپائی سے گر پڑی اور میں نے اس کا جسم ڈھیر ساری گندگی میں لتھڑا ہوا دیکھا اماں دور کھڑی دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر رو رہی ہیں۔ فائزہ نے ارمان کی جانب ہاتھ بڑھائے تو اس کا وجود دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ پھر وہ میری جانب بڑھی...... میں نے آگے بڑھ کر فائزہ کو سنبھالا تو اس کے لباس کی ساری گندگی میرے جسم پر لگ گئی۔ پھر فائزہ بھی نہ جانے کہاں گم ہو گئی بس میں ہی کھڑا رہ گیا گندگی سے لتھڑے اور اپنے بدبودار جسم کے ساتھ...... میں بہت پریشان ہو رہا ہوں...... پھر بابا میرے سامنے آ گئے وہ مجھ سے بہت خفا ہیں اور غصے سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

"شاہ زمان یہ تو نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے۔ ذرا اپنے اوپر نگاہ ڈال۔ تو سرتاپا گندگی میں لتھڑ گیا ہے کیا ہو گیا ہے تجھے تو نے سب کچھ بھلا دیا۔ تجھے اس کیچڑ اور گندگی سے گھن نہیں آ رہی۔ کراہیت نہیں آ رہی۔ تو ایسا تو نہ تھا۔ تیرا تو ظاہر اور باطن سب بہت صاف ستھرا تھا... پاکیزہ تھا تو میرا بیٹا نہیں رہا۔"

پھر ماں بھی سامنے آ گئیں اور قہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "تو میرا شاہ زمان نہیں ہے......؟"

"نہیں اماں میں تو تمہارا ہی بیٹا ہوں تمہارا شاہ زمان ہوں یاد ہے تم کتنے پیار سے مجھے شاہو کہا کرتی تھیں۔" میں نے تڑپ کر کہا۔

"ہاں کہا کرتی تھی... مگر اب تو میرا شاہو نہیں رہا۔ تو گندگی کے گڑھے میں گر گیا ہے۔ تو دیکھ اپنے آپ کو تیرا سارا وجود گندگی کا ڈھیر بن چکا ہے۔" اماں نے کہا۔

"لیکن اماں یہ گندگی تو مجھے فائزہ سے لگی ہے اماں وہ گر گئی تھی ناں" میں نے بڑی لاچاری سے کہا۔

"تیرا ہی تو قصور ہے تو نے بجائے فائزہ کی گندگی صاف کرنے کے اسے اپنے جسم سے لگا لیا جا چلا جا

میری نظروں سے دور ہو جا“ اماں نے شدید غصے سے کہا۔

”اماں میری بات تو سنو...... لیکن اماں مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھیں پھر میں بابا کی جانب بڑھا اور ان کی جانب مدد طلب نگاہوں سے دیکھا لیکن وہ بھی بنا کچھ کہے مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے اور پھر اماں اور بابا اتنے دور چلے گئے کہ ان کے ہیولے بھی مجھے دکھائی دینا بند ہو گئے اور میرے چاروں جانب گھور اندھیرا چھانے لگا‘ میں اس اندھیرے میں ادھر ادھر بھاگ رہا تھا‘ یکا یک تیز آندھی چلنے لگی‘ درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر بہت سے پتے میرے جسم پر تھپڑوں کی طرح لگنے لگے... اور پھر اس آندھی میں کہیں سے نواب سامنے آ گیا...... اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اندھیرا چھٹنے لگا اور میں نے دیکھا کہ نواب کا جسم انسانی غلاظت سے بھرا ہوا ہے اور اس کے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔ لیکن میں اس غلاظت اور بدبو کی پروا کیے بغیر اس سے بغلگیر ہو گیا اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میرا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا‘ حالانکہ اے سی کی خوش گوار ٹھنڈک سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اچانک ہی میرا دل متلانے لگا۔ مجھے قے آنے لگی۔ میں اٹھ کر واش روم کی جانب بھاگا...... لیکن سوائے ابکائیوں کے قے نہیں ہوئی۔

میں نے اچھی طرح سے کلی کی اور ہاتھ منہ دھو کر دوبارہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ٹائم دیکھا‘ صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ دور کہیں سے ہلکی ہلکی اذان فجر سنائی دینے لگی اور میں بیڈ پر چت لیٹ گیا‘ ذرا دیر پہلے دیکھا جانے والا خواب اپنے ذہن میں دہرانے لگا اور ساری باتوں پر غور کرنے لگا۔

مجھے اماں اور بابا کا غصہ یاد آیا‘ فائزہ کا گندگی میں لتھڑا جسم پھر اس کی گندگی کا اپنے جسم سے لگ جانا اور آخر میں نواب کا غلیظ اور بدبودار جسم۔

یہ سب کیا تھا‘ کس جانب اشارہ تھا‘ میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا‘ میرا سر بری طرح دکھنے لگا۔

کاش میں اماں بابا کو بتا پاتا کہ میں تو اپنی فائزہ کی بے حرمتی اور اس کی موت کا بدلہ لینے کے لیے یہاں آیا تھا‘ لیکن میرے پاس الفاظ ہی نہیں تھے جو انہیں بتا پاتا...... کتنی بے بسی تھی...... میرے اپنے سب مجھ سے روٹھ گئے...... میں کتنا اکیلا ہو گیا ہوں...... میں بے دم سا ہو کر بیڈ پر گر پڑا...... پھر میری آنکھوں سے خود بخود آنسو بہہ نکلے...... اور میں دیر تک روتا رہا‘ میں نے اپنے گھٹنے موڑ کر پیٹ کی جانب کر لیے اور بازوؤں کا حلقہ ان کے گرد باندھ لیا‘ میں ایک خوف زدہ اور بے بس بچے کی مانند سکڑا سمٹا لیٹا آنسو بہا رہا تھا۔

میں شہروز خان...... جو اتنا طاقت ور تھا جس کے بھاری ہاتھ کا ایک تھپڑ ہی انسان کو زمین کی مٹی چٹا دیتا تھا‘ وہ اتنا جی دار اور بہادر تھا جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا...... جسے موت کا خوف پل بھر بھی دامن گیر نہیں ہوتا تھا‘ کیسے ایک خوف زدہ بچے کی مانند یہاں پڑا تھا‘ وہ کس چیز کا خوف کھا رہا تھا...... شاید اس کے لاشعور میں کہیں اللہ اور یوم آخرت کا خوف اب بھی چھپا بیٹھا تھا۔

آج میں سوچ رہا ہوں کہ یہ انسانی نفسیات بھی عجیب ہوتی ہے‘ کہیں انسان ساری دنیا کو اپنے قدموں تلے روندھنے کا ارادہ رکھتا ہے تو کبھی رات کی تنہائی میں کوئی شے کوئی ہستی اسے اپنا خوف دلاتی رہتی ہے۔

میں ایک بار پھر سو گیا...... پھر نیند میں ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے سخت سردی لگ رہی ہے‘ مجھے وہ ٹھنڈک خوش گوار گرمی میں تبدیل ہونے لگی ...... کبھی سر پر منوں

بوجھ محسوس ہوتا

اور پھر میں نے آنکھیں کھول دیں میں اپنے روم میں تنہا نہیں تھا‘ کئی سارے لوگ تھے‘ سلمان اور راکھی بھی موجود تھے‘ میں نے اپنی بوجھل پلکوں کو بمشکل کھول کر کمرے میں چاروں جانب نگاہیں گھمائیں تو راکھی کی پرمسرت لہجے میں آواز سنائی دی۔

”شاید اسے ہوش آ گیا ہے !“

”ہاں ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ سلمان اور راکھی میرے اوپر جھک آئے۔

”تم کیسے ہو شہروز...... اب طبیعت کیسی ہے؟“ دونوں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ میں نے کمزور لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے کیا ہوا ہے......؟“ میں نے ان دونوں کی موجودگی پر حیرت زدہ ہو کر سوچا اور پوچھا۔

”میں نواب صاحب کو شہروز کے ہوش میں آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔“ قریب کھڑا گارڈ عبدالرحیم یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

”تمہیں شدید سردی سے بہت تیز بخار ہو گیا تھا‘ تم ہوش میں نہیں تھے‘ پتا نہیں بخار کی شدت سے بڑبڑا رہے تھے۔ بار بار اماں بابا کو پکار رہے تھے۔ ملازم تمہیں جگانے کے لیے آیا تو اس نے دیکھا کہ تم بستر پر سکڑے سمٹے لیٹے سردی سے کپکپا رہے ہو اور تمہارا جسم تیز بخار سے تپ رہا تھا۔ اس نے نواب صاحب کو اس بات کی اطلاع دی۔ نواب صاحب نے ڈاکٹر کو بلوایا۔ اس نے تمہیں چیک کیا ...تمہارا بلڈ بھی ٹیسٹ کرایا گیا‘ کیونکہ بار بار انجکشن دینے کے باوجود بھی تمہارا بخار نہیں اتر رہا تھا۔ تمہیں پورے چوبیس گھنٹے بے ہوشی کے عالم میں گزر چکے ہیں۔ تب نواب صاحب نے تمہاری دیکھ بھال کے لیے مجھے یہاں رہنے کے لیے کہا‘ بھگوان کا شکر ہے کہ تم ہوش میں آ گئے ہو۔ بخار بھی اتر گیا ہے۔“ راکھی نے تفصیل سے مجھے بتایا۔

”میری بلڈ کی رپورٹ کہاں ہے......؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو ڈاکٹر کے پاس ہی ہے۔ وہ تمہیں دیکھنے کے لیے آئے گا تو خود ہی پوچھ لینا‘ میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔ اگر چاہو تو واش روم چلے جاؤ...... ہاتھ منہ دھو لو......!“ راکھی نے کہا تو سلمان راکھی کو رکنے کا کہہ کر خود باہر چلا گیا۔

میں تھوڑی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ پسینے کی وجہ سے جسم سے بدبو آ رہی تھی‘ میرا دل چاہا کہ میں غسل کر لوں۔ میں نے پہلے اپنا ٹمپریچر لیا‘ نارمل تھا‘ اس لیے گرم پانی سے شاور لیا اور خود کو فریش محسوس کرنے لگا۔

میں ایک ڈاکٹر تھا اور اپنے بخار کی یہی وجہ سمجھ میں آئی کہ شاید میرا معدہ ٹھیک نہیں ہے‘ ٹمپریچر اسی وجہ سے ہوا تھا‘ اور شاید اس رات جو خواب دیکھا تھا اس نے میری طبیعت کو خاصا مکدر کر دیا تھا۔

بہرحال اب میں بالکل ٹھیک تھا‘ سلمان کے کہنے پر میرے لیے سوپ لایا گیا‘ میں نے ناشتہ کیا‘ راکھی اور سلمان میرے پاس ہی بیٹھے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور نواب اندر آیا۔

”کیا حال ہے جوان......؟ کیا تم مریض بن کر خدمت کروا رہے ہو...... تم نے تو پریشان کر دیا یار !“ نواب نے اندر آ کر کھڑے کھڑے میرا حال پوچھا۔

”انسانی جسم میں جو مشینری فٹ ہے اس میں بھی کبھی کبھی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارا بخار کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا میں تو خاصا فکرمند ہو گیا تھا‘ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ ابھی اس کو

جلدی سے کھڑا کرو۔ میرے بہت سے کام اس کے بغیر ادھورے پڑے ہیں۔ تمہارا بلڈ بھی ٹیسٹ کروایا...... سب کچھ ٹھیک ہے بس تمہارا پیٹ گڑبڑ ہے۔" نواب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی! میرا خود کا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھی وے...... تم آرام کرو...... کھاؤ پیو...... کل ملتے ہیں۔" نواب نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے چلا گیا۔

سلمان کی موجودگی کی وجہ سے راکھی مجھ سے کھل کر بات نہیں کر پا رہی تھی اس لیے وہ سلمان سے بولی کہ اب شہروز ٹھیک ہے اس لیے وہ چلا جائے اور اپنے کام کرے۔

"میں تو جا ہی رہا ہوں .. اور تم یہاں بیٹھ کر کیا کرو گی۔" اس نے راکھی سے کہا۔

"میں نے کیا کرنا ہے .. شہروز سے باتیں کروں گی۔ اس کا دل بہلاؤں گی۔" راکھی نے تنک لہجے میں جواب دیا تو سلمان باہر چلا گیا۔

سلمان کے جانے کے بعد راکھی بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی اور اس نے چٹاچٹ کئی بوسے میرے چہرے کے لے ڈالے....

"ارے یہ کیا اماؤں کی طرح مجھے پیار کر رہی ہو۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"اچھا میرا پیار تمہیں ایک ماں کا پیار لگ رہا ہے اگر کہو تو محبوبہ بن جاؤں۔" اس نے مصنوعی خفگی بھرے لہجے میں کہا اور پھر آنکھیں مٹکا کر آخری الفاظ معنی خیز لہجے میں کہے۔

"فی الحال میری جان بخش دو...... میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم برا نہ مانو تو تم بھی فی الحال چلی جاؤ۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا تو وہ بنا ایک لفظ کہے چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔

راکھی کے جانے کے بعد میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ ذرا ہی دیر میں مجھے دوبارہ نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ وہ پورا دن اور پوری رات میں نے آرام کیا۔

اگلے دن میں پوری طرح ٹھیک تھا ناشتے سے فارغ ہو کر مجھے نواب کے بلاوے کا انتظار تھا۔ اس اتنی بڑی کوٹھی میں ڈھیروں ملازمین اور لوگ رہتے تھے لیکن سارے لوگوں کو بیکار میں ادھر ادھر گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی سب کے کمرے تھے اور لوگ زیادہ تر اپنے کمروں ہی میں رہتے تھے اور ضرورت کے تحت باہر نکلا کرتے تھے اس لیے جب بھی میں باہر نکلا مجھے کوٹھی میں خاموشی محسوس ہوئی تھی۔

پھر میری توقع کے عین مطابق نواب کا بلاوا آ گیا اور یہ بلاوہ اس کے سیل فون کے ذریعے میرے سیل فون پر آیا تھا رابطہ ہو جانے پر اس نے کہا۔

"شہروز طبیعت کیسی ہے؟"

"بالکل ٹپ ٹاپ!" میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی سے تیار کیا ہوا تھا اس لیے خوش گوار لہجے میں کہا۔

"تو بس ٹھیک ہے ادھر ہی چلے آؤ بلکہ تم ایسا کرو......" اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "تم ڈرائنگ روم میں پہنچو میں بھی ادھر ہی آ رہا ہوں۔ دراصل میں نے اسے بھی بلوایا ہے جسے ایک ضروری کام سے تمہارے ساتھ بھیجنا ہے۔"

"بہت بہتر سر! میں ابھی ڈرائنگ روم میں پہنچ رہا ہوں۔" میں نے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

اسی ڈرائنگ روم میں پہلی مرتبہ میری نواب سے ملاقات ہوئی تھی اور میں اس کی پرشکوہ اور نفیس پرسنالٹی سے مرعوب ہو کر ملا تھا نواب آج بھی لباس کے

معاملے میں خاصا نفیس واقع ہوا تھا۔

اس کی رنگت سرخ و سفید تھی۔ سر پر سامنے سے اب تو بال کم ہو گئے تھے لیکن اپنی جوانی کے دور میں وہ خاصا ڈیشنگ رہا ہوگا اور پھر سے اس کی بات چیت کا انداز... سب کچھ ہی تو دوسروں کو موہ لینے والا تھا وہ بظاہر جتنا جاذب نگاہ تھا اندر سے اتنا ہی غلیظ تھا۔

اس خیال کے آتے ہی مجھے اپنا خواب یاد آ گیا۔ میں نے ایک لمحہ کو رک کر سوچنا چاہا پھر یہ سوچ کر اس خواب کو ذہن سے جھٹک دیا کہ اس رات میرا معدہ ٹھیک نہیں تھا اس لیے مجھے یہ الٹا سیدھا خواب دکھائی دیا اور چونکہ اماں بابا ارمان اور فائزہ ہر وقت میری سوچوں میں موجود رہتے ہیں اس لیے خواب میں بھی ان ہی لوگوں کی شکلیں دکھائی دیں۔

ڈرائنگ روم میں نواب کو آنا تھا اس لیے اس کے دروازے پر ایک گارڈ پہلے ہی سے موجود تھا میں دروازے کے قریب پہنچا تو گارڈ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور میرے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔

ڈرائنگ روم خالی تھا ابھی تک یہاں اور کوئی نہیں آیا تھا پتا نہیں نواب نے کسی کو اور میری کس قسم کی مدد کے لیے بلایا ہے میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ ڈرائنگ روم کا دوسری جانب والا دروازہ کھلا جہاں سے باہر سے آنے والے مہمان ڈائریکٹ ڈرائنگ روم میں آتے ہیں۔ گارڈ اس دروازے پر بھی موجود تھا۔ اس مرتبہ بھی دروازہ اس نے کھولا تھا۔

لیکن اندر جو ہستی آئی اس پر نگاہ پڑتے ہی میں اپنی جگہ سے بے ساختہ کھڑا ہو گیا اور میرے منہ سے نکلا۔

"تم... یہاں... !"

❁ ❁ ❁

مجھے ہوش آیا تو میں اپنے روم میں بیڈ پر موجود تھی۔ اماں اور آنٹی روشن آرا میرے نزدیک بیٹھی تھیں۔ آنٹی روشن مسلسل اپنے آنسو اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کر رہی تھیں اور اماں سے کوئی بات کر رہی تھیں۔ میری آنکھیں کھلی دیکھیں تو فوراً میرے اوپر جھک آئیں اور بولیں۔

"کیسی ہے میری بیٹی...... میری جان......!" ان کے لہجے میں ممتا کی تڑپ اور شفقت محسوس کرنے کے باوجود میں نے جھٹ اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔ جب کہ میرا سوکھے پتے کی طرح لرزتا اور کانپتا ہوا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اٹھوں اور جھٹ اپنی ماں کے سینے سے لگ جاؤں...... اس گرمی کو محسوس کروں اور دھڑکتے دل کی صدا کو سنوں جو صرف اور صرف ایک حقیقی ماں ہی کی اپنی اولاد کے لیے ہوتی ہے جسے اتنی تکلیف سہہ کر اس نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہوتا ہے۔

پتا نہیں میرے اندر اتنا سارا دکھ تھا یا غصہ تھا میں نے غیر محسوس طریقے سے ایسا کیوں کیا۔ پھر میں نے کروٹ بدل لی اور آنسو میری پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر بہنے لگے۔

کاش میں نے وہ سب نہ سنا ہوتا کاش میں ہمیشہ کی طرح آج بھی اس ساری حقیقت سے ناآشنا ہی رہتی۔ آ... گہی بھی ایک عذاب بن جاتی ہے۔

آج مجھے معلوم ہوا کہ امی مجھے لے کر مہینوں میری سرمئی امی کے ساتھ ان کے گھر پر رہی تھیں۔ پھر مجھے جان بوجھ کر ان کے حوالے کر کے کہیں چلی گئیں تھیں اور ایسی گئیں کہ کبھی پلٹ کر میری خبر بھی نہ لی۔

اور ...... اور یہ بات اماں بابا اور میری امی بھی جانتی تھیں کہ میرے والدین کون ہیں اور سب نے ہی مجھ سے یہ سب چھپایا امی کیوں دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی تھیں جب میں ان سے اپنے باپ کا نام پوچھا کرتی تھی جب کہ وہ جانتی تھیں کہ میرا باپ کون ہے

آج ایک بار پھر میرے ذہن میں بہت سے سوال گردش کرنے لگے اور میرے ان سوالوں کے جوابات مجھے میری یہ حقیقی ماں ہی دے سکتی تھیں اور آج انہیں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔ ورنہ... !

"روشنی... میری روشنی بیٹا... میری جانب دیکھو اپنی ماں کی جانب... اللہ کے واسطے تم تو مجھ سے اس طرح منہ نہ موڑو.... مجھ سے تو میری تقدیر ہی نے منہ موڑ لیا تھا... دنیا کی ہر خوشی نے دامن چھڑا لیا تھا... میں تو سب کچھ بھول گئی تھی۔ اگر یاد تھی تو صرف تمہاری اپنی روشنی کی... اگر تم مجھ سے ناراض ہو تو لو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں... مجھے معاف کر دو... غصہ کر لو... اپنی ماں کو برا بھلا کہہ لو... لیکن ایک بار ماں کہہ کر میرے سینے میں جلتی ہوئی جدائی کی اس آگ کو میرے سینے سے لگ کر بجھا دو۔"

امی بری طرح روتے ہوئے کہے جا رہی تھیں، میں نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا تو ان کے دونوں ہاتھ معافی کے لیے جڑے ہوئے تھے، یہ منظر میری برداشت سے باہر ہو گیا اور میں تیزی سے اٹھ بیٹھی اور امی کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو کھول کر ان کی کھلی بانہوں میں سما گئی، ان کے محبت سے لبریز دل کی دھڑکن کو سننے لگی، وہ کیسا سکون اور طمانیت کا احساس تھا، جو اس وقت میں نے محسوس کیا، ایک ٹھنڈک تھی جو میرے سارے وجود میں سرائیت کرتی جا رہی تھی۔

دیر تک ہم ماں بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتے رہے، ایک دوسرے کے چہرے کو چومتے رہے۔ کافی دیر کے بعد ہمارے اندر سے ابھرتا ہوا جذبات کا وہ تلاطم تھما اور ہم پرسکون ہو کر بیٹھے، اماں نے مجھے اور امی کو پانی پلایا۔ میں امی کے ہاتھوں کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں تھام کر بیٹھی تھی کہ اگر میری گرفت ذرا بھی ڈھیلی ہوئی تو امی پھر کہیں غائب ہو جائیں گی۔

شمسو بابا بھی اس کمرے میں آ گئے اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"روشن آرا بیگم آپ ہی بٹیا سے ہمیں معافی دلوائیے اور انہیں بتائیے کہ یہ آپ ہی کا حکم تھا کہ بٹیا کو بڑا ہونے کے بعد بھی کسی بات کا پتا نہ چلے اور دیکھ لیں کہ ہم نے اپنے وعدے کی لاج رکھی اور بے جی نے بھی بٹیا کو کچھ نہیں بتایا۔"

"میں آپ دونوں کی بہت زیادہ شکر گزار ہوں شمسو بابا اور آپا حمیدہ کہ سرمئی باجی کے بعد آپ دونوں نے میری روشنی کا اتنا خیال رکھا...." امی نے ممنونیت کے گہرے احساس کے ساتھ اماں اور بابا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم تو خادم ہیں جی... اور خادموں کا کام اپنے مالک کا حکم ماننا اور ان سے وفاداری کرنا ہے۔" شمسو بابا نے نگاہیں جھکا کر نیازمندی سے کہا تو میں ایک چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتری اور بابا کے گلے لگ کر کہا۔

"خبردار بابا جو آئندہ آپ نے اپنے لیے یہ لفظ استعمال کیا... آپ تو صرف میرے بابا ہیں اور بس....!"

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے بٹیا! اللہ نصیب اچھا کرے۔" بابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا تو امی نے با آواز بلند آمین کہا۔

وہ دن میری زندگی کا سب سے بڑا خوشی کا دن تھا، میں نے امی سے شکوہ کیا کہ آپ نے پلٹ کر ایک بار بھی میری خبر نہیں لی، تو امی نے بتایا کہ تین چار سال کے بعد وہ ایک مرتبہ اس گھر میں آئی تھیں لیکن ہم لوگ وہاں نہیں تھے، کوئی اور لوگ وہاں رہ رہے تھے۔ پھر اس کا جواب اماں نے دیا کہ ہم لوگ کیوں کہ نواب سطوت سے بھی چھپ کر وہاں رہ رہے تھے تو ایک مرتبہ نواب سطوت کے ایک آدمی نے شمسو بابا کو بازار میں دیکھ لیا اور پوچھا کہ وہ لوگ کہاں رہ رہے ہیں اور یہ بھی کہ سرمئی بی کہاں غائب ہو گئیں۔

یہ بات جب شمسو بابا نے امی کو آ کر بتائی تو انہوں نے فوراً ہی وہاں سے بہت دور اس جگہ مکان خرید لیا اور ویسے بھی بے جی بہت زیادہ چاہنے لگی تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ اب اچانک کہیں سے روشن آراء بیگم آئیں اور اپنی اولاد کی واپسی کا مطالبہ کریں، شاید یہ ان کی خود غرضی تھی اس لیے وہ اس گنجان آباد علاقے میں آ کر بس گئیں۔

"امی آپ سب نے مجھ سے میرے باپ کا نام کیوں چھپایا...؟" میں نے سوال کیا تو امی نے جواب دیا کہ وہ بہت زیادہ ڈر گئی تھیں، انہیں نواب سے نہ وراثت چاہیے تھی نہ دولت نہ نام... بس انہیں تو میری زندگی عزیز تھی... وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کہیں میں جذبات میں آ کر کسی اور سے اس بات کا ذکر نہ کر دوں یا پھر اس کے سامنے جا کر کھڑی نہ ہو جاؤں.... اور پہچان لیے جانے کی صورت میں وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑتا۔

امی کیا سرمئی امی نواب سطوت سے محبت کرتی تھیں...؟" میں اپنے دل میں مچلنے والے سوال کو ادا کرنے سے نہ روک سکی اور امی سے پوچھ بیٹھی۔ امی نے ایک گہری سانس لی اور بولیں۔

"ہاں! یہ بات انہوں نے خود مجھے بتائی تھی، کہ وہ نواب سطوت سے بے حد محبت کرتی تھیں، اسی لیے انہوں نے اپنا آبائی پیشہ بھی چھوڑ دیا تھا لیکن ان کا نکاح تمہارے والد سے نہیں ہوا تھا۔ بعد میں جب میرے حالات سنے تو انہیں بھی نواب سطوت سے نفرت ہو گئی۔

اور پھر وہ ساری رات ہم دونوں جاگتی رہیں، امی نے مجھے اپنی شادی سے پہلے سے نواب سطوت سے ملاقات ان سے شادی اور میری پیدائش سے لے کر کھوکھراپار والے مکان سے اس گھر میں آنے تک کے سارے واقعات تفصیل سے سنائے۔

شہروز کا ذکر آیا تو امی نے بتایا کہ وہ نواب سطوت کا آدمی ہے اور اس کے کہنے پر میرا کام تمام کرنے کے لیے آیا تھا، لیکن وہ ایک بہت اچھا لڑکا ہے۔"

میں یہ بات جان کر چونک گئی کہ وہ جس شخص کو باس کہہ رہا تھا، وہ نواب سطوت ہی تھا اور اس نے نواب سطوت کا نام میرے سامنے اس لیے نہیں لیا تھا کہ وہ امی کی زبانی ان کی ساری داستان سن چکا تھا۔ امی ہی کی زبانی مجھے اس بات کا بھی علم ہوا کہ شہروز نامی وہ نوجوان بھی نواب سطوت کے ظلم کا شکار ہوا ہے۔

اور پھر شاید ہماری تقدیر ہمیں ملوانا چاہتی تھی اس لیے شہروز امی کو لے کر جا رہا تھا کہ میری اور اس کی کار میں ٹکر ہو گئی اور یوں امی خود بخود میرے پاس پہنچ گئیں۔ مجھے یاد آیا کہ جب اماں نے امی کو دیکھا تو وہ انہیں پہچان گئی تھیں اور ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا کہ "یہ تمہیں کہاں مل گئیں۔" اور میں جلدی میں تھی اس لیے میں نے اماں کے الفاظ پر غور ہی نہیں کیا۔

امی کی بانہوں کے تکیے پر سر رکھ کر میں دنیا ہی کو بھول گئی، امی نے مجھے اپنی لائف کا ہر لمحہ بتایا، ان کا کہنا تھا کہ اب میں یہ بات بھول جاؤں کہ میرا باپ کون ہے، بس اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مجھے اور انہیں ملوا دیا ہے اس لیے ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم یہ بات ہمیشہ کے لیے بھول جائیں۔

باتیں کرتے کرتے اچانک مجھے حشام کا خیال آیا کہ میں نے رات کو اسے ایس ایم ایس کر کے کہا تھا کہ میں تمہیں خود کال کروں گی اور میں نے اپنا موبائل فون

سائیلنٹ موڈ پر کر دیا تھا۔ میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور موبائل دیکھا تو اس میں حشام کے پندرہ بیس ایس ایم ایس "کال می" کے تھے اور اتنی ہی مس کالز تھیں۔ میں جانتی تھی کہ حشام رات کے اس سمے بھی صرف میری کال کے انتظار میں جاگ رہا ہوگا' وہ میرے لیے بے حد فکرمند تھا' اس لیے میں نے اس کا نمبر پنچ کیا' پہلی ہی بیل پر حشام نے فون ریسیو کر لیا اور وہ بے تابی سے بولا۔

"سرمئی تم ٹھیک تو ہو...!"

"ہاں حشام میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آئی ایم سوری حشام میں تمہیں کال کرنے میں لیٹ ہوگئی۔ دراصل......!"

"او... تھینک گاڈ...!" اس نے شکر کا ایک طویل سانس لیا۔ "تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ یہ وقت میں نے کس اذیت میں گزارا ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو' یہ بتاؤ سب کچھ ٹھیک ہوگیا ناں...!"

"ہوں!" میں نے پرمسرت ہنکاری بھری۔ "میری امی میرے پاس میرے کمرے میں ہی ہیں۔"

"چلو بہت اچھی بات ہے... تمہاری تلاش ختم ہوگئی' میں تمہاری اس خوشی میں تمہارے ساتھ ہوں... بہت بہت مبارک ہو۔" حشام نے کہا۔ میں اس کے الفاظ اور لہجے میں چھپی مسرت کو بہت اچھی طرح محسوس کرسکتی تھی۔

"یہ سب بھی تو تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے' تم ہی نے تو اس جانب میری توجہ دلائی تھی۔ امی نے مجھے ہر بات بتادی ہے' اب میرے دل میں کوئی ملال نہیں ہے' بلکہ اس بات کا دکھ ہے کہ میری امی نے صرف میری جان بچانے کے لیے کتنے دکھ اٹھائے' اپنی ساری زندگی برباد کردی۔ میں تم سے ملوں گی تو ہر بات تفصیل سے بتاؤں گی۔" میں نے امی کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا جو خود بھی میری جانب محبت سے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"چلو تم امی کے ساتھ باتیں کرو... میں اب سوتا ہوں... بھوک بھی لگ رہی ہے' رات کو تمہاری فکر میں' میں نے ڈنر بھی نہیں لیا تھا۔" حشام نے کہا۔

"اوہو! تم کچھ کھالو ناں..." میں نے فکرمندی سے کہا۔

"اب کہاں سے کھاؤں۔ کچن بند ہے اور ویسے بھی سب کچھ فرج میں پڑا ہے' تمہیں پتا ہے میں ٹھنڈا کھانا نہیں کھاتا' اب ناشتہ ہی کروں گا۔" حشام نے کہا۔

"اچھا حشام میں کل نہیں آؤں گی... پلیز تم رمضانی صاحب سے کہہ دینا۔" میں نے کہا۔

"او کے میم...!" اس نے شوخ لہجے میں کہا پھر بولا۔ "اگر ہوسکا تو میں کل شام چکر لگاؤں گا۔ آنٹی سے ایک نئے رشتے کے ساتھ ملنے کے لیے...... آخر کو وہ میری ہونے والی ساس صاحبہ ہیں۔"

"شٹ اپ حشام..." میں نے ہنستے ہوئے کہا اور گڈ نائٹ کہہ کر فون بند کردیا۔

فون بند کرکے میں واپس امی کی جانب پلٹی تو وہ غور سے میرے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ایک بات پوچھوں روشنی...؟"

"ضرور پوچھیں امی.... بٹ آپ پہلے میرے ایک سوال کا جواب دیں۔" میں نے کہا تو امی نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلادیا۔

"میرا نام تو سرمئی ہے پھر آپ مجھے روشنی کیوں کہتی ہیں؟"

"اس لیے کہ میں نے تمہارا نام روشنی ہی رکھا تھا' بلکہ جب میں یہاں آئی اور میں نے تمہارا نام سرمئی سنا

تو مجھے بڑی حیرت ہوئی...... میں یہ بھی نہیں سمجھ سکی ہوں کہ باجی نے تمہارا نام سرمئی کیوں رکھا' انہوں نے تمہیں اپنا نام کیوں دیا...!" امی نے کہا۔

"میرا خیال ہے امی انہوں نے مجھے اپنا نام اس لیے دیا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی نئی تعمیر کرنا چاہتی تھیں' وہ شاید جیسا بننا چاہتی تھیں' انہوں نے مجھے ویسا ہی بنادیا۔" میں نے خیال آرائی کی۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو... وہ تھیں تو خاندانی طوائف... لیکن شاید ان کے اندر اپنے اس پیشے سے نفرت چھپی تھی... اس لیے ماں کے مرنے کے بعد اور سطوت سے محبت ہونے کے بعد انہوں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔" امی بولیں۔ اچانک ہی مجھے ایک خیال آیا کہ حشام امی سے ملنے کے لیے گھر آئے گا' ایک بات جو میں نے حشام سے چھپائی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اسے کبھی بھی معلوم ہو... کہیں ایسا نہ ہو کہ امی کے منہ سے کبھی بے خیالی میں نہ نکل جائے اس لیے کہا۔

"امی آپ یہ بات کبھی بھول کر بھی کسی کے آگے مت کہیے گا کہ میری پرورش کرنے والی عورت سرمئی بائی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ حشام کے والدین بھی آپ سے ضرور ملیں گے تو آپ صرف اتنا کہہ دیجیے گا کہ آپ نے اپنی دوست کو یہ قسم لے کر سونپا تھا کہ وہ کسی کو نہیں بتائے گی یہ لڑکی روشن آراء اور سطوت کی ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں بیٹا اس بات کو... تم فکر نہ کرو... ارے ہاں میری بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔" امی نے کہا۔

"جی... اب پوچھیں آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔" میں مطمئن ہوکر پوری طرح امی کی جانب متوجہ ہوگئی۔

"حشام بہت اچھا لڑکا ہے... مجھے پسند آیا... یہ بتاؤ کہ تمہاری اس کی دوستی صرف کولیگ کی حد تک ہے یا بات اس سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے"

"......!"

امی کی بات سن کر میں سناٹے میں آگئی... سمجھ میں نہیں آیا کہ امی کے آگے سچائی بیان کروں یا پھر گول مول جواب دے دوں لیکن پھر فیصلہ کیا کہ ایک ہی بار سچ بول دیتی ہوں۔

"میں نے کیا کوئی مشکل سوال کردیا ہے۔" امی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مشکل تو ہے پر اتنا مشکل نہیں کہ جواب ہی نہ دیا جاسکے... میں آپ سے قطعی جھوٹ نہیں بولوں گی..... امی مرحومہ نے میری تربیت کے دوران بار بار یہ بات میرے ذہن میں بٹھائی تھی کہ مجھے مرد ذات پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا ہے' کبھی اس کی محبت کے نام پر پھینکے ہوئے جال میں نہیں پھنسنا ہے۔ یہ ایسی مخلوق ہے جس سے جتنا زیادہ دور رہو اتنا ہی اچھا ہے' اس لیے میں نے کالج اور یونیورسٹی میں کبھی کسی سے دوستی نہیں کی۔

حشام میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا' اس نے ہمیشہ میری جانب پیش قدمی کی اور میں نے ہمیشہ اپنے قدموں کو پیچھے ہٹالیا' لیکن یہ میرے ساتھ ساتھ رہا' غیر محسوس طریقے سے میرے کام آتا رہا' میری مدد کرتا رہا' اس نے مجھ سے التجا کی کہ مجھ سے دوستی کرلو... میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گا' اس لیے امی میں نے اسے جان کر سمجھ کر اپنا دوست مان لیا۔ اس کے ساتھ ہی وارننگ بھی دے دی کہ ہمارے درمیان کبھی بھی مرد اور عورت والی محبت نہیں آئے گی...... اس نے اس بات کا خیال رکھا۔ میں بظاہر اسے منع کرتی رہی... لیکن امی...!" میں بات کرتے کرتے رک گئی... آگے بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

"لیکن کیا...؟" امی نے تیزی سے پوچھا۔

"لیکن امی..... پتا نہیں کب اور کیسے میں خود اس

کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ لیکن میں نے اپنے دل میں پلنے والے اس جذبے کا اظہار اس کے آگے نہیں کیا۔ لیکن جب اس نے جھوٹ موٹ اپنی منگنی اور شادی کے بارے میں بتایا تو میرے اندر کا چور میرے چہرے پر آ گیا اور اس نے میری چوری پکڑ لی۔ کل رات ہی تو ہمارے درمیان پہلی مرتبہ محبت کا اظہار ہوا ہے۔"

"لیکن امی ... !" میں نے جھٹ امی کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور کہا۔ "امی اگر آپ حشام کو میری زندگی کے ساتھی کے طور پر پسند نہیں کریں گی تو میں اف نہیں کروں گی۔ مجھے آپ پر اعتبار ہے اس لیے کہ زندگی اور دنیا کی بھٹی میں تپتے ہوئے جتنے تجربات سے گزر کر آپ نے دنیا اور انسانوں کی نفسیات خاص کر ایک مرد کی نفسیات کو سمجھا ہے میں نے نہیں۔ آپ کے انکار سے مجھے دکھ تو ہوگا۔ . لیکن میں صرف اور صرف آپ کا فیصلہ منظور کروں گی۔"

میری بات سن کر امی نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور میری پیشانی چوم کر مجھے خوش رہنے کی دعا دی۔ اور دونوں ہاتھ آسمان کی جانب اٹھاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"اللہ تو سرمئی باجی کی مغفرت فرما۔ ان کی زندگی کی لغزشوں کو معاف کردے۔ انہوں نے میری بچی کی پرورش بہت بہترین خطوط پر کی ہے۔"

دوسرے دن گھر میں بہت خوشیاں تھیں۔ سب ہی خوش تھے آج گھر کی فضا جیسی دکھائی دے رہی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی، دوپہر کو حشام کی کال آئی اور اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ اس کے ڈیڈی اور ممی بھی آ رہے ہیں۔ تب میں نے لگے ہاتھوں انہیں ڈنر کی دعوت دے ڈالی۔

حشام کے ڈیڈی امی سے دیر تک نواب سطوت کے حوالے سے باتیں کرتے رہے، ان کی ممی بھی گاہے بگاہے گفتگو میں حصہ لیتی رہیں۔ بہر حال وہ ایک خوشگوار شام تھی، رات گئے وہ سب گھر سے رخصت ہوئے تو میں نے امی کو بہت زیادہ خوش دیکھا۔ وہ میری جانب دیکھ دیکھ کر بار بار مسکرا رہی تھیں۔ میں نے سبب پوچھا تو بولیں۔

"اپنی بیٹی کا انتخاب مجھے بہت پسند آیا۔ اس کے والدین بھی بہت اچھے اور سلجھے ہوئے ہیں لیکن بات جب آگے بڑھے گی جب وہ لوگ حشام کا پیغام تمہارے لیے خود لے کر آئیں گے۔"

☆☆☆

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور مجھے بہت عرصے کے بعد کنیز کی شکل دکھائی دی۔ میں یوں اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا اور بے ساختہ کھڑا ہو گیا اور میرے منہ سے نکلا۔

"تم یہاں......؟"

"اور تم۔ ! او مائی گاڈ۔ مجھے تم سے ملوانے کے لیے یہاں بلوایا گیا ہے!" اس نے ایک خوش گوار حیرت کے ساتھ پرمسرت انداز میں کہا اور تیزی سے میرے قریب آ کر میرے گلے سے لگ گئی۔

بہت گرمجوشی کے معانقے کے بعد ہم علیحدہ ہوئے تو وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بہت دنوں کے بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں تو دل چاہ رہا ہے کہ دیر تک تمہیں دیکھتی رہوں۔ تمہیں پتا ہے میں نے تمہیں بہت یاد کیا ہے، لیکن ہم جہاں ہیں وہاں اپنی پسند سے نہ تو کسی سے مل سکتے ہیں اور نہ اپنا بنانے کی خواہش کر سکتے ہیں۔ ہم تو کٹھ پتلیاں ہیں اور ہماری ڈور دوسروں کے ہاتھوں میں ہے۔" اس نے گہرے دکھ اور اداسی بھرے لہجے میں کہا۔

"تو تم مجھے فون کر لیتیں، اس پر تو پابندی نہیں تھی۔" میں اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"پابندی تھی ناں۔ !" اس نے مایوس کن انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟ کس نے لگائی تھی یہ پابندی۔ اور کیوں؟" میں نے ہلکے غصیلے لہجے میں کہا۔

"آغا قزلباش نے، اس نے صاف طور پر مجھے وارن کیا تھا کہ میں تمہیں فون کر کے ڈسٹرب نہ کروں۔ کیونکہ تم نواب صاحب کے ساتھ ہو۔ .. اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔"

"ہوں۔ !" میں نے پرسوچ انداز میں ایک ہنکاری بھری پھر آغا کو ایک فحش سی گالی دے ڈالی۔ ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے جہاں میں اپنے والدین کی دی ہوئی ساری تہذیب بھول چکا تھا وہیں ان کے انداز میں بات چیت بھی کرنے لگا تھا، آغا کے لیے میرے منہ سے گالی سن کر کنیز ہنس پڑی اور بولی۔

"بڑی ترقی کر لی ہے...... پہلے تو ایسے نہ تھے۔"

"آئی ایم سوری یار۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ میرے سامنے ایک محترمہ کھڑی ہیں۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

"اٹس او کے......" کنیز نے بڑے مزے سے درگزر کرتے ہوئے کہا پھر بولی۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہمیں کام کیا کرنا ہوگا، مجھے تو باس نے حکم دیا تھا کہ میں کلفٹن کی اس کوٹھی میں پہنچ جاؤں۔ وہیں نواب صاحب مجھے کسی کے ساتھ کسی مشن پر بھیجنا چاہتے ہیں، لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ شخص تم ہوگے، لیکن یہاں آتے ہوئے ایک موہوم سی امید تھی کہ اگر تم یہیں موجود ہوئے تو ہو سکتا ہے کہ تم سے ملاقات ہو جائے یا کم از کم تمہاری ایک جھلک ہی دکھ جائے، لیکن اب میں بہت خوش ہوں کہ میں تمہارے ساتھ یہ مشن کروں گی۔"

"تمہیں بڑی خوش فہمی تھی کنیز کہ یہاں میری تم سے ملاقات ہو جاتی اور میری جھلک بھی تمہیں دکھائی دے جاتی۔ وہ تو میں اور تم مل کر ساتھ کام کرنے والے ہیں اس لیے ہماری ملاقات ہو گئی، ورنہ اتنی بڑی کوٹھی میں بہت سے لوگ رہتے ہیں، مگر یہاں کسی کو بھی کسی سے آزادانہ ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور رہی بات اس کی کہ کام کیا کرنا ہے، اس سے تو میں بھی لاعلم ہوں، ابھی نواب صاحب یہاں آئیں گے اور ہمیں بتائیں گے۔" میں نے کہا اور اس سے پہلے کہ کنیز مجھ سے یا میں کنیز سے کوئی بات کرتا، ایک بار پھر دروازہ کھلا اور نواب اندر آیا۔ ہمیں ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر بولا۔

"تو تم لوگ مل لیے ایک دوسرے سے .. واقف تو تم پہلے سے تھے ناں۔ میں نے تمہیں جان بوجھ کر نہیں بتایا تھا کہ تم اچانک اپنی پرانی ساتھی سے ملو گے تو تمہیں اچھا لگے گا۔"

"یہ حقیقت ہے کہ ہمیں اچانک اس ملاقات سے بہت خوشی ہوئی ہے۔" میں نے کہا، لیکن میں نے کنیز کی جانب دیکھا وہ کچھ نہیں بولی تھی وہ سر اور نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔

"اچھا بھئی اب تم دونوں وہ کام سن لو جس کے لیے تمہیں بلایا گیا ہے۔" نواب نے کہا تو میں اور کنیز پوری توجہ سے نواب کی بات سننے لگے، اس نے کہا۔

"تمہیں یاد ہے شہروز میں نے تم سے عرفان رسول کا ذکر کیا تھا۔"

"جی نواب صاحب یاد ہے آپ آگے فرمائیے۔"

میں نے ایک تابعدار غلام کے لہجے میں کہا۔

"تمہیں اور کنیز کو آج رات اس کے بنگلے میں داخل ہونا ہے۔ اور شہروز تم اپنے ساتھ ڈیجیٹل کیمرہ لے کر جاؤ گے۔ تمہیں وہاں صرف اتنا کرنا ہے کہ کنیز کے ساتھ عرفان رسول کی کچھ نازیبا اور فحش تصاویر اتارنا ہیں۔ میرے خیال میں مجھے اس بات کی وضاحت کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ نازیبا اور فحش تصاویر اتارنے کے لیے کنیز تمہارا اور عرفان رسول کا حلیہ کیسا ہونا چاہیے اور پوز کیسے ہونے چاہئیں۔" نواب نے بہت ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے بات کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

نواب کی بات سن کر کنیز کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ مجھے اندر سے غصہ تو بہت آیا لیکن میں خاموش رہا۔ پھر بولا۔

"لیکن نواب صاحب میں تو آدھی رات کو عرفان رسول کے گھر میں کسی نہ کسی طرح داخل ہو ہی جاؤں گا، لیکن کنیز کیسے۔ کنیز کیسے وہاں تک پہنچ پائے گی۔"

"اب کیا یہ سارے طریقے بھی میں تمہیں سمجھاؤں۔ تمہاری عقل کیا گھاس کھانے چلی گئی ہے..... جس طرح سے بھی ہو..... تم دونوں سر جوڑ کے بیٹھو.. پلاننگ کرو۔ آج کا سارا دن تمہارے پاس ہے بس تمہیں یہ کام ہر قیمت پر کرنا ہے۔ اگر اس کام کے لیے تمہیں اس کے گارڈ کو بھی مارنا پڑے تو مار دینا.. مجھے کل صبح ہر قیمت پر رزلٹ چاہیے۔ تم دونوں اگر چاہو تو دن میں اس کے بنگلے کا ایک چکر بھی لگا سکتے ہو۔" نواب نے غصے اور ناگواری سے حتمی لہجے میں کہا۔

"او کے نواب صاحب..... آپ کا کام ہو جائے گا۔ بس میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں اگر آپ بتانا چاہیں۔" میں نے کہا۔

"پوچھو... !" انہوں نے حیرت نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"میری اطلاع کے مطابق عرفان رسول کا سارا خاندان تباہ ہو گیا تھا، اس کی بیوی اور بیٹی مر چکی ہیں، تو اب تک وہ تنہا زندگی گزار رہا ہے یا پھر اس نے دوسری شادی کر لی تھی، اور اس کے بچے وغیرہ بھی ہیں۔" میں نے بہت محتاط لہجے میں پوچھا۔

"گڈ.. یہ تم نے اچھا سوال کیا ہے۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "اس نے تین چار سال قبل ایک جواں سالہ لڑکی سے شادی کر لی تھی.. وہ ایک بے سہارا لڑکی تھی، اور جناب عرفان صاحب نے ان پر اتنی مہربانی کی کہ اس کا خود سہارا بن گئے۔" نواب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ بھی سنا گیا ہے کہ اس کی ایک ڈھائی تین سال کی بیٹی بھی ہے، اور وہ اپنی بیوی اور بیٹی سے بہت محبت کرتا ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے، میں اور کنیز بیٹھ کر اطمینان سے پلاننگ کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ معلومات بہت ضروری تھیں۔" میں نے کہا۔

"اور ہاں اگر تمہارے کام کی راہ میں اس کی بیوی یا بچی رکاوٹ ڈالے تو تم بے شک انہیں بھی راستے سے ہٹا دینا... ویسے اگر وہ دونوں زندہ رہیں تو بہتر ہے، کیونکہ تم ان دونوں کو ڈھال بنا کر اپنا کام آسانی سے کر سکتے ہو۔" نواب نے بے رحمی سے کہا اور واپس جانے کے لیے پلٹ گیا۔ اس نے یہ ساری باتیں کھڑے کھڑے ہی کی تھیں۔ جاتے جاتے وہ واپس پلٹا اور بولا۔

"تم کنیز کو اپنے روم میں لے جا سکتے ہو وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات چیت کرو... کیمرہ تمہیں مل جائے گا، لیکن یاد رہے کہ مجھے رزلٹ سو فیصد صاف اور کلیئر چاہیے اور تصویروں سے یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ یہ تصاویر زبردستی اتاری گئی ہیں۔" اپنی بات ختم کر کے

نواب دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"باسٹرڈ!" میں نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے نواب کو گالی دی۔ "پتا نہیں وہ وقت کب آئے گا جب میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔"

نواب کے جانے کے بعد کنیز ہکا بکا کھڑی تھی وہ عرفان رسول کو نہیں جانتی تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگی کہ "عرفان رسول کون ہے۔ اور یہ نواب صاحب مجھ سے اس قسم کا کام کیوں لے رہے ہیں۔"

"تم تو اس طرح کہہ رہی ہو کہ تم بڑی ستی ساوتری اور پردے کی پابند مسلمان عورت ہو۔" میں نے بری طرح جھنجلا کر کہا تو کنیز کا چہرہ اتر گیا۔ اور وہ بے دردی کے ساتھ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی، تب مجھے اپنے الفاظ اور لہجے کی بدصورتی کا احساس ہوا اور میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"سوری کنیز مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا، تم میرے ساتھ میرے روم میں آؤ، وہیں بیٹھ کر میں تمہیں عرفان رسول کے بارے میں بتاؤں گا... اور بہرحال یہ کام بھی کرنا ہی ہے۔ ہماری مجبوری ہے، ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔"

کنیز نے میری بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے میرے ساتھ چلنے لگی۔ میں کنیز کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا اور اطمینان سے بیٹھ کر اسے عرفان رسول کی ساری کہانی سنائی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس شریف آدمی نے نواب صاحب کا کیا بگاڑا ہے۔" کنیز نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔

"وہ کیا اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے، بگاڑنا تو یہ چاہتا ہے اس کا۔ اس کی اس طرح کی تصاویر حاصل کر کے وہ اس کو بلیک میل کرے گا اور اپنی کوئی بات منوائے گا۔ میری سمجھ میں تو یہی کچھ آ رہا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" کنیز بولی اور پھر دیر تک خاموش بیٹھی رہی تب میں نے کہا۔

"کیا بات ہے کنیز تم ابھی تک میری غصے میں کہی گئی بات پر ناراض ہو.. آئی ایم رئیلی سوری یار بس غصے اور جھنجلاہٹ میں منہ سے ایسے الفاظ نکل گئے۔" میں نے ایک بار پھر معذرت کی اور اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔

"یک بات بالکل سچ بتانا شہروز" اس نے آہستہ سے کہا میں نے دیکھا کہ اس کے سانولے چہرے پر سرخی چھائی ہوئی ہے۔

"کیا.. ؟ پوچھو!" میں نے کہا۔

"تم مجھے بہت گری ہوئی رذیل اور حقیر لڑکی سمجھتے ہو ناں!" اس کی جھیل جیسی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

"ایسی بات نہیں ہے کنیز.. !" میری سمجھ میں اس کی بات کا جواب نہیں آیا تو میں نے اسے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ "تم نے خود ہی تو مجھے اپنے کام کے بارے میں بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ آغا کے پاس بھی تمہاری بہت سی ایسی ہی تصاویر ہیں گلزار اور دلبر کے ہمراہ..... اور ان ہی تصاویر کی وجہ سے تم آج تک بلیک میل ہو کر ان کا ہر ناجائز کام کر رہی ہو..... وہ تو تمہیں بہت سے لوگوں کے خلوت کدے میں اپنے کام نکلوانے کے لیے بھیجتا رہتا ہے..... تم نے جب نواب کے کام کو سن کر پریشانی کا اظہار کیا تو میرے منہ سے غصے میں وہ الفاظ نکل گئے.. جس سے تمہیں اتنا دکھ پہنچا..... کیونکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میری مجبوری ہے کہ مجھے یہ کام اسی طرح کرنا ہوگا جس طرح نواب چاہتا ہے.. اور تمہیں بھی کرنا ہے...." میں نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں گردن ہلانے لگی، مجھے اس لمحے اس کے چہرے پر بہت اداسی اور دل گرفتگی

دکھائی دی‘ وہ مجھے پہلے ہی اپنی کہانی سنا چکی تھی اس لیے میں سمجھ رہا تھا کہ اس وقت اس کے دل کی کیا حالت ہو رہی ہے‘ بنیادی طور پر وہ ایک شریف لڑکی تھی اور ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر اس دل نادان کے ہاتھوں وہ تباہی اور ذلت کے اس گہرے گڑھے میں گر چکی تھی لیکن اندر سے آج بھی وہ ایسی تھی‘ بے شک ان درندوں نے اسے بھرے بازار میں برہنہ کر کے اسے اس قسم کے برے کاموں میں ملوث کر دیا تھا‘ اور چاہ کر بھی وہ پاکیزگی کا وہ لبادہ نہیں اوڑھ سکتی تھی جو اس کے جسم سے نوچ لیا گیا تھا‘ نہ وہ اب اپنے گھر واپس جا سکتی تھی۔ سوائے موت کے اس کے لیے کوئی دوسرا دروازہ نہیں کھلا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک تو اسے سمجھاتا رہا‘ رفتہ رفتہ وہ دوبارہ سے وہی کنیز بن گئی‘ پھر میں اور وہ بیٹھ کر اپنے کام کی تکمیل کے لیے پلاننگ کرنے لگے۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں عرفان رسول کے گھر کے اطراف کا ایک چکر لگا لینا چاہیے‘ تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ اس کے گھر میں آدھی رات کو کس طرح باحفاظت داخل ہوا جا سکتا ہے اور یہ بھی دیکھ لیں کہ اس کے بنگلے پر سیکورٹی کا کیا اور کتنا انتظام ہے‘ اور ہمیں اندر داخل ہونے کے لیے کتنی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔“ میں نے کنیز سے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے تو پھر چلو!“ وہ میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی‘ میں نے کار کی چابی اٹھائی اور کنیز کے ہمراہ باہر نکل آیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ بہت سی ان دیکھی آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہیں لیکن مجھے ان کی کوئی فکر نہیں تھی۔ کیونکہ اب میں یہ بات جان چکا تھا اور محتاط رہتا تھا اور ویسے بھی اس وقت تو میں نواب ہی کے کام سے باہر جا رہا تھا۔

راستے میں کنیز کافی ریلیکس تھی اس نے مجھے نواب کے بارے میں مزید انفارمیشن دیتے ہوئے بتایا۔

”اب تک تو تم نواب کے بارے میں اتنا جان چکے ہو گے کہ یہ لوگوں میں ایک روحانی شخصیت کے طور پر مشہور ہے‘ اس کے گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کے علاوہ اس ملک کے بڑے بڑے شہروں کے بہت سے پڑھے لکھے اور دولت مند لوگ بھی اس کے پاس اپنی حاجتیں لے کر آتے ہیں۔ اور یہ ایک پیر فقیر کی طرح ان کی حاجتیں سنتا ہے اور پھر ان کے کام ہمارے اور تمہارے ذریعے کرواتا ہے۔ اور پھر ان سے بڑے تگڑے نذرانے وصول کرتا ہے‘ اور وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اس پیر کی دعا ہے۔“

”تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے ان لوگوں میں شامل ہوئے کئی سال بیت گئے ہیں۔ میرا دماغ جاگ رہا ہے آنکھیں اور کان کھلے ہیں بس صرف زبان بند ہے‘ میں یہ بات بھی اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ اگر ان لوگوں کو ذرا بھی اس بات کی بھنک پڑ گئی کہ ہم میں سے کوئی ان کے اس بہروپ کو سمجھ گیا ہے تو وہ دن ہماری زندگی کا آخری دن ہو گا بس ہم ویسا ہی کیے جا رہے ہیں جیسا یہ چاہتے ہیں‘ اب اس عرفان رسول ہی کو لے لو‘ بظاہر اس کی اور نواب کی ہمیں کوئی دشمنی دکھائی نہیں دیتی لیکن نواب کیوں اس کو بلیک میل کرنے کے لیے یہ کام کروا رہا ہے‘ یقیناً اس سے کسی نے عرفان رسول سے کوئی کام نکلوانے کے لیے کہا ہو گا اور اس نے منع کر دیا ہو گا‘ اب نواب کو اپنی بات منوانے کا سب سے آسان طریقہ یہی دکھائی دیا ہو گا اور سب سے بڑی دکھ کی بات تو یہ ہے کہ عرفان رسول کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ یہ کام نواب کروا رہا ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم ایک ڈان کے پالتو غنڈے یا پالتو کتے ہیں۔“ میں نے سامنے نگاہیں جمائے ہوئے اپنے دانتوں کو غصے کی شدت سے بھینچتے ہوئے کہا۔

”بالکل ایسی ہی بات ہے۔“ کنیز نے نارمل لہجے میں کہا تو میں اس کی شکل دیکھنے لگا‘ میرا دماغ ایک بار پھر گرم ہونے لگا‘ لیکن جلد ہی میں نے اپنے غصے پر قابو پا لیا‘ میں یہ بات جانتا تھا کہ غصہ انسان کی عقل کو خبط کر دیتا ہے اور انسان کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں رہتا۔

باتیں کرتے کرتے ہم گلشن کے علاقے میں پہنچ گئے‘ دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کے دن تھے‘ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ اور یہاں لائن سے بنگلے قطاروں میں بنے ہوئے تھے‘ اس وقت یہاں لوگوں کی چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی۔

میں نے ذہن میں عرفان رسول کے بنگلے کا نمبر دہرایا اور کار کی رفتار سلو کر لی‘ میں بنگلوں کے باہر نصب نیم پلیٹ پڑھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا‘ عرفان رسول کا بنگلہ اس لائن کے بالکل آخر میں تھا‘ اس کے سامنے کی جانب ایک چوڑی سڑک بنی تھی اور سڑک کے دوسری جانب بھی بنگلے تھے‘ میں نے کار کو گھمایا اور کنیز کو بتایا کہ یہی ہمارا مطلوبہ بنگلہ ہے‘ میں چوڑی روڈ سے گھوم کر بنگلے کے پچھلی جانب گیا‘ یہاں ایک پلاٹ خالی تھا اور اس کی صرف چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ خالی پلاٹ دیکھ کر میں خاصا مطمئن ہوا‘ سائڈ سے عرفان رسول کے بنگلے کی باؤنڈری وال دکھائی دے رہی تھی‘ اس پر لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ بنگلے کا مین گیٹ سامنے چوڑی سڑک کی جانب تھا‘ البتہ گلی کی جانب بھی ایک چھوٹا گیٹ تھا۔

میں نے گاڑی سے ایک لمبا چکر کاٹا اور گاڑی گھما کر دوبارہ اسی روڈ پر لے آیا‘ ویسے تو مجھے بنگلے کے گیٹ کے باہر کوئی چوکیدار یا گارڈ دکھائی نہیں دیا‘ ہو سکتا ہے کہ گارڈ یا چوکیدار اندر ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی گارڈ یا چوکیدار نہ ہو۔ بہت سے لوگ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

میں نے عرفان رسول کے بنگلے سے کافی آگے جا کر کار روک لی اور کنیز سے کہا۔ ”تم ایسا کرو کہ عرفان رسول کے بنگلے کی کال بیل بجاؤ اور دیکھو کہ اندر سے کون باہر نکلتا ہے‘ جو بھی گیٹ کھولے تم کسی اور کا نام لے کر پوچھنا کہ وہ گھر پر ہیں۔ وہ یقیناً انکار کرے گا‘ پھر تم اسی فرضی نام کے شخص کا ایڈریس پوچھنا شروع کر دینا اور جتنی دیر تم وہاں رکو گی‘ اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کرنا۔۔۔ آیا اندر مزید گارڈ تو موجود نہیں ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے‘ تم فکر نہ کرو میں اپنا کام بہت خوش اسلوبی سے انجام دوں گی۔“ کنیز نے کہا اور کار سے اتر کر پیچھے عرفان رسول کے بنگلے کی جانب چل دی‘ میں بیک مرر میں کنیز کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ کنیز جو اس وقت جا رہی تھی وہ کوئی اور ہی کنیز تھی۔ اس کی چال بہت بے باک تھی‘ اس کی ٹائٹ جینز اور کھلے گلے کی چھوٹی سی ٹی شرٹ نے اسے ایسا بنا دیا تھا کہ کوئی بھی مرد ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دوبارہ اس کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو جائے۔ اور بدنظر لوگوں کی تو نگاہوں کا محور ہی بن جائے۔ اس نے بڑی بے باکی کے ساتھ ایک ٹانگ اٹھا کر باہر بنی ہوئی کیاری کی منڈیر پر رکھی ایک ہاتھ کمر پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے کال بیل کا برقی بٹن پش کیا۔

ذرا ہی دیر بعد گیٹ کھلا اور ایک شخص باہر آیا۔ شکل سے وہ مجھے کوئی ملازم ہی دکھائی دے رہا تھا۔

کنیز اس سے باتیں کرنے لگی‘ وہ شخص بڑی ندیدی نگاہوں سے کنیز کی جانب دیکھ رہا تھا‘ کنیز نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھا اور اس سے کچھ کہا تو وہ کنیز کو اندر آنے کا اشارہ کرنے لگا‘ میں کنیز کی اس ہوشیاری پر حیران رہ

گیا کہ اس نے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو بنگلے کے اندر داخل کر لیا۔

گیٹ ایک بار پھر بند ہو گیا اب میں سوائے کنیز کے انتظار کے اور کیا کر سکتا تھا' تقریباً سات آٹھ منٹ کے بعد کنیز باہر آئی اور اٹھلا اٹھلا کر دوسری جانب چل دی' وہ شخص گیٹ پر کھڑا کنیز کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا' پھر گیٹ بند کر کے اندر چلا گیا تو کنیز تیز تیز قدموں سے کار کی جانب آئی اور بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اب جلدی سے یہاں سے چلو... کام بن گیا ہے' ابھی بتاتی ہوں۔" اس نے تیز چل کر آنے کی وجہ سے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا تو میں پہلے سے ہی اسٹارٹ گاڑی کے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

اس علاقے سے گاڑی نکال لانے کے بعد میں نے کار کی رفتار نارمل کر دی' اتنی دیر میں کنیز بھی ریلیکس ہو چکی تھی۔ وہ بولی۔

"میں نے بیل بجائی تو ایک ملازم باہر نکلا تو میں نے اس سے پوچھا کہ شبیر صاحب گھر پر ہیں' ان سے کہنا کہ چندا آئی ہے' انہوں نے مجھے ایک ضروری کام سے بلوایا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ہلکے سے آنکھ ماردی۔ میرے اس انداز کو دیکھ کر وہ بوکھلا گیا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

"ش ش... شبیر صاحب... لے... لیکن وہ یہاں نہیں رہتے... آپ غلط گھر پر آ گئی ہیں۔"

اس کی نگاہیں میرے کھلے گریبان میں الجھ رہی تھیں۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی لرزش کو بھی بھانپ لیا۔ اس لیے ایک قدم آگے بڑھا کر مزید اس کے قریب ہوئی اور اپنی آنکھیں بند کر کے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"اوہ گاڈ! اب میں انہیں کہاں تلاش کروں... کیا واقعی یہ شبیر صاحب کا بنگلہ نہیں ہے۔"

"جی... جی ہاں... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ شبیر صاحب کا بنگلہ نہیں ہے... انہوں نے آپ کو کیا نمبر بتایا تھا۔" اس نے مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے یہی تو مجھ سے بھول ہو گئی کہ میں نے ان سے بنگلے کا نمبر نہیں پوچھا انہوں نے بس اتنا بتایا تھا کہ لائن کا آخری بنگلہ ان کا ہے اور باہر کیاری میں گلاب کے ڈھیر سارے پودے لگے ہیں۔ میں سمجھی کہ یہی بنگلہ ہے۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔

"یہاں تو سب گھروں کے باہر کیاریوں میں گلاب لگے ہوئے ہیں۔ یہ تو کوئی نشانی نہ ہوئی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا یہاں کون رہتا ہے...؟" میں نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو جی عرفان رسول صاحب کا بنگلہ ہے" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"اچھا اچھا وہ عرفان رسول صاحب... انہیں تو میں جانتی ہوں۔ کیا ان کی بیگم اندر ہیں؟" میں نے خوش ہونے کی اداکاری کی۔

"نہیں جی وہ تو نہیں ہیں۔ اپنی بیٹی کے اسکول کے داخلے کے لیے گئی ہیں۔ صاحب بھی نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔

"اچھا...!" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "شبیر صاحب کا گھر تو ملا نہیں' دھوپ میں گھوم گھوم کر خواری ہو گئی۔ اب میں اپنے گھر واپس چلتی ہوں۔" میں نے ایک قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔

"پیاس سے حلق خشک ہو رہا ہے' ایک گلاس پانی ملے گا۔"

❁...❁...❁

"ہاں ہاں جی... ابھی لو ٹھنڈا پانی۔" اس نے خوش ہو کر کہا اور پلٹنے لگا تو میں نے کہا۔

"سنیے جی... کیا باہر فقیروں کی طرح کھڑے کھڑے پانی پلائیں گے۔ میں اندر آ کر پانی پی لوں...!"

"اوہ معاف کرنا جی... آپ آؤ اندر آ جاؤ...!" اس نے گیٹ کھول کر مجھے اندر بلایا تو میں گیٹ کے نزدیک کھڑی ہو گئی۔ اور وہ چھوٹا سا لان عبور کر کے اندر چلا گیا۔ میں نے جتنی دیر میں وہ پانی لے کر آتا اتنی دیر میں سارا جائزہ لے لیا۔ وہاں نہ تو کوئی چوکیدار تھا اور نہ ہی کوئی گارڈ... میں اسی جگہ کھڑی رہی جہاں وہ مجھے چھوڑ کر گیا تھا۔

دو منٹ میں ہی وہ ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے آیا اور بوتل سے پانی انڈیل کر گلاس میری جانب بڑھایا' میں نے گلاس تھامتے ہوئے اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں سے ٹچ کر دیں تو وہ دانت نکال کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے غٹ غٹ کر کے ایک ہی سانس میں سارا گلاس خالی کر کے دوبارہ خالی گلاس اس کی جانب بڑھایا اور پانی مانگا۔ دوسرا گلاس ہاتھ میں لے کر میں بولی۔

"آپ یہاں ملازم ہیں...؟"

"ہاں جی!" اس نے دانت نکالے۔

"واقعی...!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں جی' میں ملازم ہوں۔ کیا آپ مجھے صاحب سمجھ رہی ہیں۔" اس نے ایک بار پھر دانت نکالے۔

"تم حقیقت میں صاحب ہی لگتے ہو... ملازم نہیں۔ اتنے خوب صورت جو ہو..." میں نے خمار آلود نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا...

"اپنی اپنی قسمت ہے جی... ورنہ میری ماں تو...!"

"تم اکیلے ملازم ہو یا اور بھی ہیں... میرا مطلب ہے کہ اگر تم اکیلے ہو تو سارا کام تمہیں ہی کرنا پڑتا ہو گا۔ بہت تھک جاتے ہو گے... بیوی خدمت کرتی ہو گی..." میں نے پانی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس کے لیے افسوس کا اظہار کیا۔

"نہیں جی میں اکیلے تو سارا کام نہیں کرتا... پروین آتی ہے ناں... میں تو بس باہر سے سودا سلف لاتا ہوں... گیٹ کا خیال رکھتا ہوں اور رات کو بھی ادھر ہی ہوتا ہوں" اس نے جلدی سے کہا۔

"شکر ہے...!" میں نے گلاس خالی کر کے اس کی جانب بڑھاتے ہوئے دوبارہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ ٹچ کر دیا' جواب میں اس نے پھر دانتوں کی نمائش کر دی۔ "ورنہ مجھے تمہارے لیے بہت افسوس ہوتا... ویسے مجھے تم بہت ہی اچھے لگے ہو... تمہارے جیسے حسین آدمی کے لیے یہ نوکری نہیں ہے' میں تمہارے لیے کوئی دوسری اچھی نوکری تلاش کروں گی اور پھر تمہیں بتاؤں گی... کیا نام بتایا تھا تم نے...!" میں نے میٹھے لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ جی... میرا نام رشید ہے جی... آپ دوبارہ ضرور آنا میں انتظار کروں گا۔" اس احمق نے انتہائی ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں ایک دو دن میں ادھر دوبارہ آؤں گی تو تمہیں بتاؤں گی... پانی پلانے کا شکریہ... تم بہت اچھے ہو۔" میں نے کہا اور لہراتی اور بل کھاتی ہوئی باہر نکل آئی۔"

"گڈ...!" میں نے خوش ہو کر تحسین آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "تم نے تو واقعی کمال کر دیا' ساری معلومات لے آئیں... اور اس احمق آدمی نے

تمہیں ساری انفارمیشن دے بھی دیں۔"
"یہ چھوٹے لوگ ہوتے ہیں ناں ملازم ٹائپ انہیں لوگوں سے اس طرح کی تعریف سننے کے لیے نہیں ملتی اور اگر کوئی ان سے اس طرح سے بات کرے تو یہ بہت جلد بے وقوف بن جاتے ہیں۔ خیر چھوڑو تم اس قصے کو اب بتاؤ کیا کرنا ہے اور کس طرح سے کرنا ہے۔ کیونکہ یہ تو پتا چل گیا ہے کہ رشید کے علاوہ اور کوئی دوسرا بندہ وہاں رات میں موجود نہیں ہوتا' یا پھر رات میں عرفان رسول ہوتا ہوگا۔ . یوں سمجھ لو کہ رات میں اس گھر میں عرفان رسول اس کی بیوی اور بچی کے علاوہ رشید نامی یہ شخص ہوتا ہوگا یا پھر زیادہ سے زیادہ ملازمہ پروین ہوتی ہوگی .. یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کام کاج کر کے اپنے گھر چلی جاتی ہو۔" میں نے کہا۔
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کام کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔" کنیز نے کہا۔
اور ہم کلفٹن نواب کی کوٹھی میں واپس آ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھایا . ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے' تب ہی نواب کی کال میرے سیل فون پر آ گئی .. اس نے مجھے اور کنیز کو بلوایا تھا' میں اور کنیز فوراً ہی اٹھ کر چل دیئے۔ ہم اس کے کمرے کی جانب جا رہے تھے کہ ہمیں وہ سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا' اس کے پیچھے اس کا محافظ گارڈ تھا' ہم رک گئے تو نواب نے قریب آ کر پوچھا۔
"ہاں بھئی تم لوگ تیار ہو ..آج رات ہی کام ہو جائے گا۔"
"جی سر... !ہم ابھی تھوڑی دیر قبل اس کے بنگلے کا چکر لگا کر دیکھ کر آئے ہیں اور کنیز نے ساری معلومات بھی کر لی ہیں۔" میں نے تابعدار غلام کی طرح سر جھکا کر جواب دیا۔
"مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ میں ذرا جا رہا ہوں . ہوسکتا ہے کہ رات گئے واپسی ہو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رات میں بھی واپسی نہ ہو' بہرحال تم سے ملاقات اب کل صبح ہی ہوگی۔ میں تمہارے منہ سے صرف کامیابی کی خوش خبری سننا چاہتا ہوں اور ہاں کنیز تم سے قزلباش رابطے میں رہے گا . تم رات ہی کو کام ختم کر کے واپس چلی جانا . ادھر دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" نواب نے کنیز کو مخاطب کر کے کہا تو اس نے سر جھکا کر "اوکے" کہا۔
"ابھی کیمرہ تمہیں مل جائے گا . کوئی اور بات .. !" نواب نے چلتے چلتے کہا۔
"نو سر . ایوری تھنگ اوکے!" میں نے کہا تو نواب تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ باہر اس کا باڈی گارڈ دستہ اور ایک پولیس کی موبائل ہر وقت موجود رہتی تھی۔ کوٹھی کے اندر اس کی بلٹ پروف لینڈ کروزر تیار کھڑی تھی۔ نواب کے گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ حرکت میں آ گئی۔ اور وہ چلا گیا.... مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس لیے گیا ہے۔
ہم اپنے روم میں پہنچے تو ایک نیو ڈبہ پیک ڈیجیٹل کیمرہ میز پر رکھا تھا' جو میری غیر موجودگی میں کوئی رکھ کر گیا تھا۔
میں نے ڈبہ اٹھا کر پیکنگ سے باہر نکالا اور اس کا فنکشن اچھی طرح سمجھا . اور پھر کنیز کی ایک دو تصویریں لے کر ڈیلیٹ کر دیں۔
ہم نے پروگرام ڈسکس کیا' میں نے کنیز کو ہر بات سمجھا دی کہ اسے کیا اور کس وقت کرنا ہے' اس نے اپنی ذمہ داری اچھی طرح سے سمجھ لی۔
"شہروز کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم عرفان رسول کے گھر پہنچ جائیں اور وہ گھر پر نہ ملے تو پھر ہماری تو ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔" کنیز نے اچانک کہا۔

"اس کا بہت آسان ساحل ہے' ہم رات آٹھ بجے سے اس کے گھر سے دور ایسی جگہ پر موجود رہیں گے جہاں سے اس کے بنگلے پر نظر رکھ سکیں . وہ گھر واپس آئے گا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا !" میں نے کہا۔
"اور اگر ہم نے اسے واپس آتے ہوئے نہ دیکھا تو ہم کیا سمجھیں کہ وہ آج رات گھر ہی واپس نہیں آیا یا پھر ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہ گھر واپس آ چکا ہے۔" کنیز نے بڑی عقل مندی کی بات کی اور میں نے اسے سراہا اور کہا۔
"میرا خیال ہے کہ اس کے گھر کی نگرانی والا آئیڈیا ڈراپ کرتے ہیں اور اس کے بنگلے کا فون نمبر معلوم کر کے کال کرتے ہیں۔ عرفان رسول کی آواز سن کر لائن کاٹ دیں گے۔" میں نے کہا۔
"ایسا بھی کر سکتے ہیں۔" کنیز نے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ آغا کو فون کر کے کہو کہ تمہیں عرفان رسول کے گھر کا نمبر چاہیے۔ وہ تمہیں نمبر حاصل کر کے دے دے گا۔"
میرے پاس آغا قزلباش کا وہ نمبر موجود تھا جو اس نے مجھے خصوصی رابطے کے لیے دیا تھا۔ میں نے فون کیا تو وہ میرا نمبر پہچان کر سمجھ گیا کہ میرا فون ہے بولا۔
"ہاں شہروز بولو ..خیریت ہے"
"مجھے عرفان رسول کے گھر کا فون نمبر چاہیے کیا آپ معلوم کروا سکتے ہیں.. ؟" میں نے کچھ بھی کہے بنا سوال کر دیا۔
"ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے پاس ایس ایم ایس آ جائے گا۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔
اور واقعی اگلے دس منٹ کے بعد عرفان رسول کا نہ صرف گھر کا نمبر بلکہ اس کے ذاتی سیل فون کا نمبر بھی بذریعہ ایس ایم ایس میرے موبائل پر موجود تھا۔
اب میں مطمئن تھا . شام کو کنیز نے مجھ سے پھر دل لگی کی باتیں شروع کر دیں' تب میں نے اسے بتایا کہ وہ مجھ سے کسی بھی قسم کی توقع نہ رکھے . میری زندگی میں عورت کی گنجائش ہی نہیں ہے' میں تو صرف ایک عورت کو وقتی تسکین کی ضرورت سمجھتا ہوں یہ پیار محبت عشق میری لغت میں نہیں ہے۔
میری بات سن کر وہ خاموش ہوگئی اور بولی۔ "لگتا ہے محبت میں زبردست چوٹ کھائی ہے۔"
"شٹ اپ! آئی ہیٹ لو . میں نے کہا ناں کہ میری زندگی میں عورت کی اس سے زیادہ جگہ نہیں ہے۔" میں نے سخت ترش لہجے میں کہا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔
پھر ہمارے درمیان زیادہ بات چیت ہی نہیں ہوئی' ہم زیادہ تر بیٹھے ٹی وی دیکھتے رہے۔ کنیز کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میں کل سے دوبار اسے ہرٹ کر چکا ہوں۔ لیکن ایسا کرنا ضروری تھا۔ وہ زبردستی اپنی محبت مجھ پر مسلط کرنا چاہ رہی تھی..... اور اس لفظ محبت کو سن کر مجھے کچھ ہونے لگتا تھا۔
چینل گھماتے ہوئے نیوز چینل لگ گیا تو میں نے نیوز اینکر سرمئی کو دیکھا' اس کا لائیو شو آ رہا تھا۔ تب مجھے خیال آیا کہ مجھے اس سے بھی ملاقات کرنی ہے' سوچا کہ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس سے بات کروں گا۔
اتنے میں روم کا دروازہ کھلا اور راکھی کی جھلک دکھائی دی . وہ پورا دروازہ کھول کر اندر آئی اور کنیز کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"اوہو لگتا ہے تمہاری نئی دوست ہے جس کے لیے تم نے نواب صاحب سے اجازت لے لی تھی۔"
"تم غلط سمجھ رہی ہو راکھی یہ میری دوست نہیں ہے' بلکہ اسے نواب صاحب نے خود بلوایا ہے' اسے

میرے ساتھ ایک مشن پر آج رات جانا ہے......" میں نے نرمی سے کہا۔

"آئی سی......" اس نے ہونٹ سکیڑے...... "کس مشن پر......؟"

"یہ تو تم نواب صاحب ہی سے پوچھ لو۔" میں نے کہا۔

"کیوں کیا میں تمہارے ساتھ اس مشن پر نہیں جاسکتی تھی ......" اس نے کنیز کو اپنی نگاہوں کی زد میں لیے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تم نواب صاحب ہی سے پوچھ لو ...." اس مرتبہ کنیز نے جواب دیا۔

"راکھی پلیز اس وقت تم یہاں سے جاؤ ... ہم بعد میں بات کریں گے۔" میں نے ان دونوں کے درمیان جلیسی کی فضا بڑھتے ہوئے دیکھی تو راکھی سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر خود ہی کمرے سے باہر لے آیا اور غصیلے لہجے میں کہا۔

"کہیں تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو ... وہ نواب کی بندی ہے ... اگر اس نے تمہارا نام لے کر نواب سے تمہاری شکایت کردی تو تمہیں اندازہ ہے کہ وہ کیا کرے گا۔"

"پتا ہے ...!" اس نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پتا نہیں کیوں میں تمہارے قریب کسی اور عورت کو برداشت نہیں کرسکتی۔"

"پیار جو کرتی ہو مجھ سے ...!" میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ "اچھا اب تم جاؤ ..... اور ایسا ویسا کچھ مت سوچو ... میرے لیے جو راکھی ہے وہ کوئی اور نہیں سمجھیں۔"

اور وہ مطمئن وہاں سے پلٹ گئی تو میں کمرے میں واپس آ گیا۔

"کون تھیں یہ محترمہ ...؟" کنیز نے ٹی وی آف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ارے یار یہ نواب کی خاص بندی ہے۔ اسی کوٹھی میں رہتی ہے۔"

"اور تمہارے بستر پر بھی......؟" اس نے تیز نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب جو تمہارا دل چاہے وہ سمجھ لو ..." میں نے موڈ آف کر کے کہا اور آنکھیں موند کر بیڈ پر لیٹ گیا تو وہ میرے اوپر جھک آئی ... دیر تک اپنی محبت کا ثبوت پیش کرتی رہی۔ لیکن میری جانب سے کوئی پیش رفت نہ پا کر پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔

"اچھا بابا آئی ایم سوری ... اب تو اپنا موڈ ٹھیک کرلو.... اگر ایسے ہی رہو گے تو ہم کام کیا خاک کریں گے۔"

"وعدہ کرو...... اب کوئی فضول بات نہیں کروگی......" میں نے آنکھیں کھول کر کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور میں نے دوستی کرنے کے ثبوت کے طور پر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا .. مجھے احساس ہوا کہ میں پٹری سے اترنے لگا ہوں اور کنیز پر بھی بے خودی طاری ہونے لگی ہے تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور ذرا دیر کو میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

رات کو ہم نے بہت ہلکا ڈنر لیا..... ہمیں جاگنا تھا اور چاق و چوبند رہنا تھا' رات کے دو بج گئے تھے ہم نے اپنا ضروری سامان لیا اور ہم جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

باہر ایک تبدیل شدہ نمبر پلیٹ کی گاڑی تیار تھی یہ کام میں نے شام کو ہی کرلیا تھا۔ بظاہر دیکھنے میں ٹیکسی نظر آنے والی مزدا میں' میں اور کنیز سوار ہوئے اور ہم گلشن اقبال کی جانب روانہ ہوگئے۔

راستے میں ٹریفک بہت کم تھا' لیکن پھر بھی ہم نے تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کیا' نکلنے سے پہلے میں نے ایک نئی سم سے عرفان رسول کے گھر کا نمبر ملایا اور عرفان رسول سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی .. فون کسی عورت نے ریسیو کیا تھا ... وہ نیند سے جاگی تھی ... اس نے میرا نام پوچھا اور یہ بھی کہ میں کہاں سے بات کررہا ہوں .. میں نے ایک فرضی نام لے کر کہا کہ ایک ایمرجنسی ہوگئی ہے' آپ انہیں بلادیں۔ تو اس نے کہا کہ وہ سو رہے ہیں میں انہیں جگاتی ہوں' آپ ہولڈ کریں اور میرا کام بن گیا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ عرفان رسول گھر پر ہے اور سو رہا ہے اور اس شریف آدمی کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ابھی تھوڑی دیر بعد اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

فون ہولڈ کروا کر جب وہ عورت چلی گئی تو میں نے لائن کاٹ دی اور فوراً سم نکال کر اسے توڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

ہم تقریباً ڈھائی بجے رات عرفان رسول کے بنگلے کے باہر موجود تھے۔ ہم نے گیٹ کے قریب چکر لگا کر دیکھا' بنگلے کے گیٹ پر موجود گیند کی شکل میں دو لائٹیں آن تھیں۔ اندر اندھیرا تھا۔

میں گاڑی چلاتا ہوا تھوڑا آگے لے گیا اور ایک بنگلے کی دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کردیا' میں اور کنیز اپنا سامان سنبھال کر گاڑی سے اتر آئے' اس گرمی میں بھی میں نے موٹے کپڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی' باہر ہوا بالکل نہیں چل رہی تھی' اس لیے اے سی گاڑی سے باہر نکلتے ہی ہم پسینے میں نہا گئے۔

جیکٹ کی جیبوں میں میرا سامان موجود تھا' کنیز کی جینز کی بیلٹ میں بھی پستول تھا اور میرے پاس بھی پستول موجود تھا۔ بے ہوشی کی دوا .. باریک نائیلون کی ڈوری ... اور کیمرہ ...!

میں اور کنیز بنگلے کی پچھلی دیوار کی جانب گئے' میں اور کنیز پہلے خالی پلاٹ کی چاردیواری کے اندر کودے' ابھی کنیز دیوار پر ہی موجود تھی کہ ہمیں رات کو گلیوں میں گشت کرنے والے چوکیدار کی سیٹی اور اس کی سائیکل کی آواز سنائی دی۔

"کنیز جلدی اندر کودو ...!" میں نے تیز سرگوشی میں کہا تو کنیز تیزی سے اندر کود گئی .. اور اس طرح کودنے سے ایک زور کی آواز پیدا ہوئی اور اس کے منہ سے تیز سسکی نکل گئی' اتنے میں شاید چوکیدار نے کنیز کے کودنے کی دھپ کی آواز کو سن لیا' رات کے سناٹے میں وہ آواز بہتر طریقے سے سنی گئی۔

چوکیدار خالی پلاٹ کے گیٹ کے قریب آ کر کھڑا ہوگیا اور ٹارچ کی روشنی گیٹ پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"اوئے کون کودا اے ادر...... خانہ خراب چور کا بچہ... ابی تم باہر نکل .. ام ابی دیکھتی اے ...!"

میں اور کنیز دم سادھے خاموش تھے۔ کنیز زمین پر گری ہوئی تھی اور میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو جھکا ہی رہا ... کہ اب مزید ذرا سی بھی آواز اس کے شک کو یقین میں بدل دے گی۔

"اوے خانہ خراب کا بچہ... کون اے... باہر نکلو ...." پٹھان چوکیدار باہر کھڑا ہمیں للکار رہا تھا۔

کنیز نے گھبرا کر میرا ہاتھ دبایا تو میں نے جواباً تسلی کے لیے اس کا ہاتھ دبایا۔

"بی ادر کوئی آواز نہیں آتا اے ... پر ابی ام اپنا تسلی ضرور کرے گی..... خوچہ کوئی اور ہوا ... اور رات کو چوری موری کیا تو ام اپنے رب کو کیا منہ دکھائے گی... !" پٹھان چوکیدار نے کہا اور پھر ہمیں ایسا لگا جیسے وہ گیٹ پر چڑھ رہا ہے... !

(باقی آئندہ ماہ)

⌘

آفت رسیدہ

جناب عمران احمد'
السلام علیکم!
زیرنظر کہانی کا تعلق ہمارے سابقہ مشرقی پاکستان سے ہے۔ میں اس کے بارے میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ یہ کہانی محسوس کی جانے والی ہے۔ امید ہے قارئین کو کہانی ضرور پسند آئے گی۔

والسلام
محمد سلیم اختر
راولپنڈی

شمس الدین اپنے آبائی پیشے کے لحاظ سے درزی تھے اور اسی اعتبار سے علاقے میں خلیفہ کی عرفیت سے مشہور تھے۔ بکرم پور میں واقع "اریل بیل" کے نشیبی علاقے میں ان کا گاؤں "گادی گھاٹ" سیلاب کے دنوں میں ایسا لگتا جیسے کالے پانیوں میں گھرا کوئی جزیرہ۔ اس گاؤں میں جزیروں پر بہت سی بستیاں آباد تھیں۔ بستی کے عام قاعدے قانون کے مطابق ان کا گھر بھی آدھا زمین پر اور آدھا پانی پر تھا۔ پانی کے حصے میں گڑے ہوئے موٹے موٹے کھمبوں پر گھر کا توازن قائم تھا۔ آمدورفت کے لیے ان کی چھوٹی سی کشتی جس جگہ بندھی رہتی تھی' اس کے ایک طرف گئوشالہ اور دوسری طرف کافی اونچا چار کھمبوں پر ایستادہ بیت الخلاء تھا۔ لکڑی کے تختوں سے بنے گھر سے پانی اس قدر قریب تھا کہ بچے عموماً گھر میں بیٹھے بیٹھے ہی بنسی کے ذریعے مچھلی پکڑا کرتے تھے۔

قریبی ٹیلے کی مسجد سے ہر صبح کی اذان کے ساتھ ہی وہ بیدار ہوجاتے۔ اسکولوں میں پڑھنے والے بچے اپنی کتابوں کی طرف رجوع کرتے۔ جوان چپو سنبھال کر اپنی اپنی کشتیاں کھول لیتے اور مختلف سمتوں میں پھیل جاتے۔ جہاں جہاں گزشتہ شام کے بعد مچھلیاں پھنسانے کے لیے پاڑ جال تان کر آئے ہوئے تھے' مسجد کا رخ تو ادھیڑ اور بوڑھے لوگ ہی کیا کرتے تھے۔

❁......☆......❁
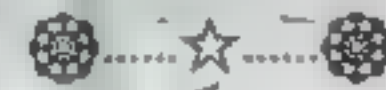
آج مسجد میں نمازی کم تھے۔ امام صاحب کو معلوم تھا کہ گزشتہ کل چھ سات آدمی موٹر لانچ میں بیٹھ کر کسی کام سے ڈھاکہ گئے تھے۔ وہ صبح صادق میں اندازہ نہیں کرسکے کہ بستی کے موجودہ لوگوں میں سے کون نماز پڑھنے آیا اور کون نہیں۔ نمازیوں میں آٹھ دس آدمی تھے نماز کے بعد جب انہوں نے ایک دوسرے کو غصے سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ مسجد میں حاضر نہیں ہیں۔ ان کے پکے نمازی ہونے کے سبب ان کی غیر موجودگی فوراً محسوس کرلی گئی اور سب ہی نے ایک زبان ہوکر کہا۔

"کیا بات ہے آج خلیفہ نہیں آئے؟"

شکور میاں نے جیسے خلیفہ کی وکالت کی۔

"ارے بھائی! وہ کیسے آئیں گے' ان کی تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی ہے۔"

جب بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی تو امام صاحب نے کہا۔ "جب کسی کی دنیا اندھیر ہونے لگے تو روشنی اللہ کے گھر ہی سے ملتی ہے نہ کہ بستر پر پڑے رہنے سے' آخر انہیں ہوا کیا ہے؟" ان کے اس جملے کے بعد متفقہ فیصلہ یہ ہوا کہ چل کر انہیں دیکھ لیا جائے۔

ڈونگی والے اپنی اپنی ڈونگیوں پر سوار ہوئے اور مٹی کی ناند والے اپنی اپنی ناند میں بیٹھ کر دھیرے دھیرے خلیفہ کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ خلیفہ کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ ان کی بیوی اور بڑی بیٹی دل رُبا ان کا سر دبانے میں مصروف تھیں۔ مسجد سے آئے ہوئے لوگ سب ہی اپنے تھے پھر اس بستی میں کسی کا کسی سے پردہ نہیں تھا لیکن امام صاحب کو دیکھ کر ماں بیٹی جز بز ہوگئیں کیونکہ عام طور پر امام صاحب سے تمام عورتیں پردہ کیا کرتی تھیں چنانچہ امام صاحب خود ہی آنگن میں ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ ذرا سی دیر بعد تمام لوگوں کو اندر بلا لیا گیا۔ خلیفہ کے چاروں طرف جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ خلیفہ نے کراہتے ہوئے باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھا اور جو آدمی ان کے زیادہ قریب بیٹھا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

"بھائی لوگو! میری بخشش کے لیے دعا کیجیے گا۔ آج میں جماعت میں شریک نہ ہوسکا۔" اتنا کہہ کر انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ تب ہی شکور میاں جن کا گھر ان کے گھر سے متصل تھا۔ اپنی تسبیح چوم کر جیب میں رکھتے ہوئے بولے۔

"آپ لوگ جانتے ہیں ان کا ہونے والا داماد ایک ہفتے کے اندر دبئی جا کر واپس آگیا۔"

"ایں... یہ کیسے بابا؟"

"اس کا پاسپورٹ اور ویزا جعلی ثابت ہوا اور اب وہ بے چارا زیرِ حراست ہے۔" یہ سن کر سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ دبئی گیا بھی تھا۔"

ان نمازیوں میں سے ایک بولا۔

شکور میاں نے وضاحت کی۔ "رات ہی کو نور محمد کا بڑا بھائی یہ خبر دے گیا ہے کہ اسے دبئی پولیس نے حراست میں لے کر ہماری حکومت کی تحویل میں دے دیا ہے اور اب اس پر مقدمہ چلے گا اور سزا کے ساتھ جرمانہ بھی بھرنا پڑے گا۔" تمام نمازی یہ سن کر خاموش اور پریشان سے ہوگئے اور خلیفہ کو تسلی دینے لگے۔

❁......☆......❁

گزشتہ چھ ماہ سے دلربا کی شادی کے سلسلے میں جو بات چیت چل رہی تھی اس کی تفصیل ان سب کو معلوم تھی۔ اس گاؤں کا پہلا آدمی جس دن عربی درہم کما کر واپس آیا تھا اس کے بعد سے ملازمت کے لیے عرب ممالک جانے کی ایک ہوا چل پڑی تھی اور رفتہ رفتہ یہ "ہوا" اتنی شدت اختیار کرگئی کہ ہر لڑکی کے باپ پر ہونے والے داماد کے لیے عرب جانے کا خرچ مہیا کرنا لازمی ہوگیا کیونکہ لڑکیوں کی تعداد شاپلہ پھولوں کی طرح بڑھ رہی تھی اور کیلے کے پودوں کی مانند ان کی بڑھتی ہوئی اٹھان دیکھ کر ہر باپ زمانے کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ ورنہ لڑکی کی عمر جہاں بیس سال سے زیادہ ہوئی گویا اس کی شادی کا پھول ایک دم سے مرجھا گیا۔

دلربا ایسا ہی ایک پھول تھی جس پر کسی بھی وقت مرجھانے کا الزام عائد ہوسکتا تھا۔ جب ہی تو خلیفہ نے اپنے محدود وسائل کے باوجود چار تولے سونا' دو سنگر مشینیں اور ایک بے گھر زمین فروخت کردی۔ اسّی ہزار ٹاکا فراہم کرنے کے لیے بقیہ

رقم کا انتظام قرض اور سود کے ذریعے ہوا اور صرف ایجاب و قبول کے بعد پوری رقم لڑکے کے حوالے کردی گئی۔

خلیفہ کو پچھم جانب کے لوگوں اور پچھم کی زمین سے بڑی عقیدت تھی۔ پچھم سے متعلق جب بھی کسی واقعے کا تذکرہ سنتے' بڑے احترام سے متوجہ ہوجاتے مگر اس اسّی ہزار رقم کی فراہمی کی دل خراش کوششوں کے بعد اس احترام میں کچھ فرق سا آنے لگا تھا۔ جہیز کی لعنت پر کہاں بیس ہزار کی طلب اور دبئی جانے کے لیے کہاں اسّی ہزار کا خرچہ۔ لڑکیوں کی زندگی برباد نہ ہوں تو اور کیا ہوگا۔ انہوں نے گزشتہ رات جب سے یہ خبر سنی تھی' صدمے سے نڈھال ہوکر اپنے آپ میں نہیں تھے۔ انہیں صرف یہی صدمہ نہیں تھا بلکہ اپنی لڑکی اور خاندان کا مستقبل بھی بھیانک نظر آرہا تھا کیونکہ جو رقم سود قرضے پر لی گئی تھی اس کے عوض رہائشی گھر گروی رکھا گیا تھا۔

شدید بخار کے عالم میں وہ مہمانوں کی خاطر تواضع کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اتنے میں اندر سے مرمرے کے لڈو اور چائے آگئی۔ ایک نمازی ساتھی نے اس چائے کا قدرے بُرا مناتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

''خالہ جان! اس ناگہانی آفت میں آپ کو کیا سوجھ رہا ہے' ہم لوگ ابھی چائے وائے نہیں پئیں گے۔'' خلیفہ کی بیوی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اس نے بڑی دل دوز آواز میں کہا۔

''ہم جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہمارا نہیں' لڑکی تو پنچ کی ہوتی ہے۔ آپ لوگ چائے پئیں' خود بھی سوچیں اور ہمیں بھی حوصلہ دیں کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔ ہماری اندرونی حالت تو آپ لوگوں کو بھی معلوم ہے۔'' اتنا کہنے کے بعد اس کی آواز رندھ گئی اور خلیفہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

ان کا ہونے والا داماد کسی ہاتھ پیٹ تھے مگر اسے کا فرو نہیں تھا۔ وہ بھی خلیفہ ہی کی طرح درزی تھا۔ وہی درہم کی آمد کی چکا چوند اور اس سے پیدا شدہ اثرات سے کئی گھرانوں کی زندگی متاثر ہوئی تھی لیکن خلیفہ کے داماد کے ساتھ جو حادثہ ہوا' ایسا حادثہ گاؤں والوں کے لیے پہلا تجربہ تھا۔ اس سے سب لوگ چوکنا ہوگئے۔ خلیفہ کی بے چارگی کو دیکھتے ہوئے کچھ لوگ آگے بڑھے اور کوشش کرکے جس سے جو ہوسکا' خلیفہ کے داماد اخلاق احمد کو ضمانت پر رہا کرالائے۔ جن لوگوں کی مدد سے ویزا جعلی ثابت ہوا تھا ان میں سے کسی ایک کا بھی پتہ نہ چل سکا۔ بالآخر چھ ماہ کی مقدمہ بازی کے بعد اخلاق احمد کو ایک ماہ کی سزا ہوئی اور چار ہزار کا جرمانہ بھی عائد ہوا۔ جرمانے کی رقم تو چندہ اکٹھا کرکے ادا کردی گئی۔ بہرحال سزا اخلاق احمد کو کاٹنی ہی پڑی۔ اسے جیل پہنچ کر معلوم ہوا کہ جیسے بہت سارے لوگ سزا کاٹ رہے ہیں اور تقریباً ہر ایک کہانی ایک جیسی ہی ہے۔

❁ ☆ ❁

شرعی طور پر اخلاق احمد اور دلربا کا نکاح ابھی تک نہیں ہوا تھا مگر صورت حال کے پیش نظر طرفین کا غم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گیا۔ دونوں طرف کے لوگ معاشی طور پر اس قدر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے تھے کہ اب ان کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ یہ سوال اب سوال ہی نہیں رہا تھا بلکہ انہیں اپنے وجود پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ ایسے میں حاجی محمود صاحب نے اپنی ذمہ داری شدت سے محسوس کی۔ انہوں نے اپنے طور پر اخلاق احمد کو بلوایا۔ اس کی خاطر تواضع کی اور رسمی باتوں کے بعد اس سے پوچھا۔

''اب آئندہ کے لیے کیا خیال ہے؟'' اخلاق احمد کافی دیر خاموش رہا اور پھر بولا۔

''چچا جان! ہم لوگ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوچکے ہیں۔ اب ہمارے پاس ایسی کوئی سبیل ہی باقی نہیں رہی جس کے بل بوتے پر آگے بڑھا جاسکے۔ اب ہمارا سوائے اللہ کی ذات کے کوئی سہارا اور مددگار نہیں۔''

حاجی صاحب نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ غلط نہج پر سوچ رہے ہو کہ اللہ صرف دکھ کا ساتھی ہے اور سکھ کا نہیں۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ مصیبت ہی کے وقت اللہ شدت سے یاد آتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی مصیبتیں دور کرے' میری مانو تو اللہ کا نام لے کر دلہن کو اپنے گھر لے جاؤ۔ کون جانے کس کی قسمت سے کس کا در کھلتا ہے اور پھر ویسے بھی تم ماشاء اللہ ہنر مند ہو۔''

حاجی صاحب نے اسی دن خلیفہ سے گفتگو کی۔ انہیں کوئی اعتراض تو نہیں تھا البتہ وہ ذہنی اور مالی طور پر ابھی ایسی کسی تقریب کے لیے قطعی تیار نہ تھے۔ آخر کار حاجی صاحب نے اپنی دوستی' زمانے کی نزاکتیں اور دلربا کی گزرتی ہوئی عمر کو سامنے رکھا اور یقین دہانی کرائی کہ حسب ضرورت اور سادہ طریقے سے لڑکی رخصت کرانے کا بندوبست وہ خود کریں گے۔ اسی طرح اخلاق احمد کے بڑے بھائی کو بھی کچھ رقم بطور امداد دے کر راضی کرلیا کہ وہ دولہا سجا کر بارات لے آئیں۔

❁ ☆ ❁
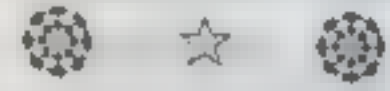
بیساکھ کا مہینہ تھا۔ بستی اور گاؤں کے چاروں طرف ساون کے مہینے میں صرف پانی ہی پانی تھا۔ وہاں بورو دھان کی فصل کٹ چکنے کے بعد اب اری دھان کی فصل تیزی سے کٹ رہی تھی اور غلہ کھیت سے کھلیان اور کھلیان سے گھر کی جانب تیزی سے منتقل ہو رہا تھا۔ ہر طرف کسان' مزدور اور باربرداریوں کے گھوڑوں کی ریل پیل تھی۔ اس سال ژالہ باری نہ ہونے کے سبب اناج محفوظ تھا تو سارے لوگوں کے چہروں پر خوشی کی لہر بھی دوڑ رہی تھی اور یہ بھی اتفاق ہی کی بات تھی کہ اس بار کال بیساکھی نے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ ' کچھ نہیں ہونے کے باوجود سب کچھ ہوا۔ حاجی صاحب نے بالا بالا ہی ایسا انتظام کیا کہ صاحب استطاعت لوگ اس نیک کام میں شریک بھی ہوئے اور خلیفہ کی آبرو بھی برقرار رہی۔ خلیفہ کو پتا ہی نہ چل سکا کہ چاول کس نے دیئے' گوشت' مچھلی کا انتظام کس نے کیا۔ ایندھن کہاں سے آیا اور دلہن کے آرائشی سامان کی فراہمی کیسے ممکن ہوئی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے صرف یہ دیکھا کہ سلامی میں کون کیا دے رہا ہے۔ ایک آدمی بلند آواز میں کہے جا رہا تھا اور دوسرا کاغذ پر لکھے جا رہا تھا۔

شیخ جبین دس ٹاکا... فلاں بیس ٹاکا وغیرہ۔

❁ ☆ ❁
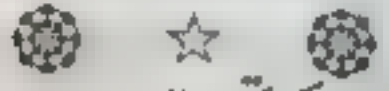
رات دم توڑ چکی تھی' قریب ہی سے لومڑیوں کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ تیرھویں کا چاند مغرب کی جانب اتر چکا تھا۔ اس کی دودھیا روشنی میں پورا علاقہ منور ہو رہا تھا۔ ایسے میں چار کہاروں نے مل کر بیچ آنگن سے پالکی اٹھانے کا

اعلان کیا۔ اس اعلان کی زبان وہ لوک گیت تھے جو برس ہا برس سے گائے جا رہے تھے۔ ان گیت میں بابل کی وہ کہانی پروئی ہوئی تھی جسے سن کر نوجوان لڑکیوں کے دل دھڑکتے تھے۔ بہنوں کی رفت مچاتی تھی۔ بھائی کف افسوس ملتے تھے۔ مائیں خون کے آنسو روتی تھیں۔ باپ کلیجے پر پتھر رکھ لیتے تھے اور دلہنیں اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا غم اور پرائے لوگوں میں جانے کے اندیشوں سے نڈھال ہو جایا کرتی تھیں۔ بالکل ایسے ہی ماحول میں سب کو روتے اور بلکتے چھوڑ کر دلربا کی پالکی آنگن سے اٹھ گئی۔ جس قلی کے سر پر پیٹرومیکس تھا وہ سب سے آگے تھا۔ اس کے بعد چند باراتی اور پھر پالکی۔ پالکی کے پیچھے تین قلیوں کے سر پر جہیز کا سامان تھا۔ سب سے آخر میں کچھ لوگ اور تھے۔

❁ ☆ ❁

بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں کے درمیان پیٹرومیکس کی روشنی جوں جوں دور ہوتی گئی کہاروں کے گیت بھی دھیمے پڑتے گئے۔ خلیفہ کے آنگن کی پوربی سمت املی کے ایک بہت بڑے پیڑ کے نیچے عورتوں بچوں اور مردوں کا ہجوم تھا۔ سب کی نگاہیں باراتیوں کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ پہلے کہاروں کی آواز معدوم ہوئی پھر رفتہ رفتہ روشنی بھی اوجھل ہو گئی تو سب لوگ یوں منتشر ہو گئے جیسے کسی جنازے کی آخری رسومات ادا کر کے فارغ ہوئے ہیں۔ خلیفہ جی دنیا و مافیہا سے بے خبر مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں سب سے پہلے شکرانے کے نفل ادا کرنے تھے۔ نفل ادا کرنے کے بعد وہ تہجد بھی پڑھنے لگے اور فجر کی نماز کے بعد گھر واپس آئے تو آنگن میں شامیانے تلے کچھ قریبی مہمانوں اور بچوں کو دسترخوان پر بیٹھے دیکھا۔ انہیں دیکھ کر خلیفہ کو یاد آیا کہ انہوں نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ وہ سیدھے گھر کے اندر چلے گئے اور جاتے ہی آواز دی۔

''ارے بھئی کہاں گئیں تم سب! مجھے بھی کچھ کھانے کو دو۔'' ان کی آواز سنتے ہی حور بانو کہاں سے لپک کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ گلابی ساڑھی میں ملبوس اس کا بھرا بھرا جسم جیسے چھلکا پڑ رہا تھا۔

''جی ابا! گھر میں بیٹھیے گا یا باہر؟'' اس کا بھرپور سراپا دیکھ کر خلیفہ ایک دم سے گڑبڑا گئے اور اسے ایک ٹک چھتی اجنبی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ حور بانو نے دوبارہ کہا۔ ''ایسا کیجیے ماں جی اور آپ دونوں ایک ساتھ کھا لیجیے۔ انہوں نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔'' یہ کہہ کر وہ باورچی خانے کی طرف دوڑ گئی۔ اس کے جاتے ہی اس کی ماں آئی تو خلیفہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ارے کچھ دیکھا تم نے...؟''

''کیا...؟''

''یہ حور بانو...؟''

''کیا ہوا حور بانو کو...؟''

''یہ تو دلربا سے بھی ایک بالشت اونچی ہو گئی اور یہ بات تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتائی؟'' حور بانو پیچھے آنگن سے چاپ کرانے لگی۔ اس کی چال میں ایک نئی بات ضرور تھی۔ اس نے گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھا تو کاٹھ کا پورا گھر جیسے جھنجھنا اٹھا۔ جب وہ ایک دم قریب آ کر پلاؤ کی ڈش چوکی پر رکھ چکی اور اپنے چہرے پر آئی ہوئی آوارہ لٹوں کو پیچھے کی طرف جھٹکا دے کر باپ کی جانب دیکھا تو خود حور بانو کی نگاہوں میں اس کا باپ اجنبی لگ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے اور پھیل

گئیں۔

اتنے میں گئوشالہ کی جانب سے زور کی آواز آئی۔ جیسے کوئی ہانک لگا رہا ہو۔

''ارے خلیفہ صاحب گھر میں ہیں کہ نہیں؟''

خلیفہ نے یہ آواز واضح طور پر پہچان لی۔ یہ فیروزالدین بیوپاری تھا۔ عمر ستر برس سے اوپر تھی۔ وضع قطع سے متقی پرہیزگار لگتے تھے اور پیشانی پر نمازیوں کا سا بہت بڑا گھٹا بھی تھا۔ ان کا یہ گھٹا ان کی شخصیت کا ایک نمایاں حصہ تھا۔ اس کی بیوی فوت ہو چکی تھی اور اولاد اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ عورتوں کا رسیا تھا اور ادھر ادھر منہ مارتا رہتا تھا۔ لوگ اس سے خوف کھاتے تھے۔ خلیفہ کو بھی یہ بات معلوم تھی کہ فیروزالدین بیوپاری جب بھی اپنے کسی موکل کے یہاں خود چل کر جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ تہس نہس کر کے ہی لوٹتا ہے۔ وہ اپنے پیشے اور فن میں اتنا ماہر اور مشہور تھا کہ اس کا کوئی بھی نشانہ خطا نہیں جاتا تھا۔ اس کی دامری ہانک سے خلیفہ کا سارا وجود دہل گیا۔

خلیفہ نے اپنے آپ کو چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں محصور پایا۔ انہوں نے حور بانو کو آخری بار خوب غور سے دیکھا پھر بیوی کی طرف نظر ڈالی پھر پلاؤ کی ڈش کی جانب گھورا اور بے اختیار باہر کی جانب نکلتے چلے گئے۔ انہوں نے فیروزالدین کے قریب جا کر ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ خلیفہ انہیں اپنے ساتھ گھر کے اندر لے آئے آنگن میں چادر بچھائی اس پر انہیں بٹھایا اور بڑی عاجزی سے کہا۔

''بیوپاری صاحب! میں آپ کو دعوت نہیں دے سکا اس کے لیے شرمندہ ہوں تاہم آپ غریب کے دسترخوان پر اپنے ہاتھ دھو لیتے تو میری قسمت جاگ اٹھتی۔''

یہ سن کر فیروزالدین آگ بگولا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی فتوئی کی جیب سے تمسک کا کاغذ نکال کر خلیفہ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

''میں پلاؤ کھانے نہیں بلکہ گھر توڑنے کا فیصلہ کرنے آیا ہوں، کون سا دن مقرر کرتے ہو؟''

خلیفہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ نہ وہ اپنی بیٹی حور بانو کو پہچان رہے تھے نہ بیوی کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ فیروزالدین کے لہجے میں زہر جیسی کاٹ تھی۔ جس سے ان کا وجود پاش پاش ہو گیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس نے خلیفہ سے دلربا کا ہاتھ مانگا تھا اور خلیفہ نے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت فیروزالدین خاموش ہو گیا اور دلربا کی شادی پر خلیفہ کو قرض بھی دے دیا اور اب اس کی نظریں حور بانو پر تھیں۔ خلیفہ کے پاس اب بیوپاری کا قرض چکانے کا اور کوئی چارہ نہ تھا فیروزالدین کا اٹل ارادہ اور شیطان جیسی مسکراہٹ دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو ڈول کر رہ گئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ درہم اور ٹاکا کی برچھیاں ان کے شعوری پیکر کے چاروں طرف تیز رفتار طوفان کی طرح زناٹے کے ساتھ گردش کرنے لگی ہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو کر ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھے...... خوشیاں آہوں میں ڈھل گئیں اور ان کے گھر میں دکھوں نے ڈیرا ڈال لیا۔ خلیفہ مرحوم کی بیوہ نے جبر کی طرح حور بانو کا ہاتھ فیروزالدین کے ہاتھوں میں دینے کی کوشش کی تو اس نے زہر پھانک کر اپنی زندگی ختم کر لی۔

ستم

محترم عمران بھائی

السلام علیکم!

لوگ عموماً برائی کا جواب برائی سے نہ دینے والوں کو شریف نہیں بزدل تصور کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ غنڈہ گردی کا جواب شرافت سے دینا بزدلی نہیں بلکہ بہادری ہے۔ ایک ایسے ہی شریف نوجوان کا قصہ اس کے اندر کا غصہ ایک روز اچانک باہر آیا تھا تو دنیا دنگ رہ گئی۔

والسلام

محمد اعظم خان

بی کام کا امتحان دینے کے بعد عمران اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تھا' رنگ محل میں ان کی موتی تارے کی دکان تھی' اشرف نے ساری زندگی خوب محنت کی تھی' یہی وجہ تھی کہ اس نے جس دکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے اپنا کاروبار شروع کیا تھا' اب وہ دکان اس کی ذاتی ملکیت تھی' مگر جب سے اسے گردوں کی تکلیف رہنے لگی تھی' اس کی ہمت جواب دے گئی تھی' عمران کے آجانے سے اشرف نے سکھ کا سانس لیا تھا اور وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ اب اسے گردوں کے ڈیلیسز کروانے کے لیے دکان بند نہیں کرنا پڑے گی' اب اس کی غیر موجودگی میں اس کا اکلوتا بیٹا' عمران دکان سنبھال لیا کرے گا۔

اشرف بلڈ پریشر کا پرانا مریض تھا' بلڈ پریشر نے اس کے دونوں گردوں پر بری طرح اثر کیا تھا' شروع میں وہ مختلف ادویات استعمال کرتا رہا' لیکن جب حالت زیادہ ہی خراب رہنے لگی تو ڈاکٹروں نے اسے ڈیلیسز کروانے کا مشورہ دیا تھا' پہلے پہل اسے پندرہ دن بعد گردے واش کروانے کے لیے ہسپتال جانا پڑتا تھا' پھر رفتہ رفتہ یہ وقفہ کم ہوتا گیا اور دکان بھی بند رہنے لگی تھی' عمران کے آجانے سے اشرف کو یہ سکون ہوگیا تھا کہ اب اس کے نہ ہونے سے کاروبار متاثر نہیں ہوگا' وہ طویل عرصے تک گردوں کے مرض سے لڑتا رہا' مگر ایک روز تھک کر اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

باپ کی موت کے بعد گھر کی ذمہ داری عمران کے کندھوں پر آگئی تھی' وہ اپنی اکلوتی بہن مہوش کا اکلوتا بھائی تھا' مہوش' عمران سے عمر میں دو سال بڑی تھی' تعلیم یافتہ اور خوب صورت تھی' مگر باپ کی طویل علالت کے باعث کاروبار نہ ہونے کی وجہ سے مناسب رشتے کے انتظار میں گھر بیٹھی تھی۔ عمران نے اپنی عقل وفہم سے بہت جلد کاروبار سنبھال لیا تھا مگر دکان سے ہونے والی آمدن کا بڑا حصہ باپ کی بیماری کی نذر ہو جاتا تھا' اس لیے ماں کے بار بار احساس دلانے کے باوجود وہ بہن کی شادی کے لیے کچھ نہیں کر پایا تھا۔

عمران نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یوں اچانک سب کچھ بدل جائے گا' وہ کئی روز تک گھر میں ہی بیٹھا رہا تھا' پھر اس نے ماں کے سمجھانے پر بے دلی سے دکان کھول لی' کئی دن تک بند رہنے کی وجہ سے دکان میں پڑی ہر چیز پر مٹی کی تہیں جمی دکھائی دے رہی تھیں' وہ کرسی صاف کر کے بیٹھ گیا تھا مگر کسی چیز کو بھی ہاتھ لگانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا' وہ کچھ دیر تک

اسی طرح ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھا رہا' دکان کھلی دیکھ کر آس پاس کے کچھ دکاندار اس کے پاس افسوس کے لیے آئے ہوئے تھے' اس لیے مجبوراً اٹھنا پڑا' اس نے جلدی سے ڈسٹر لے کر سامنے پڑے ہوئے بنچ صاف کر دیے تاکہ اس کے پاس آنے والے لوگ بیٹھ سکیں۔

دوپہر تک دکان دار عمران کے پاس اس کے والد کی وفات پر افسوس کے لیے آتے رہے' جب لوگوں کا آنا جانا ختم ہوا تو وہ اٹھا اور دکان کی صفائی میں لگ گیا' دکان میں مال بھی بہت کم رہ گیا تھا کیونکہ جتنی بھی سیل ہوتی تھی' اس رقم کا مزید مال آنے کی بجائے باپ کے علاج پر لگ جاتی تھی' جو کچھ پاس بچا تھا وہ بھی باپ کے فوت ہونے پر خرچ ہو گیا تھا' وہ شام تک بے دلی سے دکان پر بندھا بیٹھا رہا' پھر دکان بند کی اور گھر کے لیے نکل پڑا۔

"کیا بات ہے بیٹا' آج تم بہت تھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہو؟" فرحت نے عمران کے گھر پہنچنے پر دریافت کیا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" عمران نے ماں کے پوچھنے پر تسلی دینے کے لیے کہا۔

"آج تم کئی دن بعد دکان پر گئے تھے' شاید اس لیے ایسا محسوس ہو رہا ہو۔"

"دکان پر بھی آج سارا دن بے کار بیٹھے گزرا' کوئی گاہک ہی نہیں تھا۔"

"تم پریشان مت ہو' آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" فرحت نے بیٹے کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"جی! بس کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ بے فکر رہیں' دعا کرتی رہا کریں' وقت نے مجھ پر جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں' خدا مجھے وہ ذمہ داریاں پوری کرنے کی ہمت دے۔"

"آمین... آمین۔" فرحت نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کی باتوں کے دوران مہوش نے میز پہ کھانا لگا دیا تھا' وہ کھانا رکھ کر ان کے پاس آئی اور عمران کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "عمران بھائی آ جاؤ' کھانا کھا لو۔" پھر ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "امی آپ بھی آ جائیں۔ آپ نے تو دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔"

"کیوں امی آپ نے دوپہر کو کھانا کیوں نہیں کھایا؟" عمران نے مہوش کی بات سن کر ماں سے سوال کیا۔

"بس بیٹا بھوک نہیں تھی۔"

"چلیں آجائیں پھر تینوں مل کر کھانا کھاتے ہیں۔" عمران نے بات کی تو فرحت خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی' ان تینوں نے مل کر کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر لیٹ گئے۔

☆☆☆

اب دکان پہلے کی طرح وقت پر کھلنے اور بند ہونے لگی تھی' جن پارٹیوں کے ساتھ ادھار چلتا تھا' عمران نے ان سے کافی مال ادھار اٹھا لیا تھا' ایک بار پھر سے کام چل نکلا تھا' ان کا کام ایسا تھا کہ انہیں دکان کے لیے مال لینے کی خاطر کہیں جانا نہیں پڑتا تھا' لوگ خود ان کی دکان پر آکر مال دے جاتے تھے اور اپنی پچھلی رقم میں سے جو ادائیگی ہوتی' وہ لے جاتے تھے۔

خاوند کے ہوتے ہوئے بھی فرحت کو مہوش کی شادی کی فکر لگی رہتی تھی' اب وہ نہیں رہا تھا تو اس کی بھی کوشش تھی کہ وہ اس فرض سے جلد فارغ ہو جائے' عمران کو دن بھر دکان سے ہی فرصت نہیں ملتی

تھی' بمشکل ہفتے میں ایک دن چھٹی کا ملتا تھا' وہ بھی کچھ ہفتے بھر کی نیند پوری کرنے اور کچھ گھر کے کام کاج نمٹانے میں گزر جاتا تھا' اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی مہوش کے لیے رشتہ تلاش کرنے کے لیے وقت نکال نہیں پاتا تھا۔

چھٹی کا دن تھا' جب ایک محلے دار خاتون کسی عورت کو ساتھ لیے ان کے ہاں آئی اور فرحت کو بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے مہوش کو دیکھنے آئی ہے' جو عورت رشتے کے لیے آئی تھی' اس کا نام زاہدہ تھا' وہ شکل وصورت اور پہناوے سے کسی کھاتے پیتے گھرانے کی لگتی تھی' ان کے ہاں آنے سے پہلے ہی محلے دار خاتون نے ان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا' اس لیے اسے پوری طرح تسلی تھی' جب اس نے مہوش کو دیکھا اور فرحت سے ملاقات ہوئی تو اسے مزید اطمینان ہو گیا تھا۔ عمران کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا' ماں کے کہنے پر مہوش نے اسے موبائل پر فون کر دیا تھا اور ساتھ ہی تاکید کر دی تھی کہ وہ آتا ہوا بیکری سے کچھ چیزیں بھی لیتا آئے۔

''بہن! خیر سے کتنے بچے ہیں آپ کے؟'' فرحت نے زاہدہ سے سوال کیا۔

''میرا بیٹا ظفر ہی میری کل کائنات ہے۔'' فرحت کے پوچھنے پر زاہدہ نے جواب دیا۔

''اور ظفر کے ابو کیا کرتے ہیں؟''

''وہ تو ایک مدت ہوئی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بس یوں سمجھ لیں' ظفر کی ماں بھی میں ہوں اور باپ بھی۔'' زاہدہ نے اداس لہجے میں بات کی۔

''یہ سن کر بہت افسوس ہوا بہن۔''

''یہ سب تو اوپر والے کے کام ہیں۔ وہ جب چاہے' جس کو چاہے اپنے پاس بلا لے۔ ظفر ابھی چھوٹا ہی تھا جب میرے شوہر ایک حادثے میں فوت ہو گئے' تب سے میں نے اپنے بیٹے کو باپ بن کر پالا اور میں خدا کا جس قدر بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے کہ اس نے میری محنت' حوصلے اور صبر کا پھل ایک اچھے بیٹے کی شکل میں مجھے دیا۔ ماشاءاللہ اب وہ ایم بی اے کرنے کے بعد بینک میں ملازم ہے۔'' زاہدہ نے تفصیل سے بات کی' شوہر کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے' مگر اس نے انہیں بہنے سے روکے رکھا تھا۔

''حوصلہ کریں بہن! آپ کا مشکل وقت تو جیسے تیسے کٹ گیا' اب پریشان نہ ہوں۔'' فرحت نے زاہدہ کو حوصلہ دیا۔

''سنا ہے آپ کے خاوند بھی فوت ہو گئے ہیں؟'' زاہدہ نے رومال سے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! انہیں فوت ہوئے تو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔''

''خدا آپ کو صبر دے۔''

''آمین۔''

مہوش نے تھوڑی ہی دیر میں چائے کے ساتھ بہت سی کھانے کی اشیاء میز پر سجا دی تھیں' چائے پینے کے دوران بھی ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری رہا' چائے کے بعد زاہدہ نے مہوش کو اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی' ''آج میں بہت خوش ہوں' مجھے اپنے بیٹے کے لیے جس طرح کی بہو چاہیے تھی وہ مل گئی اور آج میری تلاش بھی ختم ہو گئی' ورنہ ظفر کے رشتے کے لیے میں کہاں کہاں نہیں گئی۔ اب خدا کرے کہ آپ لوگوں کو بھی میرا بیٹا پسند آ جائے اور جلد بات طے ہو جائے تاکہ میں اسے بیٹی بنا کر اپنے گھر لے جاؤں۔''

''خدا سب ٹھیک کرے گا۔ ان معاملات میں جلد بازی اچھی نہیں ہوتی' آپ بھی گھر جا کر تسلی سے

سوچ لیں اور مشورہ کر کے ہمیں بتا دیجئے گا' پھر ہم بھی کسی روز آ کر آپ کے بیٹے کو دیکھ لیں گے۔''

''میں نے کس سے مشورہ کرنا ہے بہن؟ دنیا میں بیٹے کے سوا میرا ہے ہی کون؟ میں جانتی ہوں' میرے فیصلے کو میرا بیٹا بھی کبھی نہیں ٹالے گا' پھر بھی میں آپ کے کہنے پر ظفر سے بات کر لوں گی اور آپ کے آنے کا پروگرام بھی پوچھ لوں گی۔'' زاہدہ نے بات کی اور ساتھ ہی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی' اسے اٹھتے دیکھ کر دیگر افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے' فرحت اور مہوش انہیں دروازے تک چھوڑنے آئیں' جب وہ چلی گئیں تو وہ دونوں اندر آ گئیں۔

اگلے ہی روز زاہدہ نے مسکراتے ہوئے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا اور اتوار کے روز انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی تھی' اتوار کو عمران کو بھی دکان پر نہیں جانا تھا' اس لیے پروگرام کے مطابق' دونوں ماں بیٹا ظفر کو دیکھنے ان کے ہاں جا پہنچے' زاہدہ نے ظفر کے متعلق جو کچھ کہا تھا' وہ ہر لفظ سچ تھا' ظفر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی اسمارٹ اور ہینڈسم تھا' انہوں نے باتوں کے دوران ہی وہیں بیٹھے مہوش اور ظفر کی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

زاہدہ کو بیٹے کے سر پر سجا سہرا دیکھنے کی جلدی تھی جبکہ عمران کو جہیز کی تیاری کے لیے وقت درکار تھا' گوکہ زاہدہ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا' ''اس کے گھر میں خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے اس لیے وہ کسی قسم کا جہیز نہیں لیں گی۔'' مگر عمران کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بہن کو اس طرح گھر سے رخصت کرے کہ اسے باپ کی کمی محسوس نہ ہو۔

دونوں گھروں میں ہی شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں' ادھر ماں بیٹی میں سے کسی کے لبوں سے کسی بھی خواہش کا اظہار ہوتا' عمران اسے پورا کرنے کے لیے دوڑ پڑتا' اس کی یہی کوشش تھی کہ کسی بھی بات سے اس کی ماں کو شوہر کی اور بہن کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے پائے' پھر باہمی مشورے سے شادی کی تاریخ طے کر لی گئی اور مہوش دلہن بن کر ظفر کے گھر چلی آئی' عمران نے جہیز سے لے کر شادی کے تمام تر انتظامات میں کوئی کمی نہیں رہنے دی تھی' یہی وجہ تھی کہ جس پارٹی سے وہ دکان کے لیے مال لیا کرتا تھا اس کی بہت سی رقم سر پر چڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

مہوش بہت خوش تھی' اسے ایسا جیون ساتھی ملا تھا جسے پانے کی ہر لڑکی کے دل میں خواہش ہوتی ہے' اسے من چاہے' من مانگے وہ سب کچھ مل گیا تھا جس نے اس کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر دی تھیں۔ شادی کے فوراً بعد ہی دعوتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا' آئے روز کہیں نہ کہیں ان کی دعوت ہوتی' کبھی مہوش کے رشتہ داروں اور کبھی ظفر کے عزیز رشتہ داروں یا دوستوں کی طرف سے انہیں کھانے پر بلایا گیا ہوتا' روز روز کی دعوتوں اور پرتکلف کھانوں کی وجہ سے ان دونوں کے جسم بھر گئے تھے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت دکھائی دینے لگے تھے۔

ظفر کا معمول تھا کہ وہ ہفتے کی شام مہوش کو ساتھ لیے اپنے سسرال میں آ جاتا' اتوار کو عمران کو دکان پر نہیں جانا ہوتا تھا اور ظفر کو بھی آفس سے چھٹی کی وجہ سے صبح اٹھنے کی جلدی نہیں ہوتی تھی اس لیے وہ دونوں رات گئے تک ادھر رہتے' اس روز مہوش اور ظفر کسی دوست کے ہاں سے پارٹی کے بعد آئے تھے اور پھر دیر تک گپ شپ لگاتے رہنے کے بعد واپس گھر جانے کے لیے چل پڑے تھے۔

مہوش کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ظفر چاہے جتنا بھی تھکا ہوا ہو وہ اسے ہفتے کی رات کو اس

کے گھر والوں سے ملوانے ضرور لے جاتا ہے تاکہ اس کا دل بھی لگا رہے اور وہ ماں اور بھائی کے بغیر اداس بھی نہ ہو۔

"ظفر آپ کتنے اچھے ہیں۔" گھر واپس جاتے ہوئے مہوش نے ظفر کو پیار سے دیکھتے ہوئے بات کی۔

"مجھے کیا پتا میں کتنا اچھا ہوں؟" ظفر نے مہوش کو چھیڑنے کے لیے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ بہت اچھے ہیں۔"

"ویسے یہ کمال نہیں ہو گیا۔ مجھے پتا بھی نہیں کہ میں بہت اچھا ہوں اور تمہیں پتا بھی چل گیا۔"

"آپ اچھے ہیں تو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔"

"بھئی کتنا خیال رکھتا ہوں؟" ظفر جان بوجھ کر مہوش کو الجھا رہا تھا' اس وقت مہوش جس قدر پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی' اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ لمحے طویل ہو جائیں' اسی لیے اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی تھی اور مہوش کی باتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اب دیکھیں ناں' یہ کوئی معمولی بات تو نہیں کہ آپ ہر ہفتے اپنی نیند اور آرام قربان کر کے مجھے میری ماں اور بھائی سے ملوانے لے جاتے ہیں۔"

"خوب صورت لڑکی پہلو میں بیٹھی ہو تو لڑکے کو ہوش ہی کہاں رہتا ہے؟ لڑکی جس قدر چاہے اسے اشاروں پہ نچا لے۔"

"مگر میں لڑکی نہیں بیوی ہوں۔"

"یہ تو شکر ہے تم نے جلدی سے بتا دیا کہ تم بیوی ہو ورنہ جب تم نے یہ کہا کہ میں لڑکی نہیں' تو مجھے زوردار جھٹکا لگا کہ کہیں میری کسی اور ہی مخلوق سے تو شادی نہیں ہو گئی۔"

"ظفر آپ بھی بڑے وہ ہیں۔" مہوش نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر کے مسکراتے ہوئے پیار سے اس کے بازوؤں پر مارتے ہوئے کہا اور پھر اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"بس اب اتنی رومانٹک بھی نہ ہو۔ گھر آ گیا ہے۔"

ظفر کی بات سنتے ہی مہوش نے اپنا سر اس کے کندھے سے ہٹایا اور سیٹ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ اپنی گلی میں داخل ہو چکے تھے ظفر نے گھر کے سامنے گاڑی روک دی اور گیٹ کھولنے کے لیے گاڑی سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک موٹر سائیکل بجلی کی سی تیزی سے عین ان کی گاڑی کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی' جس پر ہلکی عمروں کے دو نوجوان سوار تھے ان دونوں نے ہی جینز کی پینٹ اور شارٹ شرٹس پہن رکھی تھیں' موٹر سائیکل کھڑی کرتے ہی انہوں نے پستول نکال کر ان دونوں پر تان لیے تھے ظفر تو پہلے سے ہی گاڑی سے باہر کھڑا تھا' مہوش بھی گاڑی سے نکلنے کا اشارہ پا کر خاموشی سے گاڑی سے نکل کر باہر کھڑی ہو گئی تھی' ظفر اور مہوش اپنی باتوں میں اس قدر محو تھے کہ ان میں سے کسی کو بھی راستے میں یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ کوئی موٹر سائیکل پر ان کا پیچھا کر رہا ہے یہ کام اس قدر اچانک ہوا تھا کہ انہیں سمجھنے اور کچھ سوچنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔

"جو کچھ ہے جلدی سے نکال کر ہمارے حوالے کر دو۔" ظفر پر پستول تانے کھڑے نوجوان نے کرخت آواز میں کہا۔

"اور تم بھی۔" دوسرے نوجوان نے اپنے پستول والے ہاتھ کو نچاتے ہوئے مہوش کو حکم دیا۔

"میں سب کچھ تمہیں دے دیتی ہوں مگر انہیں کچھ مت کہنا۔" مہوش نے التجا کی۔

"تو پھر جلدی کرو' ہمیں باتوں میں مت الجھاؤ۔"

ظفر نے اپنا موبائل' گھڑی اور پرس نکال کر خاموشی سے ان کے حوالے کر دیا تھا' مہوش بھی ایک ایک کر کے اپنے تمام زیورات نکال کر ان کے حوالے کرتی جا رہی تھی' مگر انہیں وہاں سے بھاگنے کی اس قدر جلدی تھی کہ ایک نوجوان تاخیر سے بچنے کے لیے آگے بڑھ کر مہوش کے کانوں اور گلے سے زیورات نوچنے لگا۔

"اسے ہاتھ مت لگاؤ۔"

"ورنہ کیا کرو گے؟"

"ظفر آپ خاموش رہیں پلیز۔" مہوش نے بات بڑھنے کے خوف سے ظفر سے کہا اور پھر مزید تیزی سے زیورات اتارنے لگی۔

اب مہوش کے کانٹے' ہار اور انگوٹھیاں اس کے جسم سے اتر کر نوجوان کی جیبوں میں ٹھونسی جا چکی تھیں مگر اس کے بازو میں پہنی ہوئی چوڑیاں اور کنگن اتارنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

"شہباز! لگتا ہے اس کا چوڑیاں دینے کو دل نہیں کر رہا یہ کام ہمیں خود ہی کرنا پڑے گا۔" جو نوجوان ظفر پر پستول تانے کھڑا تھا اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بات کی۔

"ٹھیک ہو گیا۔" شہباز نے ساتھی کی بات سنتے ہی مہوش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خود چوڑیاں اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

"دیکھو میں تمہیں بار بار کہہ رہا ہوں اسے ہاتھ مت لگاؤ۔ جب تمہیں ہر چیز مل رہی ہے تو بار بار اسے ہاتھ کیوں لگاتے ہو؟" ظفر نے غصے میں بات کی' پھر مہوش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم جلدی سے چوڑیاں اتار کر ان کے منہ پر مارو اور جان چھڑاؤ میں تمہیں اور بنوا دوں گا۔"

"میں کب دیر کر رہی ہوں' چوڑیاں تھوڑی سی تنگ ہیں' آہستہ آہستہ ہی اتریں گی مگر یہ بے صبرے ہو رہے ہیں۔"

"شہباز تم بھی کن چکروں میں پڑ گئے ہو جلدی سے کٹر نکالو اور کام فارغ کرو۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" شہباز نے کہا اور اپنی جیب سے کٹر نما آلہ نکال کر پھر سے مہوش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

شہباز نے مہوش کا ہاتھ پکڑا تو ظفر غصے سے بے قابو ہو کر اس پر جھپٹ پڑا' اسی لمحے پستول سے گولی چلی اور ظفر کے سینے میں دھنس گئی' گولی لگنے سے ظفر زمین پر گر پڑا تھا' شہباز نے کسی بے رحم قصائی کی طرح الیکٹرانک کٹر سے ایک ہی جھٹکے میں مہوش کا بایاں ہاتھ کلائی سے کاٹ ڈالا تھا' مہوش بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی تھی مگر ان دونوں کو ہی اس کی کوئی پروا نہیں تھی' اب چوڑیوں اور کنگن والی کلائی شہباز کے ہاتھوں میں تھی' تب تک دوسرا نوجوان موٹر سائیکل اسٹارٹ کر چکا تھا' پھر جس قدر تیزی سے وہ وہاں آئے تھے اسی تیزی سے وہ وہاں سے نکل گئے۔

رات کی خاموشی میں گولی کی آواز دور تک سنائی دی تھی' لوگ اپنے اپنے گھروں میں سوئے پڑے تھے اس لیے کسی نے بھی انہیں لٹتے ہوئے نہیں دیکھا تھا' جب گولی چلی تو ایک دو گھروں کے لوگ کمروں سے نکل کر صورت حال جاننے کے لیے اپنے اپنے ٹیرس میں آ کھڑے ہوئے تھے' انہوں نے اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں اپنی آنکھوں سے انہیں مہوش کی کلائی کاٹتے اور پھر موٹر سائیکل پر فرار ہوتے دیکھا تھا' مگر کسی میں بھی ان کے سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

ان دونوں لٹیروں کے جانے کے بعد ایک ایک

کر کے بہت سے محلے دار وہاں آ کھڑے ہوئے تھے اوپر تلے بار بار ظفر کے گھر کی ڈور بیل بجائی گئی تو زاہدہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور سیڑھیوں سے جھانک کر دیکھا وہ آدھی رات کو اپنے دروازے پر کھڑے بہت سے لوگوں کو دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ کھولنے کے لیے نیچے اتر آئی، گیراج میں ظفر کی گاڑی کھڑی نہ دیکھ کر اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

زاہدہ نے گیٹ کھولا تو سامنے ہی اس کا بیٹا اور بہو خون میں لت پت زمین پر پڑے تھے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی، قریب تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑتی، کسی شخص نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا اور پھر اس کے پوچھنے پر تمام تفصیلات بیان کیں، کسی نے صورت حال دیکھ کر 15 پر کال کر دی تھی، فون کرنے پر کچھ ہی دیر میں ایمبولینس وہاں پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

موبائل فون کی گھنٹی بج رہی تھی مگر عمران فون نہیں اٹھا رہا تھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ان کی ہدایت کے مطابق مہوش اور ظفر گھر پہنچتے ہی مس کال ضرور کرتے تھے جس سے انہیں تسلی ہو جاتی تھی کہ وہ بخیریت گھر پہنچ گئے ہیں، وہ یہی سوچ کر فون نہیں اٹھا رہا تھا کہ اس کے موبائل فون پر بیل انہوں نے ہی کی ہوگی مگر جب بار بار موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی تو اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا، کال ظفر کے موبائل فون سے نہیں کی جا رہی تھی۔

"ہم لٹ گئے، ہم برباد ہو گئے بیٹا۔" فون آن کرتے ہی عمران کے کانوں میں ظفر کی والدہ کی آواز پڑی۔

"کیا ہوا آنٹی! سب خیر تو ہے ناں؟" عمران نے پریشانی کے عالم میں دریافت کیا۔

"خیر ہی تو نہیں ہے۔" زاہدہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی "ڈاکوؤں نے ظفر کو گولی مار دی اور مہوش کا ہاتھ کاٹ دیا۔ ہم اسے جناح ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔"

"یہ تو بہت برا ہوا! آپ فکر نہ کریں ہم آ رہے ہیں آنٹی!" عمران نے بات کی ابھی وہ بات کر رہا تھا کہ فون کٹ گیا۔

عمران جانتا تھا کہ اس وقت اگر اچانک اس نے یہ خبر ماں کو سنائی تو وہ صدمہ برداشت نہیں کر پائے گی مگر اسے اطلاع دیے بغیر بھی چارہ نہیں تھا، وہ اپنے کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں لیٹی اپنی ماں کے پاس آیا اور آہستہ سے آواز دی اس کی پہلی ہی آواز پر فرحت نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"کیا بات ہے عمران؟" فرحت نے آدھی رات کو بیٹے کو اپنے بیڈ کے پاس کھڑے دیکھ کر سوال کیا۔

"ابھی ابھی آنٹی زاہدہ کا فون آیا تھا۔"

"اس وقت! وہاں سب ٹھیک تو ہے ناں؟"

"ہاں وہ کہہ رہی تھیں ظفر کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس وقت قریب کوئی کلینک بھی نہیں کھلا تھا اس لیے وہ اسے ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔" عمران نے جان بوجھ کر بات بنائی۔

"اللہ خیر کرے۔" فرحت نے کہا اور پھر بولی "ہمیں بھی فوراً ہسپتال پہنچنا چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی اور باتھ روم میں جا کر جلدی سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔

فرحت باتھ روم سے باہر آئی تو عمران ہاتھ میں موٹر سائیکل کی چابی پکڑے گھر سے نکلنے کے لیے تیار کھڑا تھا، انہوں نے گیٹ پر تالا لگایا اور ہسپتال کی طرف چل پڑے، عمران صورت حال سے پوری

طرح آگاہ تھا اس لیے اس کی آنکھوں میں مسلسل آنسو تیر رہے تھے جنہیں اس نے بمشکل بہنے سے روکے رکھا تھا جبکہ فرحت کے ہاتھوں میں تسبیح تھی، لبوں پر ذکر خدا اور دل سے داماد کی خیریت کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔

☆☆☆

ماں بیٹا جناح ہسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچے تو انہیں دیکھ کر زاہدہ فرحت سے لپٹ کر رونے لگی اب تک فرحت کو عمران نے یہی بتایا تھا کہ ظفر کی طبیعت ٹھیک نہیں مگر ہسپتال پہنچتے ہی زاہدہ کے آنسو کچھ اور ہی کہانی سنا رہے تھے، فرحت اسے حوصلہ کرنے اور ظفر کے لیے دعا مانگنے کو کہہ رہی تھی، جب زاہدہ نے روتے ہوئے تمام واقعات بیان کیے، ظفر کو گولی لگنے اور مہوش کی کلائی کاٹنے کا بتایا تو فرحت جو اب تک زاہدہ کو حوصلہ دے رہی تھی، خود بھی دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی۔

ڈاکٹر ظفر کو بچانے کی پوری کوشش کر رہے تھے مگر اسے جس حالت میں ہسپتال لایا گیا تھا وہ انتہائی تشویشناک تھی، دوسری طرف مہوش بھی ابھی تک بے ہوش تھی، ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر کسی طرح مہوش کا ہاتھ مل جائے تو اسے آپریشن کے ذریعے جوڑا جا سکتا ہے جیسے ہی عمران نے ڈاکٹروں کے منہ سے یہ بات سنی تو وہ فوراً موٹر سائیکل پر ظفر کے گھر کی طرف چل پڑا۔

عمران نے ظفر کے گھر کے سامنے پہنچ کر موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر دی تھی، وہاں ظفر اور مہوش کے جسم سے نکلنے والا خون جگہ جگہ گرا دکھائی دے رہا تھا جو جم کر بھوری رنگت اختیار کر چکا تھا، اس نے وہاں کا بغور جائزہ لیا مگر کہیں بھی مہوش کا کٹا ہوا ہاتھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، جب وہ ادھر ادھر کا مکمل جائزہ لے چکا تو اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور مایوس ہو کر واپس چل پڑا، وہ آہستہ آہستہ موٹر سائیکل چلا رہا تھا، اس کی آنکھیں اب بھی بہن کا کٹا ہوا ہاتھ تلاش کر رہی تھیں، وہ گلی سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گیا تھا مگر کہیں ہاتھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ ہسپتال پہنچا تو دونوں مائیں ہاتھوں میں تسبیح لیے بینچ پر پاس پاس افسردہ بیٹھیں اپنے دونوں بچوں کی خیریت کی دعائیں مانگ رہی تھیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر عمران کا دل بھر آیا تھا، قریب تھا کہ وہ رو پڑتا لیکن اس نے خود کو سنبھالا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دونوں گھروں میں اس کے سوا کوئی دوسرا مرد نہیں تھا اگر وہ بھی رو پڑا تو انہیں تسلی دینے والا کوئی بھی نہیں رہے گا۔

"مہوش کا ہاتھ ملا؟" عمران کو دیکھتے ہی فرحت اور زاہدہ نے ایک ساتھ سوال کیا۔

"نہیں۔" عمران نے ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ادھر ادھر اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔" فرحت نے بات کی۔

"میں نے وہاں گلی میں ہر طرف بغور دیکھا اور واپسی پر بھی دور تک سڑکوں پر ادھر ادھر دیکھتا ہوا آیا ہوں مگر کہیں بھی مہوش کا ہاتھ دکھائی نہیں دیا۔"

"کوئی ان ظالموں سے پوچھے بھلا تم نے جو کچھ لینا ہے لے لو، مگر بچی کا ہاتھ تو نہ کاٹو۔" زاہدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایسی سوچ ہو تو وہ لوگ اس طرح کے کام ہی کیوں کریں، کسی کا ہنستا بستا گھر اجڑ جائے یا کوئی ان کے ہاتھوں مارا جائے انہیں اس کی کہاں پروا ہوتی ہے۔" عمران نے بات کی۔

عمران کی بات سن کر دونوں مائیں روتے ہوئے

جھولیاں اٹھا اٹھا کر ڈاکوؤں کو بد دعائیں دینے لگی تھیں' عمران کو مہوش اور ظفر کی فکر لگی ہوئی تھی' ڈاکٹر کئی باران کے لیے فوری طور پر مزید خون کا انتظام کرنے کے لیے کہہ چکے تھے اس لیے وہ وہاں سے ایک طرف ہو کر اپنے دوستوں اور عزیزوں کو فون کرنے لگا تھا۔

رات صبح میں بدل گئی تھی' لیکن ظفر زندگی کی وہ صبح دیکھ نہیں پایا تھا' زاہدہ بیٹے کی لاش سے لپٹ کر اس قدر تڑپتے ہوئے بین کر رہی تھی کہ پاس کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو نکل پڑے تھے' فرحت دہرے دکھ میں مبتلا تھی' ایک طرف اس کی نو بیاہتا بیٹی کا سہاگ اجڑ گیا تھا' دوسری طرف اس کی بیٹی اپنا ایک ہاتھ کٹوا کر زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی' اس کے آنسو بھی تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے' عمران بھی اندر سے ٹوٹ چکا تھا' اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے مگر اس کے باوجود وہ دونوں ماؤں کو حوصلہ دے رہا تھا' کچھ دیر بعد عمران' ظفر کی میت کو ایمبولینس میں ڈال کر اس کے گھر چھوڑ آیا تھا' زاہدہ اور فرحت بھی اس کے ساتھ ہی گھر چلی گئی تھیں۔

مہوش کو ہوش آ گیا تھا اور ڈاکٹروں نے اسے خطرے سے باہر قرار دے دیا تھا' عمران' ظفر کی میت کو گھر پہنچانے اور قبر کے لیے دوستوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد واپس مہوش کے پاس آ بیٹھا تھا مگر اس نے جان بوجھ کر اس سے ظفر کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔

"ظفر کیسے ہیں؟" ہوش میں آتے ہی مہوش نے اپنے ہاتھ کے متعلق پوچھنے کی بجائے خاوند کے بارے میں سوال کیا۔

"وہ دوسرے وارڈ میں ہیں' بس تم فکر نہیں کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عمران نے حوصلے سے بات کی مگر پھر بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"تم مجھے اس کے پاس لے چلو' میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"میں نے کہا ناں وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"کہیں تم مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہے؟"

"میں کیوں جھوٹ بولنے لگا۔"

"تو پھر مجھے اس کے پاس لے کر کیوں نہیں جاتے ایک بار صرف ایک بار میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں' میرا وعدہ ہے میں اس سے کوئی بات بھی نہیں کروں گی اور تمہارے ساتھ ہی یہاں واپس چلی آؤں گی۔"

"میں تمہیں کیسے بتاؤں میری بہنا! ظفر بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔" عمران بات کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"ہاں' ظفر بھائی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔"

"ظفر چلے گئے تو پھر میں کیسے زندہ ہوں' جس شخص نے میرے لیے جان دے دی میں اس کے ساتھ کیوں نہیں مر گئی۔" مہوش کو خود پر قابو نہیں رہا تھا اور وہ روئے جا رہی تھی' اس کے آنسو آنکھوں سے نکل کر بیڈ کی چادر میں جذب ہو رہے تھے' پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

عمران اس کی حالت دیکھ کر جلدی سے وارڈ میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو بلا لایا' تھوڑی سی کوشش سے ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر ساتھ ہی اس نے اسے نیند کا انجکشن بھی لگا دیا تھا تاکہ وہ دو تین گھنٹے سکون سے سوئی رہے۔

انجکشن لگنے کے تھوڑی ہی دیر بعد نیند مہوش پر

غالب آ گئی تھی' اس کے سونے سے پہلے تک عمران پاس بیٹھ کر غور دیکھتا رہا تھا' جب اسے تسلی ہو گئی کہ وہ گہری نیند سو چکی ہے تو وہ ماں سے بات کرنے کے لیے موبائل سے نمبر ملانے لگا' ماں سے بات ہوئی تو فون پر رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' عمران نے مہوش کے ہوش میں آنے کی اطلاع ماں کو دے دی تھی تاکہ وہ جس کرب سے گزر رہی تھی اس میں کچھ کمی آ سکے اور کم از کم اسے بیٹی کی طرف سے تسلی ہو جائے' ماں سے بات کرنے کے بعد وہ اپنے عزیزوں' رشتہ داروں اور دوست احباب کو ظفر کی موت کی اطلاع دینے کے لیے فون ملانے لگا۔

مہوش پچھلے دو گھنٹے سے سو رہی تھی' پھر اچانک وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔

"تم بیٹھ کیوں گئی' لیٹی رہو۔" عمران نے اسے بیٹھتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں مجھے گھر جانا ہے۔"

"تم ٹھیک ہو جاؤ پھر گھر بھی چلیں گے۔"

"میں نے کہا ناں مجھے ابھی جانا ہے ورنہ دیر ہو گئی تو وہ ظفر کو لے جائیں گے اور پھر میں زندگی بھر بھی اس کی صورت دیکھ نہیں پاؤں گی۔"

"اچھا میں ڈاکٹر سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔"

"ڈاکٹر مانے یا نہ مانے' بس مجھے جانا ہے۔" مہوش نے سخت لہجے میں بات کی۔

مہوش کی بات سن کر عمران اٹھ کھڑا ہوا اور ڈاکٹر کو تمام تر صورت حال سے آگاہ کر دیا' مہوش کی جو حالت تھی' عام حالات میں ڈاکٹر کسی بھی طرح اسے جانے کی اجازت نہ دیتا مگر خاوند کا جنازہ گھر میں پڑا ہونے اور اس کا آخری دیدار کرنے کے لیے اسے مجبوراً اجازت دینا پڑی' کیونکہ وہ وقت کی نزاکت سے پوری طرح آگاہ تھا اور جانتا تھا کہ اگر اس نے مہوش کو جانے کی اجازت نہ دی تو اس کی حالت مزید بگڑ سکتی تھی۔

عمران' مہوش کو لے کر گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی ظفر کی میت چارپائی پر پڑی تھی اور ارد گرد بہت سی خواتین بیٹھی تھیں' مہوش پر نظر پڑتے ہی وہاں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا' عورتیں باری باری اسے سینے سے لگا کر روتے ہوئے بین کرنے لگیں' ماں نے بیٹی کو کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ دیکھا تو صبر کے بھی دامن چھوٹ گئے اور وہ اسے گلے لگا کر خوب روئی' زاہدہ بیٹے کی لاش کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی' مہوش کو دیکھ کر اس نے اسے سینے سے چمٹا لیا اور اس قدر روئی کہ روتے ہوئے اس کی ہچکی بندھ گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی' تھوڑی ہی دیر بعد چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے اور چہرہ تھپتھپانے سے زاہدہ نے آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ پھر سے آنسو بہانے لگی تھی۔

سبھی خواتین مہوش کے گلے لگ کر رو رہی تھیں مگر مہوش کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا' وہ جب سے آئی تھی مسلسل ظفر کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی' اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ انسان نہیں کوئی پتھر ہو جو احساسات سے عاری ہو' کچھ دیر بعد جنازہ اٹھا تو ایک بار پھر خواتین رونے لگیں اور مرد کلمہ شہادت کی صدا بلند کرتے ہوئے جنازہ لے کر نکل گئے۔

☆☆☆

عمران کئی روز تک مہوش کے پاس سے ایک پل کے لیے بھی نہیں ہلا تھا' مہوش سب کے کہنے کے باوجود دوبارہ ہسپتال نہیں گئی تھی' ڈاکٹر گھر میں ہی آ کر پٹی تبدیل کر جاتا تھا' زاہدہ اور فرحت بھی ہر پل سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں' جب آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آنے لگی تو ماں اور آنٹی

زاہدہ کے کہنے پر عمران دکان پر جانے لگا' وہ دن بھر دکان پر رہتا' واپسی پر گھر جانے کی بجائے سیدھا بہن کے پاس آ جاتا اور پھر دیر تک اس کے پاس بیٹھا اس کا دل بہلانے کی کوشش میں لگا رہتا۔ جب سے ظفر فوت ہوا تھا تب سے فرحت مہوش کے پاس ہی تھی جبکہ عمران رات گئے اپنے گھر جا کر سو جاتا تھا۔

دکان پر زیادہ تر مال افضال کے ہاں سے آتا تھا' مہوش کی شادی میں ہونے والے اخراجات کی وجہ سے عمران کی طرف افضال کی رقم چار لاکھ روپے ہو گئی تھی' مہوش کے بیوہ ہونے کے بعد جب اس نے پہلی بار دکان کھولی تھی تو افضال آیا تھا مگر اس نے رقم کی بابت کوئی بات نہیں چھیڑی تھی اور اس کے بہنوئی کے قتل کا افسوس کر کے خاموشی سے چلا گیا تھا' عمران جانتا تھا کہ وہ اگلی بار آئے گا تو رقم کی ادائیگی کے لیے ضرور کہے گا۔

''افضال کچھ مال تو بھجواؤ یار۔'' اس سے پہلے کہ افضال کوئی بات کرتا اس کے آتے ہی عمران نے بات کر دی۔

''مال بھی آ جائے گا' پہلے پچھلے پیسے تو دو'' افضال نے وہی بات کی تھی جس کا عمران کو ڈر تھا۔

''وہ بھی مل جائیں گے' کچھ مال بھی تو دو۔''

''میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ میں تمہیں ادھار پہ ادھار دیتا جاؤں۔''

''یار میں دکان چھوڑ کر کہیں بھاگا جا رہا ہوں؟ دیکھو تو سہی دکان خالی پڑی ہے اس میں کچھ مال ڈالوں گا تو پھر ہی تمہیں بھی کچھ دے پاؤں گا۔''

''خیر مال تو میں اس وقت تک نہیں دوں گا جب تک پچھلے پیسے نہیں مل جاتے۔''

''پھر فی الحال صبر کرو۔''

''ٹھیک ہے اس بار تو میں چلا جاتا ہوں' لیکن اگلے ہفتے آؤں تو رقم کا بندوبست کر کے رکھنا۔'' افضال نے تلخ لہجے میں بات کی اور عمران کا جواب سنے بغیر ہی وہاں سے نکل گیا۔

افضال کی باتوں نے عمران کو پریشان کر ڈالا تھا' وہ ہر وقت سوچنے لگا تھا' اٹھتے بیٹھتے اس کے ذہن سے ایک ہی سوال اٹھتا کہ وہ افضال کو دینے کے لیے رقم کہاں سے لائے' وہ اس بارے میں اپنی ماں سے بات کر کے ان کی پریشانیوں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا' انہی سوچوں میں ہفتہ اس قدر جلدی گزر گیا کہ پتا بھی نہ چلا اور افضال پھر سے رقم کا تقاضہ کرنے دکان میں آ بیٹھا۔

''کچھ مال بھجوا دیتے تو کیا حرج تھا۔ کم از کم دکانداری چلتی رہتی اور آج تمہیں بھی کچھ نہ کچھ رقم دے دیتا۔'' افضال کو دیکھتے ہی عمران نے بات کا آغاز کیا۔

''میں پیسے لینے آیا ہوں۔ مال کی بات کرنے نہیں آیا۔''

''مگر مال کے بغیر دکان کیسے چلے گی؟''

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے میرا نہیں۔ میرے ساتھ صرف میرے پیسوں کی بات کرو۔ مجھے بھی مال تیار کرنے کے لیے بازار سے سامان لانا ہوتا ہے۔''

''تم تو ایک ہی بات کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ کہا تو ہے مال بھجواؤ۔ میں تھوڑے تھوڑے کر کے پچھلی رقم بھی ادا کرتا رہوں گا۔''

''میں تمہیں ایک ہفتے کا اور وقت دیتا ہوں۔ اگلے ہفتے رقم کا بندوبست کر کے رکھنا۔'' افضال نے بات کی اور عمران کو گھورتا ہوا دکان سے نکل گیا۔

یہ بات اب معمول بن گئی تھی' افضال ہر ہفتے آتا اور رقم نہ ملنے کی وجہ سے تلخ کلامی کر کے جاتا' عمران چاہتے ہوئے بھی افضال کو دینے کے لیے رقم کا انتظام نہیں کر پا رہا تھا اسی لیے وہ اس کی تمام باتیں خاموشی سے برداشت کر لیتا تھا۔

☆☆☆

ظفر کو اس دنیا سے رخصت ہوئے چار ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا' اس دوران زاہدہ نے ایک ماں کی طرح مہوش کو بھرپور پیار دیا تھا' چہلم تک فرحت بھی مہوش کے پاس ہی رہی تھی مگر پھر اپنے گھر چلی گئی تھی' فرحت دوسرے تیسرے روز مہوش کے پاس چکر لگا جاتی تھی مگر عمران ہر روز دکان سے واپسی پر مہوش کے پاس کچھ دیر ضرور بیٹھ کر جاتا تھا' اس روز مہوش کی عدت کے دن پورے ہوئے تھے' فرحت اور عمران کے علاوہ بھی گھر میں کچھ لوگ آئے ہوئے تھے' زاہدہ نے مہوش کو گلے لگا کر خوب پیار کیا' اس کا ماتھا چوما' آنکھوں پہ پیار کیا اور پھر جی بھر کر روئی۔

''دل تو نہیں چاہتا کہ تمہیں خود سے جدا کروں' مگر اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں۔'' زاہدہ نے روتے ہوئے مہوش سے کہا۔

''اب میں آپ سے جدا ہونے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی آنٹی! اب تو ہمارا جینا مرنا ساتھ ہی ہوگا۔'' مہوش نے افسردہ لہجے میں بات کی۔

''نہیں بیٹی! میرا تمہارا ساتھ اتنا ہی تھا۔ اب تمہیں اپنی ماں کے پاس لوٹ جانا ہوگا۔''

''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی آنٹی۔''

''میں تمہارے جذبات کو سمجھتی ہوں لیکن تمہیں جانا ہی ہوگا' ابھی تمہاری ساری عمر پڑی ہے۔ میرا کیا ہے آج ہوں شائد کل نہ ہوں' پھر بھی جب تک ہوں جیسے تیسے گزار لوں گی۔''

''بہن آپ کیوں دل چھوٹا کر رہی ہیں۔ مہوش آپ کے پاس ہوگی تو آپ کا بھی دل لگا رہے گا۔'' فرحت نے زاہدہ کو سمجھایا۔

''آپ لوگ میری بات کو کیوں نہیں سمجھ رہے۔ ذرا سوچیں تو سہی' میں جس بیٹے کے لیے مہوش کو بیاہ کر لائی تھی جب وہی نہیں رہا تو اسے اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گی۔''

''اس کے چلے جانے سے رشتہ ختم تو نہیں ہو گیا۔''

''میں اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنے کے قابل نہیں' اس لیے آپ کو اسے اپنے ساتھ لے جانا ہی ہوگا۔'' زاہدہ نے دوٹوک بات کی اور پھر بولی۔ ''اور ہاں۔ یہ اپنے ساتھ جہیز میں جو سامان لائی تھی وہ بھی لے جائیں۔''

''آنٹی پلیز ایسا نہ کریں' میں ظفر کی یادوں کے سہارے زندگی گزار دوں گی۔ اس گھر میں آپ کی نوکرانی بن کر رہ لوں گی' مگر مجھے اس گھر سے جانے کا نہ کہیں۔'' مہوش نے روتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میری بچی! میری تو جو تھوڑی بہت زندگی ہے وہ جیسے تیسے کٹ ہی جائے گی لیکن تم پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزار پاؤ گی۔ اسی لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔''

سب نے مل کر زاہدہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ کسی بھی طرح بات سننے کے لیے تیار نہ تھی اور اس بات پر بضد تھی کہ اس نے جو فیصلہ کیا ہے اسی میں دونوں خاندانوں کی بہتری ہے' اس لیے سب کو خاموشی اختیار کرنا پڑی اور یوں مہوش آنسو بہاتے ہوئے اس گھر میں گزارے ہوئے چند ماہ کی یادوں کو سینے سے لگائے ماں اور بھائی کے ساتھ اجڑ کر اسی گھر میں واپس آ گئی جس گھر سے دلہن بن کر رخصت ہوئی تھی۔

☆☆☆

وقت نے عمران کو عجیب آزمائش میں ڈال دیا تھا'

ایک طرف بہن بیوہ ہو کر گھر آ بیٹھی تھی اور دوسری طرف کاروبار نہ ہونے کی وجہ سے وہ افضال کی رقم لوٹا نہیں پا رہا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار مارکیٹ میں آتا تھا' وہی دن عمران پر بھاری گزرتا تھا کیونکہ افضال کے منہ میں جو آتا وہ کہہ کے چلا جاتا اور عمران گردن جھکائے خاموشی سے سب کچھ سن لیتا تھا' افضال کے مارکیٹ میں آنے کا دن تھا اس لیے وہ صبح سے ہی پریشان تھا' ایک دو بار اس کا دل چاہا کہ وہ دکان بند کر کے چلا جائے تاکہ اسے افضال کا سامنا ہی نہ کرنا پڑے لیکن پھر اس نے خود ہی اپنے اس خیال کی نفی کر دی کہ اگر آج وہ دکان بند کر کے چلا گیا تو افضال کو مزید باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔

''لاؤ بھئی پیسے دو۔'' افضال نے آتے ہی سلام دعا کیے بغیر ڈائری کھول کر کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔

افضال کی بات سنتے ہی عمران نے اسے دینے کے لیے بمشکل بچائے ہوئے دو ہزار روپے جیب سے نکال کر خاموشی سے اس کے سامنے رکھ دیے۔

''یہ کیا مذاق ہے؟'' افضال نے پیسوں کو ہاتھ لگائے بغیر ہی سوال کیا۔

''فی الحال یہ رکھو۔ میں تھوڑے تھوڑے کر کے تمہارے سارے پیسے دے دوں گا۔''

''میں نے تم سے چار لاکھ روپے لینے ہیں عمران بابو! اس طرح ہزار دو ہزار دینے سے کام نہیں چلے گا' اگر تم یہ سمجھے بیٹھو ہو کہ میرے پیسے مار لو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔''

''میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا اور دکان کی حالت تمہارے سامنے ہے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر' آج کے بعد میں تم سے رقم لینے نہیں آؤں گا بلکہ تم خود مجھے میری رقم دینے آؤ گے۔'' افضال نے بات کی اور نکل گیا۔

☆☆☆

وہ پروفیسر ندیم کا اکلوتا بیٹا تھا' کالج میں اس کی دوستی کچھ ناپسندیدہ افراد سے ہوگئی تھی' پروفیسر ندیم نے بار بار اسے ان لوگوں سے دور رہنے کا کہا تھا مگر اس نے ہمیشہ سنی ان سنی کر دی تھی' اس نے موبائل چھیننے اور پستول دکھا کر لوگوں سے پیسے نکلوانے جیسی چھوٹی موٹی وارداتوں سے برائی کی راہ پر قدم رکھا تھا' رفتہ رفتہ اس کا حوصلہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ اپنے علاقے کے غریب دکانداروں اور ریڑھی لگانے والوں سے بھتہ بھی وصول کرنے لگا تھا' جو اسے بھتہ نہ دیتا وہ سر بازار اس کی پٹائی کرتا تھا' اس لیے خوف کے مارے لوگ خاموشی سے اسے بھتہ دے دیتے مگر دل ہی دل میں اسے بددعائیں دیتے' عمران کے ہاں سے نکل کر افضال سیدھا اسی کے پاس گیا تھا' افضال نے اسے تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا اور اس نے کل رقم کا پچیس فیصد لینے کے عوض افضال کی رقم واپس دلانے کی یقین دہانی کرا دی تھی۔

شام کا وقت تھا' عمران ابھی دکان سے واپس نہیں آیا تھا' دروازے کی گھنٹی بجی تھی' آنے والے کے لیے دروازہ کھولنے مہوش گئی تھی۔

''کون؟'' مہوش نے دروازہ کھولنے سے پہلے تصدیق کے لیے پوچھا۔

''عمران سے ملنا تھا۔'' آنے والے نے بات کی۔

''بھائی تو ابھی دکان سے واپس نہیں آیا۔''

''وہ آئے تو اسے کہنا افضال کی رقم وصول کرنے شہباز آیا تھا۔''

''جی میں بتا دوں گی۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' یہ کہتے ہی شہباز نے وہاں سے جانے کے لیے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر لی۔

شہباز کے منہ سے نکلنے والے تین لفظ ''ٹھیک ہو گیا'' کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے دل و دماغ پر لگے تھے' اس نے یہ الفاظ ادا کرنے والے شخص کو دیکھنے کے لیے بجلی کی سی تیزی سے دروازے کی کنڈی کھولی تھی' مگر تب تک وہ وہاں سے جا چکا تھا۔

''بھائی تم سے ملنے کوئی لڑکا آیا تھا۔'' عمران کے گھر آنے پر مہوش نے بتایا۔

''کون تھا؟''

''کہہ رہا تھا وہ افضال کی رقم وصول کرنے آیا ہے۔''

''افضال کی رقم سے اس کا کیا تعلق؟'' عمران نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''یہ تو مجھے معلوم نہیں' بس اس نے جو کہا وہ میں نے تمہیں بتا دیا۔''

''چلو اچھا میں دیکھ لوں گا لیکن اگر وہ پھر آئے تو اسے میری طرف سے کہہ دینا کہ افضال کی رقم کے لیے تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔''

''اچھا تم پریشان نہ ہو۔ منہ ہاتھ دھو لو میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔'' مہوش نے بات کی اور اس کے لیے کھانا لانے کچن میں چلی گئی۔

جب سے مہوش بیوہ ہو کر گھر واپس آئی تھی' فرحت نے خود کو اپنے کمرے میں ہی قید کر لیا تھا' اسے باہر کی دنیا سے کوئی غرض نہیں رہی تھی' وہ سارا دن کمرے میں ہی پڑی چھت کو گھورتی رہتی تھی' وہ اذان کی آواز سنتی تو اٹھ کر نماز پڑھ لیتی اور پھر سے اپنے بستر پر جا لیٹتی تھی۔

مہوش پریشانی کے عالم میں رات بھر جاگتی رہی تھی اور دن بھی بے چینی کے عالم میں گزرا تھا' دروازے کی گھنٹی بجی تو مہوش یوں دوڑ کر دروازے پر گئی تھی جیسے اسے گھنٹی بجنے کا ہی انتظار تھا۔

''کون؟'' مہوش نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

''عمران ہے تو اسے باہر بھیجو۔'' دروازے پر کھڑے شخص نے کہا۔

اس کی آواز پہچاننے میں مہوش کو ذرا سی بھی دیر نہیں لگی تھی' آواز سنتے ہی وہ اس شخص کی شکل دیکھنے کی کوشش کرنے لگی تھی' وہ دروازے میں کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہی تھی جہاں سے وہ اس کا چہرہ دیکھ سکے' وہ اسی کوشش میں تھی کہ وہی آواز پھر سے اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''تم میری بات سن رہی ہو؟'' باہر کھڑے شخص نے رعب دار آواز میں سوال کیا۔

''ج... ج... جی... میں سن رہی ہوں۔'' مہوش نے پریشانی کے عالم میں رک رک کر بات کی۔

''تو جواب کیوں نہیں دیتی۔''

''بھائی اس وقت گھر پہ نہیں ہوتا۔ وہ رات کو دس بجے کے قریب دکان سے واپس آتا ہے۔'' مہوش نے ڈرتے ہوئے بات کی اور ساتھ ہی دروازے کی درز میں سے باہر کھڑے شخص کو دیکھنے لگی' وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئی تھی' مگر اس کا سارا بدن بری طرح کانپنے لگا تھا' وہ جس چہرے کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی' یہی وہ چہرہ تھا جو اس کے دل پر اس طرح نقش ہو چکا تھا کہ بھلائے بھی نہیں بھول سکتا تھا۔

''میں بار بار نہیں آ سکتا۔ اسے کہہ دینا سیدھی طرح رقم واپس کر دے ورنہ میں سارے محلے کے سامنے ماں بہن ایک کر دوں گا۔ وہ شاید ابھی مجھے جانتا نہیں' شہباز نام ہے میرا۔''

''میں کہہ دوں گی۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' شہباز نے کہا اور وہاں سے چلا

گیا۔

وہ چلا گیا تھا مگر مہوش ابھی تک وہیں کھڑی سوچ رہی تھی آج وہی شخص اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا جس نے اپنے تھوڑے سے فائدے کے لیے اس کی ہنستی بستی زندگی اجاڑ کر رکھ دی تھی۔ عمران کے گھر پہنچنے پر مہوش نے اسے تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا مہوش کی بات سن کر عمران نے اس سے کہا تھا "اگر اب وہ دوبارہ آئے تو اسے کہنا کہ اپنا موبائل نمبر دے دو بھائی خود ہی بات کرلے گا"۔ مہوش نے یوں تو پوری بات عمران کو بتا دی تھی مگر اس نے جان بوجھ کر شہباز کو دیکھنے اور اسے پہچاننے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی' وہ اس معاملے میں تمام پہلوؤں پر سکون سے غور کرنا چاہتی تھی' اس لیے وہ عمران کو کھانا دے کر اپنے کمرے میں جا لیٹی تھی۔

اگلے روز وہ پھر آ دھمکا تھا اور آتے ہی ننگی گالیاں دینے لگا تھا' وہ اس قدر اونچی آواز میں گالیاں دے رہا تھا کہ سن کر آس پاس کے گھروں کے لوگ بھی اپنے اپنے دروازوں میں آ کھڑے ہوئے تھے مہوش نے عمران کے کہنے کے مطابق اسے اپنا موبائل فون نمبر دینے کو کہا' تو اس نے نمبر لکھوا دیا اور پھر آنے کا کہہ کر دھمکیاں دیتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

شہباز کے جاتے ہی مہوش نے عمران کو فون پر گالیاں دینے اور دھمکیاں دے کر جانے کی بابت بتا دیا تھا' اور ساتھ ہی اسے شہباز کا موبائل نمبر بھی نوٹ کروا دیا تھا' مہوش نے شہباز کے متعلق اب تک جو بات چھپائی ہوئی تھی وہ بھی بتا دی تھی کہ شہباز نے ہی اپنے دوست کے ساتھ مل کر انہیں لوٹا تھا اور ظفر پر گولی چلائی تھی' مہوش کی بات نے عمران کو ہلا کر رکھ دیا تھا' فون سننے کے بعد وہ کچھ دیر تک دونوں ہاتھوں میں سر لیے سوچتا رہا پھر شہباز کا نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو......" فون اٹھاتے ہی دوسری طرف سے آواز آئی۔

"تم شہباز بول رہے ہو؟"

"ہاں' میں شہباز ہوں تم کون ہو؟"

"میں عمران بول رہا ہوں۔ جس کے گھر تم ابھی گالیاں نکال کر آئے ہو۔"

"شکر کرو تم گھر پر نہیں تھے اور میں صرف گالیاں دے کر واپس آ گیا ہوں۔"

"لیکن تمہارا افضال کی رقم سے کیا واسطہ؟"

"جو بھی ہو' بس مجھے وہ رقم چاہیے' ورنہ میں کیا کچھ کرسکتا ہوں یہ تم ابھی نہیں جانتے۔"

"نہیں نہیں' اس کی ضرورت نہیں۔ فی الحال میں آج تمہیں ایک لاکھ روپے دے دیتا ہوں۔ کچھ دنوں میں باقی کی رقم بھی دے دوں گا۔"

"یہ کی ناں عقل مندی والی بات۔"

"میں ٹھیک ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ جاؤں گا' تم بھی ایک گھنٹے بعد وہیں آ جاؤ اور ایک لاکھ روپے لے جاؤ۔"

"ٹھیک ہو گیا۔"

فون بند ہو چکا تھا' عمران نے دکان کے باہر پڑا ہوا سامان سمیٹا اور دکان بند کر کے گھر کی جانب چل پڑا' وقت نے اسے ایک نئے امتحان میں ڈال دیا تھا' وہ اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرتا ہوا گھر پہنچ گیا تھا۔

"کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ شہباز وہی شخص ہے جس نے ظفر بھائی کا خون کیا تھا۔" عمران نے اپنی تسلی کے لیے مہوش سے سوال کیا۔

"جو چہرہ ہر پل میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہو' جس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میرے دل پر نقش ہو چکے ہوں' میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں بھلا

اور پھر اس روز اس کے ساتھی نے دو بار اسے شہباز کے نام سے ہی پکارا تھا۔" مہوش نے رندھی ہوئی آواز میں بات کی۔

بہن کی بات سن کر بھائی کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی' اور اس کا دماغ گھومنے لگا تھا' وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا' پھر اچانک وہ اٹھا اور الماری میں پڑی اپنے باپ کی پستول اٹھا لایا۔

"نہیں عمران تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" عمران کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ مہوش نے کہا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا' مگر آج وہ میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گا۔"

"پاگل مت بنو اور یہ پستول مجھے دو۔" مہوش نے بات کی اور عمران کے ہاتھوں سے پستول لے لی۔

دروازے پر گھنٹی بجی تھی' عمران دروازہ کھولنے گیا تھا' مہوش بھی اس کے ساتھ ساتھ ہو لی تھی' عمران نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"جی؟" عمران دروازے پر کھڑے شخص کو جان گیا تھا مگر پھر بھی اس نے تصدیق کے لیے کہا۔

"مجھے شہباز کہتے ہیں۔" دروازے پر کھڑے نوجوان نے اپنا تعارف کروایا' تعارف کرواتے ہوئے اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"تمہاری اتنی جرات کہ میرے ہی گھر آ کر میرے گھر والوں کو گالیاں دے کر جاؤ" عمران نے تلخ لہجے میں بات کی۔

شہباز یہ سوچ کر وہاں آیا تھا کہ فون پر ہونے والی بات چیت کے مطابق اسے جاتے ہی رقم مل جائے گی مگر عمران کے لہجے کی تلخی نے ایک لمحے کے لیے اسے پریشان کر ڈالا تھا۔

"اب بھی عزت سے رقم میرے ہاتھ پر رکھ دو ورنہ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ سب توبہ توبہ کر اٹھیں گے۔" شہباز نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے غصے سے کہا۔

"ابھی دیتا ہوں تمہاری رقم۔" یہ کہتے ہوئے عمران نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور پھر وہاں پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھالی۔

عمران نے شہباز کے سر پر مارنے کے لیے اینٹ اٹھائی ہی تھی کہ اسی لمحے پستول سے ایک گولی نکل کر شہباز کے سینے میں اتر گئی' گولی لگتے ہی شہباز زمین پر گر پڑا تھا' عمران نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مہوش اپنے ہاتھ میں پستول لیے غصے سے کانپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا' اسے دیکھتے ہی اینٹ عمران کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی' اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر مہوش کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پستول اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

ایک ایک کر کے لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے' عمران نے پولیس کو فون کر دیا تھا اور انہیں قتل کی اطلاع بھی دے دی تھی' تھوڑی ہی دیر بعد پولیس جائے وقوعہ پر پہنچ گئی تھی اور شہباز کے قتل کے الزام میں عمران کو گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی تھی' لوگ شہباز کے قتل کی خبر سنتے ہی خوش ہو کر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے بھنگڑے ڈالنے لگے تھے۔

روحانی مسائل

حافظ شبیر احمد

انجینئر عمر   راولپنڈی

سوال ۔محترم السلام علیکم! ہمارا کاروبار (بڑے بھائی کے ساتھ) بہت اچھا شروع ہوگیا ہے پھر بھی کبھی کبھی رکاوٹ آجاتی ہے۔ رکاوٹ دور کرنے کے لیے وظیفہ حسد اور بدنظر سے بچنے کا وظیفہ عنایت فرمادیں۔

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ کاروبار کے لیے دعا کریں۔

یاسمین......لاہور

جواب: بی بی آپ شوہر کی نہ ہوئیں تو بیٹا آپ کا نہ ہوا۔ یہ تو مکافات عمل ہے۔ بہرحال اللہ سے معافی مانگیں۔ سورۃ البقرۃ اور یسین شریف پڑھ کر سب کو پانی پلائیں اور پییں 40 روز۔ رشتہ کے لیے بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 بار روزانہ پڑھیں۔

مسرت یاسمین   راولپنڈی

جواب بی بی آپ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 بار روزانہ پڑھیں (اول وآخر درود شریف) تین ماہ تک۔ بھائی آپ کا رشتہ کے لیے تیار نہیں تو اس کو سورۃ الفلق 70 بار پڑھ کر پانی پلائیں۔

تحریم نذیر   بھمبھر (آزاد کشمیر)

جواب: بچی پر جب یہ کیفیت آئے تو سورۃ الجن پڑھ کر ایک بار پانی پر پھونک کر اس کو چھینٹا دیں پھر پانی پلائیں۔

ایس اے علم   راولپنڈی

جواب: درود شریف کثرت سے پڑھتے رہیں۔ اللھم انا نجعلک فی نحورھم و نعوذبک من شرو راھم ۔نیت اے اللہ مجھے نجات دے اس کی نحوست اور شر سے۔ ہر نماز کے بعد گیارہ بار پڑھیں (بیوی کے لیے بھی یہی کریں)۔ بعد فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 بار روزانہ پڑھیں۔ اول وآخر درود شریف گیارہ گیارہ بار پھر رشتہ کے لیے دعا کریں تین ماہ تک مستقل۔

محمد دانیال......بہاولپور

ماھو الا ذکر للعلمین (القلم ۵۲) بعد نماز فجر 41 مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کردیں وہ پانی صبح نہار منہ پلائیں (روزانہ کا عمل ہے یہ)۔ جب سوجائے تو سرہانے کھڑے ہوکر آیت تسبیح پڑھیں اتنی آواز سے کہ اگر جاگ رہا ہوتو سن لے۔ اول وآخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ۔

قمر النساء   کورنگی، کراچی

جواب: سات بار سورۃ الجن خود نہ پڑھ سکو تو کسی سے بلند آواز سے پڑھوا کر سنو روزانہ۔

ر۔ل ک......کنجاہ

جواب: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ پڑھیں، اول وآخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ۔ دعا بھی کریں۔

آصف ہارون   کوہاٹ

ج۔ نماز کی پابندی کریں۔ بعد نماز فجر 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ پورے جسم پر پھونک ماریں۔

ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 9'9 مرتبہ پڑھیں۔ آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ ان شاء اللہ

مریم شاہین   راولپنڈی

ج۔ عشاء کی نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ ہاتھوں پر دم کرکے سر اور پورے جسم پر پھیرا کریں۔

امتحان میں کامیابی کے لیے ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ سورۃ القریش پڑھا کریں۔ دعا بھی کیا کریں۔

سر درد اور آنکھوں میں پانی آنا پڑھتے وقت "بچی نظر" کی نشانی ہے۔ اس کا علاج کروائیں۔

شاداب......میرپور خاص

ج۔ جائیداد کے لیے سورۃ یسین کی آیت نمبر 82-313 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ رات کے وقت آیت کے معنی ذہن میں رکھیں در نیت اچھے کام کی ہو۔

نماز کی پابندی کریں، روزانہ استغفار اور درود شریف کی 1 تسبیح کریں۔

جب گھر میں چینج آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کردیں۔ 11'11 مرتبہ اول وآخر درود شریف۔ لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔

رشتے کے لیے۔ سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف بعد نماز فجر۔ جن کے رشتوں کا مسئلہ ہے وہ خود پڑھیں۔

سندس گلزار احمد......سرگودھا

ج۔ والدہ نیم پھلی کا سالن بنا کر کھائیں افاقہ ہوگا۔ آپ کی والدہ کریں۔

ولد کا مسئلہ۔ بیان نہیں کیا۔ جواب دیے گئے مسئلے کے بارے میں دوبارہ پوچھنا ہو تو جواب ساتھ لگایا کریں۔

والد کا مسئلہ۔ بیان نہیں کیا۔ جواب دیے گئے مسئلے کے بارے میں دوبارہ پوچھنا ہو تو جواب ساتھ لگایا کریں۔

سندس......سرگودھا

ج۔ رشتے کے لیے۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

سورۃ اخلاص، سورۃ الفلق، سورۃ الناس 9'9 مرتبہ ہر نماز کے بعد اپنے اوپر دم بھی کیا کریں۔

جویریہ   لاہور

ج:۔ "یا قوی" ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سر پہ ہاتھ رکھ کر "یا فتاح" 1 تسبیح روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک۔ دعا بھی کریں۔

ک۔گ......اورنگی ٹاؤن

ج۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ پڑھیں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف اللہ سے معافی بھی مانگیں اور اچھے اور جلد رشتہ کے لیے دعا بھی کریں۔ مسئلہ جلد حل ہوجائے گا۔ ان شاء اللہ

ط۔ن......گجرات

ج۔ سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق، سورۃ الناس 11'11 بار پڑھ کر رزق ختم ہونے کا تصور کرکے پانی پہ پھونک مار کر پیا کریں۔ 3 ماہ تک۔

"یا واحد" 1000 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

ث......ساہیوال

ج:۔ "اللھم انا نجعلک فی نحورھم و نعوذبک من شرورھم" تصور ان کو رکھ کر پڑھیں کہ ان کی نحوست اور شر سے نجات دے اور جو میرے حق میں بہتر ہو اللہ میاں وہ کردیں۔ آمین

صائمہ......فیصل آباد

ج مسئلہ نمبر 1۔ سورۃ طٰہٰ کی شروع کی 5 آیات ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ پڑھ کر دم کریں۔

نمبر 2:۔ فجر اور عشاء میں 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم بھی کریں اور پانی بھی پلائیں دم کیا ہوا۔

نمبر 3۔ رات کو جب سوجائے سرہانے کھڑے ہوکر 1 تسبیح "سورۃ العصر" کی پڑھیں اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اتنی آواز میں کہ اگر وہ جاگ رہی ہوتو سن سکے۔ نیت: راہ راست پہ آرہی ہے۔

رشتے کے لیے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 مرتبہ بعد نماز فجر اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ گھر کا کوئی بھی فرد پڑھ لے۔

خدیجہ......سرگودھا

ج۔ "یا سمیع" 313 مرتبہ بعد نماز عشاء اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔ نام کے معنی

ذہن میں رکھ کر پڑھیں تصور بھی کریں ٹھیک ہونے کا۔

ساجد.....شورکوٹ

ج:۔جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کردیں۔اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔

"لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف 1000 مرتبہ پڑھ کر پانی پہ دم کریں۔زیادہ سے زیادہ وہ پانی پلائیں پانی اس میں ملاتے بھی رہیں۔

رشتہ کے لیے:۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

عزیز فاطمہ   لانڈھی' کراچی

ج:۔بعد نماز فجر 3 مرتبہ سورۃ یٰسین 1 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر اپنے تمام مسائل کے لیے دعا کریں۔

شنیلا توصیف.....فیصل آباد

ج:۔رشتہ کے لیے بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ 1 مرتبہ پورا کلمہ پھر "لا الہ الا اللہ" 99 مرتبہ پھر محمد رسول اللہ اس طرح 3 تسبیح کرنی ہیں۔بعد نماز عشاء۔

بعد نماز فجر سورۃ یسین اور سورۃ المزمل کا معمول بنالیں۔ان شاء اللہ کاموں میں رکاوٹیں نہیں آئیں گی۔

جمیل.....ساہیوال

ج۔بعد نماز عشا سورۃ عبس 23 پارہ 3 مرتبہ پڑھیں بغیر بسم اللہ۔درود شریف کے ساتھ۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 70.74 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔وظیفہ خلوص اور یکسوئی کے ساتھ کریں ان شاءاللہ جلد خوش خبری ملے گی۔

نادیہ   گجرات

ج۔وظیفہ جاری رکھیں۔صدقہ بھی دیں (مرغی بکرا) نیت جو رکاوٹ ہے وہ ختم ہوجائے۔

مہوش "یا فتاح" روز 1 تسبیح کریں۔اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

آمنہ عوان   حیدرآباد

ج:۔بچیوں کے لیے:۔سورۃ الفاتحہ' سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس' 77 مرتبہ پڑھ کر دم کیا کریں صبح وشام۔

"یا عدل" 313 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔کیس کے لیے۔

ہر نماز کے بعد "یا ولی" 41 مرتبہ پڑھیں۔شوہر کے دل میں اپنی اور بچیوں کی الفت کا تصور رکھ کر۔

نادیہ طاہر.....گوجرہ

ج:۔"یا رئوف" 286 بار ہر نماز کے بعد پڑھ کر سب کے راضی ہونے کی دعا مانگیں۔3 ماہ تک۔

کمال فاطمہ   نیو کراچی

ج:۔"یا متعالی" ہر فرض نماز کے بعد 151 بار ورد کریں اور دعا کریں۔جلد کامیابی ہوگی۔

حنا ریاض   لاہور

ج۔آپ نماز کی پابندی کریں۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

نیت اور دعا یہ ہو کہ جہاں میرے حق میں بہتر رشتہ ہو وہاں ہو۔جلد از جلد۔ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ جلد حل ہوجائے گا۔وظیفہ پابندی اور خلوص کے ساتھ کریں۔ دوست نما دشمنوں سے بچیں عقل استعمال کریں۔

نسرین کوثر   لاہور

ج:۔تارا میرا تیل (کڑوا تیل) اس پر 11 مرتبہ سورۃ عبس (23 واں پارہ) پڑھ کر دم کریں روزانہ وہ تیل سر پر لگائیں۔

خوشبو سخن

عمراسرار

غزل

اس پار بیٹھی کوئل جو گانے چلی ہے
ناحق وہ دل کسی کا جلانے چلی ہے
شوخ سی کلی چپکے چپکے گنگنانے چلی ہے
ہے کوئی بات جو ہم سے چھپانے چلی ہے
گھٹا برسات کا سندیس لانے چلی ہے
بن میں لہر زندگی کی اسی بہانے چلی ہے
کھو کر سنہری شام کے نشیلے منظروں میں
مست ہوا برگ و بار ساتھ اپنے لہرانے چلی ہے
کیوں پھر بے چین سا ہونے لگا ہے میرا من
شاید پھر تری یاد ہمیں ستانے چلی ہے
رفتہ رفتہ چاندنی بھی دور ہوتی جا رہی ہے
بجھے بجھے تاروں کو بھی نیند سلانے چلی ہے
آؤ اب کے بھیگ جائیں اس میں ہم بھی
موسم کی آخری بارش بلانے چلی ہے
چل مرے دوست گھر کی ہی راہ لیں اب تو
اداس شام سیاہ چلمن گرانے چلی ہے

عصمت اقبال عین   منگلا ڈیم

غزل

گزر جائے گا یہ پل بھی آخر
وہ میرے جذبات سے کھیلے گا کب تک آخر
ایک دن تو اسے بھی احساس ہوگا آخر
جب نکلنے لگے گی میری جان آخر
ہم نے چاہا اسے جان سے بھی بڑھ کر
ہوگئی ہم سے یہی خطا آخر
جدا ہونے کا سبب تو نہیں معلوم
لیکن وہ ہوا ہم سے جدا آخر
غم تنہائی نے ہمیں جب آگھیرا
کیسے نہ ہوئی اس کو کوئی خبر آخر
نہ سوچا' نہ سمجھا' ہم نے کیا عشق فہد
کیا شاید یہی گناہ ہم نے آخر

محمد فہد.. مظفرگڑھ

غزل

آج کا دور عجب دور ہے
ہر ہنر مند بے ہنر لگتا ہے
دہشت کچھ ایسے چھائی ہے
باہر نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے
باغباں کی برق نوازی سے
ہر شجر بے ثمر لگتا ہے
کچھ سوچ کر نہیں آیا وہ
میری باتوں کا اثر لگتا ہے
تیز ہوا کا اثر تھا شاید
ٹوٹا جنگل کا ہر شجر لگتا ہے
صیاد کے نشانے پر وہی ہے
جو پرندہ بے بال و پر لگتا ہے

وسیم اختر.....راولپنڈی

سزا

بچپن میں
کھیل ہی کھیل میں
گڑیا جو ٹوٹی تھی مجھ سے
اس کی کرچیں آنکھوں میں چبھنے لگتی ہیں
میرے ہاتھوں اجڑے پرندوں کی فریادیں
کبھی کبھی میرا دل جلانے لگتی ہیں
ان بیتے لمحوں کا عذاب
راتوں کو ڈستا رہتا ہے
خنجر بن کے سینے میں اترتا رہتا ہے

اب میرا اپنا آپ
ان جلتے بجھتے لمحوں میں مرتا رہتا ہے

طاہرہ جبیں تارا ..... لاہور

غزل

بند کھڑکی کو کھولتی ہے ہوا
داغ دل کے ٹٹولتی ہے ہوا
شام ہوتے ہی میرے آنگن میں
تیرے لہجے میں بولتی ہے ہوا
خشک پتے مرے شکستہ خواب
جن کو قدموں سے رولتی ہے ہوا
کچھ کہی ان کہی کہانی سی
ہر دریچے سے بولتی ہے ہوا
بھیگے موسم میں کوئی آیا جمال
زلف شانوں پہ کھولتی ہے ہوا

شاعر: سمیع جمال..... کراچی

غزل

ہم اسیرِ بے حسی جب ہو گئے
جاگنے والے بھی آخر سو گئے
درد مندی دل سے اب جاتی رہی
اس قدر ہم سنگ دل کیوں ہو گئے
لوٹ کر آتے نہیں دیکھا انہیں
موت کی جو وادیوں میں کھو گئے
آنے والی نسل کو سے گی ہمیں
نفرتوں کے بیج گر ہم بو گئے
خون کی سرخی سے کچھ اہلِ جنوں
زندگی کے داغ سر سے دھو گئے
آ گئے اہلِ وفا میدان میں
نفرتوں کا سارا کچرا ڈھو گئے
متلاشی تجھے اجالوں کے قمر
کیا کریں ہم ظلمتوں میں کھو گئے

ریاض حسین قمر..... منگلا ڈیم ضلع جہلم

غزل

جلتے جلتے بجھ گئی ایک موم بتی ایک رات و
مر گئی فاقہ زدہ معصوم بچی ایک رات و
آندھیوں سے بچ نہ پائی پھول کو کانٹوں کی باڑ
صحن میں بکھری ہوئی تھی پتی پتی ایک رات کو
کتنا بوسیدہ دریدہ پیرہن ہے زیب تن
وہ جو چرخہ کاتتی رہتی ہے ایک لڑکی ایک رات کو
صحن میں ایک شور سا ہر آنگھ ہے حیرت زدہ
چوڑیاں سب توڑ دیں ایک دلہن نے پہلی رات کو
جب چلی ٹھنڈی ہوا ایک بچی ٹھٹھک کر رہ گئی
ماں نے اپنے لال کی تختی جلا دی ایک رات کو
وقت تو ہر ایک در پر دستکیں دیتا رہا
ایک ساعت کے لیے نہ جاگی بستی ایک رات کو
مرغزار شاعری میں گم رہا یوں ایسا شاعر
سو گیا واجد اور راہ تکتی رہ گئی ایک لڑکی رات کو

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی ..... ملیر، کراچی

تم بن اداس ہر پل

کب گلابوں کا چمن مانگا تھا
کب تم سے بہار مانگی تھی
ہم نے تو فقط دو پل کا تم سے ساتھ مانگا تھا
کہاں تم سے جاناں خوشیوں کے انبار مانگے تھے
چھوڑ کے جانے کی کب سے تمنا تھی تیری
کہ بس کسی کے بہکاوے میں
ہم کو چھوڑ بیٹھے ہو
برسوں کی شناسائی اور تعلق توڑ بیٹھے ہو
مگر سوچو ذرا جاناں گزرے پل کی یادوں کو
کہاں زندگی بھر کے لیے تم سے چین و قرار مانگے
تھے
دل کی نادانی تھی کچھ سپنے ضرور دیکھے تھے

مگر پھر بھی کیف اپنی راہ سے نہ بھٹکے تھے
بس گناہ تھا اتنا محبت کر بیٹھے تھے
بھلے تم مجھ کو چھوڑ دو جاناں
میرا دل توڑ دو جاناں
مگر اتنا سمجھ لینا تمہارے بن
ادھوری ہیں میری ذات کی خوشیاں

عبدالمالک کیف..... صادق آباد

غزل

اور کچھ نہ ملا ہمیں پھر رسوائیاں ملیں
تنگ تھیں چاہتیں ہمیں پھر جدائیاں ملیں
رہتے تھے زمیں پر آسماں کی تمنا میں
اونچائی کی تھی آرزو مگر گہرائیاں ملیں
محفل میں رہتے تھے ہم بجھے بجھے سے
بہت چاہا تھا کہ ہو دوست کوئی تنہائیاں ملیں
دیوانگی ہی تو ہے جو ڈھونڈتے میں رہے برسوں
انسان کی جگہ پھر ہمیں تو پرچھائیاں ملیں
مسلے گئے کچھ اس طرح پھول پاؤں تلے
تھا جن کا ہمیں انتظار وہ پھر نہ شہنائیاں ملیں
ملنے کو تو بہت ہی ملے تھے زمانے میں جاوید
کسی میں نہ پھر وہ ہمیں رعنائیاں ملیں

محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد

غزل

ابھی کرو میرے ساتھ کوئی بات پھر سو جانا
جب ڈھل جائے یہ رات تو پھر سو جانا
مدت سے پیاسا ہوں میں تیرے دیدار کا
جب بجھ جائے میری پیاس تو پھر سو جانا
کچھ تم ستاؤ ہم کو کچھ ہم ستائیں تم کو
کچھ ہو جائے بات پھر سو جانا
ابھی تو جاگ رہے ہیں یہ چاند ستارے
جب سو جائے یہ کائنات تو پھر سو جانا
ابھی کرو میرے ساتھ کوئی بات پھر سو جانا
جب ڈھل جائے یہ رات تو پھر سو جانا

محمد ندیم فراز..... بوریوالا

بند گلی

میرے حسن میں نامعلوم اداسی ہے
میری روح ان دیکھے دکھوں سے
تھک سی چکی ہے
میں ان سے فرار چاہتی ہوں
مگر
میرا ہر راستہ بند گلی میں کھلتا ہے
کائی زدہ جذبات کی اینٹوں سے بنی
بند گلی
جس میں کوئی روزنِ دیوار بھی نہیں
کہ
صبحِ نو کا پیغام آئے
میری ہر صدا اس کی اونچی دیواروں سے
ٹکرا کر
بازگشت کی صورت لوٹ آتی ہے
میں کرچی کرچی لہجے کے ساتھ
دعا گو ہوں رب سے
اس بند گلی میں کوئی تو آئے
جو میری تشنہ خواہشات کی
تکمیل کرے
میرے لیے مہکتی بہاروں کا پیغام لائے

ریحانہ سعیدہ ..... لاہور

غزل

عین ممکن ہے کسی روز گرا دی جائے
زندگی آنکھ کے رستے سے بہا دی جائے
جب تلک میں ہوں اجالوں کی ضمانت میری
اور مر جاؤں تو پھر لاش جلا دی جائے

تو نہیں میرے طریقے سے جو کٹنے والی
زندگی کیوں نہ تجھے آگ لگا دی جائے
میں مزاجاً بھی ہوں خاموش سمندر جیسا
سو میری خاک سمندر میں بہادی جائے
میں بھی تم عام سا مٹی سے بنایا ہوا ہوں
میری پوشاک پہ دستار جلا دی جائے
میرے شب زادیہ شب ایسے گزرنے کی نہیں
آج بچھڑے ہوئے لوگوں کو صدا دی جائے

میثم علی آغا

نظم

میں نے پریاں دیکھی ہیں
پربت کی اونچی چوٹیوں سے
وہ اُتر کر نیچے آتی ہیں
جھیل کے ساکن پانی میں
غوطہ خوری کرتی ہیں
پھیلا کر چودھویں رات کو پر
دامن پرنا جا کرتی ہیں
دن دہاڑے گلیوں میں
بے مقصد گھوما کرتی ہیں
پھر دریا کے نیلے پانیوں میں
وہ پاؤں دھونے آتی ہے
دریا کنارے جب دیکھو ان کو
اور ہاتھ بڑھاؤ چھونے کو
وہ جادو کی چھڑی لہراتی ہیں
اور چھومنتر ہو جاتی ہیں

نازسلوش ذشے   میرپور آزاد کشمیر

غزل

بے کمال اختیار کیا حلقۂ ارادت میں
اک غم یار نہیں تیری استطاعت میں
لغزش عشق سے دل ہوگا سرخرو مگر
بے باکی اظہار چاہیے شوق شہادت میں
منتظم زندگی ہے یوں خدود محبت سے
نہر رواں ہے کناروں کی رقابت میں
نظر کیا لگی حسن دل فریب کو!
مریض عشق رہتا ہے نقاہت میں
نہ دے طعنہ غم دنیا کا جان تمنا
تیرے خیال سے رہوں گا ملامت میں
باد خزاں سے ملے گا پیام رسوائی
ہاں قتل گلاب ہو ذوق شرارت میں
جو سو گیا حسرت یار سے تھک ہار کے
کل اٹھے گا پھر کسی چاہت میں!
مت آزمایئے انتہائے مجبوری ہے آپ
بہت یاد آؤں گا دور بغاوت میں
خیر مانگ دل مسافر کی اب شاہد
ہے قافلۂ آوارۂ منزل کی قیادت میں

سید عبداللہ شاہد۔ حیدرآباد

یوں چلتے چلتے!

کبھی کبھی یوں چلتے چلتے
بے نشان منزل کی طرف
پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں
آنکھ میں آنسو آ جاتے ہیں
منظر اوجھل ہو جاتے ہیں
بہت سے اپنے کھو جاتے ہیں
منزل پھر بھی نہیں ملتی
آنکھ میں پلتے سارے خواب
راکھ کی صورت ہو جاتے ہیں
تعبیر پھر بھی نہیں ملتی
روح تک زخمی ہو جاتی ہے
کبھی کبھی یوں چلتے چلتے
بے نشان منزل کی طرف

(اسماء سحر...... کراچی)

ذوقِ آگہی

عفان احمد

تعلیم و تربیت کے بیان میں

☆امام محمد غزالیؒ سے پوچھا گیا کہ آپ علم کے اس درجہ پر کیسے پہنچے؟ فرمایا جو بات معلوم نہ ہوتی اس کے سیکھنے اور معلوم کرنے میں کبھی ذلت اور شرم محسوس نہیں کی۔

☆تین چیزیں تین چیزوں کے بغیر باقی نہیں رہتی (۱) مال تجارت کے بغیر (۲) علم تکرار اور مذاکرہ کے بغیر (۳) حکومت انتظام کے بغیر۔

☆ایک بادشاہ نے اپنے بیٹے کو مکتب میں بٹھاتے وقت چاندی کی تختی پر یہ لکھ کر دیا کہ جور استاد بہتر از مہر پدر، یعنی استاد کی سختی باپ کی محبت سے بہتر ہے۔

☆جس اولاد کو بچپن میں ادب اور اخلاق نہ سکھایا جائے بڑے ہونے کے بعد اس میں بھلائی مشکل سے آتی ہے۔ سبز ٹہنی کو جیسا چاہو موڑ سکتے ہو، خشک ہو جانے کے بعد سیدھا کرنا مشکل ہے۔

☆اگر استاد بالکل نرم ہو تو لڑکے کھلاڑی بن جاتے ہیں، نرمی اور سختی دونوں ملی ہوئی اچھی ہے۔

☆جو لڑکا استاد کی سختی برداشت نہیں کرتا اسے زمانے کی سختی اٹھانی پڑتی ہے۔

☆علم حاصل کرنے کے لیے موم بتی کی طرح پگھلنا چاہیے اس لیے کہ بے علم آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا۔

☆بدذات پر تربیت کا اثر نہیں ہوتا جس طرح خراب لوہے پر قلعی کرنا بے کار ہے۔

☆جو لڑکا بری صحبت میں بیٹھتا ہے وہ اپنے لیے بھلائی چاہنے والا نہیں ہے، برے آدمی سے برائی کے سوا اور کیا سیکھنے کو ملے گا۔

☆دو آدمی فضول تکلیف اٹھاتے ہیں (۱) جس نے مال جمع کیا اور نہیں کھایا (۲) جس نے علم سیکھا اور عمل نہیں کیا۔ (اللھم احفظنا)

☆طالب علم میں ہمت اور صبر بھی ضروری ہے، عجلت اور بے صبری سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، علم سے دین اور دنیا کے کام درست ہوتے ہیں۔

محمد عارف ندیم..... لاہور

روزی کے بارے میں ارشادات

☆اگر عقل پر روزی کا مدار ہوتا تو احمق لوگ بلا روزی کے رہتے، مگر حق تعالیٰ بے وقوفوں کو اس طرح روزی پہنچاتا ہے کہ عقل مند حیران رہ جاتا ہے۔

☆میں نے ایک بزرگ سے سنا، انسان کی طبیعت کا تعلق جس طرح روزی کے ساتھ ہے اگر روزی دینے والے کے ساتھ ہو جائے تو مرتبہ میں فرشتہ سے آگے نکل جائے۔

☆(اے انسان!) جب تو بے ہوش، پوشیدہ منی کا قطرہ تھا تجھے اللہ رب العالمین نہ بھولے، تجھے جسم، روح، شکل، سمجھ، گویائی اور حواس عطا فرمائے۔ ہتھیلی میں دس انگلیاں بنائیں۔ تیرے کندھے میں دو ہاتھ بنائے، کیا اب تجھے روزی دینا بھول جائیں گے؟ یا للعجب!

☆روزی روزگار والا آدمی سکون سے خدا کی یاد کر سکتا ہے اور جس کی روزی کا ٹھکانہ نہ ہو اس کا دل پریشان رہتا ہے ایسا آدمی خدا کی کیا یاد کر سکے گا؟ پراگندہ روزی پراگندہ دل۔ روزی ہر ایک کی مقرر ہے مگر اس کے لیے حرکت اور محنت کرنا ضروری ہے (ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کو اسلام پسند نہیں کرتا)

☆اگر پیٹ کی مجبوری نہ ہوتی تو کوئی جانور شکاری کے جال میں نہ پھنستا بلکہ شکاری کو خود ہی جال بچھانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

افضل راحیل۔ کراچی

ایک ریاکار صوفی کا قصہ

ایک صوفی صاحب ایک بادشاہ کے مہمان ہوئے جب کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو جتنی خواہش تھی اس سے کم کھایا اور جب نماز کے لیے اٹھے تو (طول میں یا تعداد رکعات میں) اپنی عادت سے زیادہ نماز پڑھی۔ یہ سب اس لیے کیا تاکہ سب لوگ اس کے بارے میں نیکی کا گمان زیادہ کریں (اے دیہاتی شخص! میں ڈرتا ہوں کہ تم کعبہ تک نہ پہنچ سکو گے اس لیے کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو وہ ترکستان جاتا ہے اور کعبہ شریف تو ملک حجاز میں ہے)

جب وہ اپنے مکان پر آئے تو انہوں نے کھانا طلب کیا۔ ان کا بیٹا بہت سمجھ دار تھا اس نے عرض کیا۔ آپ نے بادشاہ کی مجلس میں کھانا کیوں نہیں کھایا؟ زاہد نے کہا۔ ان کے سامنے خواہش کے مطابق نہیں کھایا تاکہ بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کا میرے بارے میں اعتقاد بڑھ جائے اور یہ میرے کام آئے گا۔ بیٹے نے عرض کیا۔ نماز بھی لوٹا لیجیے کہ آپ نے خدا کی مرضی کے موافق نہیں پڑھی کہ آخرت میں کام آئے۔

فائدہ: ریاکاری سے پرہیز کرنا چاہیے یہ اعمال آخرت میں کام نہیں آئے گی اور بڑی رسوائی پڑے گی (اللھم احفظنا منہ)

مرسلہ: ایم افضل کاشمیری۔ کراچی

حکمت کی باتیں

☆ جب تک کام روپے پیسے سے نکلتا ہو جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

☆ جو کسی برے کو مارتا ہے مخلوق کو اس کی تکلیف سے اور اس کو اللہ تعالیٰ عذاب سے نجات دیتا ہے۔

☆ دو انسان ملک اور دین کے دشمن ہیں۔ (۱) وہ بادشاہ جس میں بردباری نہ ہو اور (۲) وہ عابد جس میں علم نہ ہو۔

☆ ملک عقل مندوں سے اور دین پرہیز گاروں سے کمال اور رونق پاتا ہے۔

گلہائے متفرقہ (مختلف ملفوظات)

☆ بزرگی عقل کی وجہ سے ہے نہ کہ عمر زیادہ ہونے سے ہے۔

☆ کمینوں کے ہاتھ سے ذلیل ہونا بڑی شرم اور ذلت کی بات ہے۔

☆ مہربانی اور درگزر اچھی چیز ہے مگر ظالم کے ساتھ نہیں اگر تو سانپ پر رحم کھا کر اسے چھوڑ دے تو یہ عام انسانوں پر ظلم ہوگا۔

☆ دوسروں کی غیبت سے اپنے بارے میں اچھا گمان ہوتا ہے جو مہلک ہے۔

☆ سارے انسان آپس میں ایک جسم کے اعضاء کی مانند ہیں اس لیے کہ ان کی پیدائش ایک ہی جبل (حضرت آدم علیہ السلام) سے ہے۔ جب ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو تو دوسرے اعضاء بھی اس کے غم میں شریک ہو جاتے ہیں اگر تجھے دوسرے کی تکلیف کا احساس نہ ہو تو پھر تجھے انسان کہنا غلط ہے۔

☆ حصول علم دین کی خدمت کے لیے ہے نہ کہ دنیا کمانے کے لیے ہے۔

☆ مال زندگی کی راحت و آرام کے لیے ہے نہ کہ زندگی مال جمع کرنے کے لیے ہے۔

شکیل احمد۔ نواب شاہ

دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری

ہوشیار آدمی کے نزدیک دنیا تنکے کے مانند ہے کہ ہر زمانہ میں دوسری جگہ ہے دنیا سے دل لگانا فضول۔ یہ پرائی ہے گویے کی طرح ہر روز نئے گھر میں ہے۔

ایسے دل بر کے ساتھ زندگی مناسب نہیں ہے جس کا ہر صبح نیا شوہر ہو کسی کو یہاں ہمیشہ رہنے کی امید نہیں ہے کیوں کہ یہ دنیا خود ہمیشگی کی جگہ نہیں ہے۔

اس دنیا کی محبت اور رنگ رلیوں میں دل مت لگانا سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہی ایک بات کافی ہے تھوڑے

دن کی اس زندگی پر فخر مت کر بلکہ سوچ سمجھ کر آخرت کے سفر کی تیاری میں مشغول رہ اس مسافر خانہ میں کس طرح دل لگ سکتا ہے احباب چلے گئے اور ہم راستہ میں ہیں۔

یہ حکومت عہدہ اور لشکر کا کوئی بھروسہ نہیں تجھ سے پہلے لوگ ہو گئے اور تیرے بعد بھی رہیں گے۔

اے بھائی! دنیا کسی کا ساتھ نہیں دیتی لہٰذا اپنے دل کو دنیا کے خالق و مالک کے ساتھ جوڑ لے۔

مرسلہ: عالیہ انصاری۔ کراچی

اسکندر رومی کی فتوحات کا راز

اسکندر رومی سے پوچھا گیا۔ آپ نے مشرق و مغرب کے ملکوں کو کس طرح فتح کیا؟ اس لیے کہ آپ سے پہلے بادشاہ آپ سے زیادہ خزانے، ملک، عمر اور لشکر رکھتے تھے مگر ان کو ایسی کامیابی حاصل نہیں ہوئی سکندر نے فرمایا۔ اللہ بزرگ و برتر کی مدد سے میں نے جس سلطنت پر قبضہ کیا اس کی رعیت کو ستایا نہیں اور پچھلے بادشاہوں کی خیرات کے طریقوں کو بند نہیں کیا اور ان بادشاہوں کا نام ہمیشہ بھلائی سے لیا برائی سے کبھی کسی کا تذکرہ نہیں کیا۔

ایک بے وقوف شاگرد

ایک پہلوان کشتی لڑنے کے فن میں کمال کو پہنچا ہوا تھا، تین سو ساٹھ داؤ اعلیٰ درجہ کے جانتا تھا۔ ہر روز ان داؤں میں سے ایک داؤ کے علاوہ سب داؤ اس شاگرد کو سکھا دیے۔ اس ایک داؤ کے سکھانے میں ٹال مٹول اور تاخیر کرتا رہا۔ خلاصہ کلام یہ کہ لڑکا طاقت اور کشتی کے فن میں کمال کو پہنچ گیا اور زمانہ میں کسی کو اس کے ساتھ مقابلہ کی طاقت نہیں تھی۔

بات اس حد تک پہنچی کہ ایک دن اس نے زمانہ کے بادشاہ کے سامنے یہ کہہ دیا۔ استاد کو مجھ پر جو فضیلت حاصل ہے وہ ان کے بڑا ہونے اور تربیت کے حق کی وجہ سے ہے ورنہ طاقت میں میں ان سے کم نہیں ہوں اور کشتی کے فن میں تو میں ان کے برابر ہوں۔ بادشاہ کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ حکم دیا کہ استاد اور شاگرد آپس میں کشتی کریں ایک کشادہ جگہ کشتی کے لیے مقرر کی گئی، سلطنت کے ارکان اور دربار شاہی کے خواص اور سب پہلوان اس میں حاضر ہوئے۔ لڑکا مست ہاتھی کی طرح آگے بڑھے میں ایسا حملہ کرتے ہوئے آیا کہ اگر استاد کی جگہ کانسی کا پہاڑ ہوتا تو وہ بھی اپنی جگہ سے ہل جاتا۔ استاد سمجھ گیا کہ لڑکا طاقت میں اس سے زیادہ ہے اور اسی عجیب داؤ سے جس کو چھپا رکھا تھا اپنے اس شاگرد سے الجھ گیا لپٹ گیا لڑکا اس کی کاٹ نہ جانتا تھا اس سے عاجز ہو گیا۔ استاد نے زمین سے اس کو اٹھایا اور سر کے اوپر لے جا کر زمین پر پٹخ دیا۔

خلقت میں شور ہو گیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ استاد کو خلعت اور مال دیا جائے اور اس شاگرد لڑکے کو بہت ڈانٹا اور ملامت کی کہ تو نے اپنے پالنے والے سے برابری کا دعویٰ کیا اور اس کو پورا کر کے نہ دکھایا۔ شاگرد نے عرض کیا۔ اے بادشاہ! استاد نے مجھ پر طاقت سے غلبہ نہیں پایا بلکہ کشتی کا ایک داؤ استاد نے مجھ سے چھپا کر رکھا تھا آج اسی داؤ سے مجھ پر غالب آ گیا۔ استاد نے کہا میں نے اسی روز کے لیے اس داؤ کو محفوظ کر رکھا تھا کہ عقل مندوں نے کہا ہے کہ دوستوں کو اتنی قوت مت دو کہ اگر وہ دشمنی کرنا چاہیں تو کر سکیں۔ ایک شخص نے (جس نے اپنے پالنے والے سے بے وفائی دیکھی تھی) کہا۔ جس نے علم تیر سے سیکھا اس نے آخر میں مجھ ہی کو نشانہ بنایا۔

فائدہ: شاگردوں کو ایسا سر پر نہ چڑھانا چاہیے کہ مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں۔

حسن اختر۔ کراچی

قسط نمبر 1

گنگا کا پجاری

اے حمید

جب بھی بارش اور جنگلات کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے ذہن میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پھر چمن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پیکر محترم اے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے۔ ان کے بارے میں نئے افق کے مدیر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ اے حمید بارش کی منظر کشی کرتے ہیں تو کمرے میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش نہایت پر شور برس رہی ہے اور جب وہ قہوہ کا ذکر کرتے ہیں تو قہوہ کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جادو گر تھے جو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔
زیر نظر ناول بھی اے حمید کا سفر نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایڈونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے فسانے بھی ملیں گے۔

بمبئی بڑودا ریلوے لائن بڑے گھنے جنگلوں میں سے گزرتی ہے۔ ان جنگلوں میں ایک ریلوے جنکشن آتا ہے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہاں سے ناگ پور اور کامٹی کے لیے ٹرین بدلنا پڑتی ہے۔ یہ میری جوانی کے آغاز کی آوارہ گردیوں کے زمانے کی بات ہے۔ اس زمانے میں ریل گاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے میں دو باتوں کا بہ طور خاص خیال رکھتا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ سامان بالکل ساتھ نہ ہو۔ اگر سامان ساتھ لے جانا ضروری ہو تو پھر ایسے سامان کو ترجیح دی جائے جو کوٹ پتلون یا بش شرٹ کی جیبوں میں آسکے۔ مثلاً ٹوتھ برش، کنگھی، چاقو وغیرہ۔ دوسری بات جس پر میں بڑی سختی سے عمل کرتا تھا یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی کوشش کی جائے۔ کئی بار پکڑا بھی جاتا۔ ٹی ٹی بس اتنی سزا دیتے کہ جہاں پکڑتے وہیں ٹرین سے نیچے اتار دیتے۔ ایک بار بھوپال کے اسٹیشن پر پکڑا گیا تو وہیں اتار دیا گیا بلکہ ٹی ٹی نے ایک قلی کی نگرانی میں مجھے اسٹیشن سے باہر نکلوا دیا۔ میں بڑا خوش ہوا کہ اس طرح بھوپال شہر دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ کچھ دیر تک شہر کی آوارہ گردی کرنے کے بعد میں ریلوے یارڈ کی طرف سے لائنوں پر چلتا پلیٹ فارم پر آ گیا اور دوسری گاڑی میں بغیر ٹکٹ سوار ہو کر آگے روانہ ہو گیا۔ ایک بار بمبئی سے بغیر ٹکٹ آتا ہوا برہان پور کے اسٹیشن پر اتار دیا گیا۔ وہاں سے بھی دوسری گاڑی میں بیٹھ کر سفر جاری رکھا۔ ٹی ٹی مجھ سے کرایہ چارج کرتے مگر میرے پاس چھ سات روپے ہی ہوتے تھے۔ کچھ مجھے بھولا بھالا سا لڑکا دیکھ کر بھی انہیں مجھ پر ترس آ جاتا تھا اور پولیس کے حوالے نہیں کرتے تھے۔ بس ٹرین سے اتار دیتے تھے۔ میرے لیے یہ کوئی سزا نہیں ہوتی تھی۔ مجھے کسی جگہ ضروری پہنچنا تو ہوتا نہیں تھا۔ دن کے وقت ٹرین سے اتارا جاتا۔ دوپہر کو یا شام کو دوسری ٹرین پکڑ لیتا۔

یہ سن ۴۴۔۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میں بمبئی بڑودا ریلوے لائن پر سفر کر رہا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ دن کی روشنی شام کے ملگجے اندھیروں میں بدل رہی تھی۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ گوالیار سیکشن میں بارش بھی ہوئی تھی۔ آگے آ کر بارش رک گئی تھی۔ میں

نے ٹھنڈی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ بش شرٹ قسم کی آدھے بازوؤں والی قمیص تھی۔ پاؤں میں فلیٹ شوز تھے۔ میں اب گھر سے بھاگتا تھا تو اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرتا تھا کہ میرے پاؤں میں فلیٹ شوز ضرور ہوں۔ امرتسر میں اپنے پاس ایک فلیٹ شوز کا جوڑا فرار کے لیے ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔

ٹرین بڑودا اسٹیشن کی ریلوے لائن پر بڑی تیز رفتاری سے دوڑتی جا رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے میرے بالوں کو اڑا رہے تھے۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر شام کے سرمئی دھندلکوں میں غائب ہوتے درختوں اور ندی نالوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آگے وہی ریلوے جنکشن آ رہا تھا جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور جہاں سے ناگ پور اور کامٹی جانے کے لیے گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی پھر ٹرین کی دونوں جانب کارخانوں اور مکانوں کی روشنیاں شروع ہو گئیں۔ آخر ٹرین جنکشن کے بہت بڑے ریلوے یارڈ میں دھڑ دھڑاتی ہوئی داخل ہو گئی۔

میں کھڑکی سے سر باہر نکالے ریلوے لائن پر گاڑی کو ٹریک بدلتے دیکھ رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”ٹکٹ، ٹکٹ“

میں وہیں سہم گیا۔ اس آواز سے میرے کان بڑی اچھی طرح شناسا تھے۔ یہ ٹی ٹی کی آواز تھی جو خدا جانے پیچھے کون سے اسٹیشن سے ساتھ والے ڈبے میں سوار ہو گیا تھا اور اب چلتی ٹرین میں ایک ڈبے کے دروازے سے دوسرے ڈبے کے دروازے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ خاکی وردی والا ٹکٹ چیکر ایک لالہ جی کا ٹکٹ چیک کر کے اسے واپس کر رہا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق میں نے ڈبے میں سے فرار ہونے کا جائزہ لیا۔ اگر ٹرین کھیتوں میں سے گزر رہی ہوتی تو میں ضرور کھڑکی میں سے باہر کود جاتا مگر ٹرین ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی جہاں چاروں طرف ریل کی پٹریوں کا جال بچھا تھا اور جگہ جگہ کانٹا بدلنے والے ہینڈل لگے تھے۔ اگرچہ گاڑی کی رفتار تیز نہیں تھی مگر ڈبے سے کودنا خطرناک تھا۔ آخر میں نے اسی طریقے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا جس پر میں اکثر عمل کیا کرتا تھا۔ جب ٹکٹ چیکر نے مجھ سے ٹکٹ مانگا تو میں نے بڑا بھولا سا چہرہ بنا کر کہا۔

میں نے ٹکٹ لیا تھا جی۔ کسی نے میری جیب سے نکال لیا ہے۔ ساتھ گیارہ روپے تھے وہ بھی نکال لیے ہیں۔

ٹکٹ چیکر پر میرے جھوٹ کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ ”ٹکٹ کی رقم بمع جرمانے کے نکالو۔“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس تو صرف تین روپے کچھ آنے ہیں جی۔“

”ٹھیک ہے۔“

ٹکٹ چیکر نے لوہے کی سلیٹ والی کاپی بند کر کے جیب میں ڈالی اور میرا بازو اپنی مضبوط گرفت میں لے کر بولا۔

”تمہیں دوسری ٹرین کی سیر کراتا ہوں۔“

اس ستم ظریف ٹی ٹی نے جب ٹرین اسٹیشن پر رکی تو مجھے ایک دوسرے ٹکٹ چیکر کے حوالے کر دیا جو مجھے پکڑ کر ناگ پور جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ وہ اسی ریلوے لائن کا ٹی ٹی تھا۔ مجھے گارڈ کے ڈبے میں بٹھایا گیا۔ ٹی ٹی بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی ناگ پور یا خدا جانے کامٹی کی طرف چل پڑی۔ شہر کی روشنیاں پیچھے رہ گئیں۔ گاڑی اندھیرے میں جنگلوں اور کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ چلتی گاڑی کے شور میں مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔ ڈبے کے اندر روشنی تھی۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی

تھی۔ یہ رن تھرو ٹرین تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ٹی ٹی مجھے کہاں لیے جا رہا ہے۔ اتنے میں گاڑی کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ گارڈ نے دروازے میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا اور پھر لالٹین کا سرخ روشنی والا حصہ جس طرف گاڑی جا رہی تھی اس طرف کر کے ہلانے لگا۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلتی رک گئی۔ تب ٹی ٹی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھایا اور بولا۔

''چلو نیچے اتر جاؤ۔''

میں تو حیران ہو کر رہ گیا کہ یہ شخص مجھے کہاں اتار رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے' کون سا اسٹیشن ہے؟''

''چلو نیچے اترو۔''

وہ مجھے کھینچتا ہوا ڈبے کے دروازے تک لایا اور باہر دھکیلنے لگا۔ میں سوائے نیچے اترنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نیچے ریلوے لائن کے پتھروں پر گرتے گرتے بچا۔ گاڑی کے پہیے چرچرائے اور گاڑی آہستہ آہستہ آگے چل پڑی۔ میں ریلوے لائن کے پاس کھڑا حسرت سے چلتی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ گارڈ ڈبے کے دروازے میں کھڑا اب لالٹین کی سبز روشنی ہلا رہا تھا۔ گاڑی نکل گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ٹرین کی آخری بوگی کی سرخ روشنی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔

میں دل میں ٹی ٹی کو گالیاں دیتا ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ یہاں ٹرین آہستہ ہوئی تھی اور گارڈ نے لال اور سبز بتی بھی دکھائی تھی۔ ضرور یہاں مزدور ریلوے لائن کی مرمت وغیرہ کر رہے ہوں گے مگر یہ لوگ رات کو مرمت کا کام نہیں کیا کرتے۔ پھر یہاں گاڑی کیوں آہستہ ہوئی تھی؟ یہی سوچتا ہوا میں آگے کی طرف لائن کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ آسمان پر بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ خدا کا بڑا کرم تھا کہ بارش تیز نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے اندھیرے میں لال بتی نظر آئی۔ ذرا آگے گیا دیکھا کہ ریلوے لائن سے نیچے ایک طرف کھمبے کے ساتھ سرخ روشنی والی لالٹین لٹک رہی تھی۔ کھمبے کے پاس چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی کے اندر بھی لالٹین کی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔

جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جیسے بدک گیا اور بولا۔

''کون ہے بے تو دھت''

میں نے جلدی جلدی اسے اپنی رام کہانی سنا ڈالی اور اس سے پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور آگے کون سا شہر ہے۔ وہ آدمی جھونپڑی کے دروازے میں آ گیا تھا اور مجھے ایک ہاتھ سے پیچھے دھکیل رہا تھا۔

''آگے جاؤ آگے۔ بھوجار والی قصبہ آئے گا۔ جاؤ وہاں جاؤ۔''

وہ ظالم شخص مجھے وہاں سے دھکے دے دے کر آگے کا راستہ بتا رہا تھا۔ میں چلنے لگا تو بولا۔

''آگے ندی کا پل ہے۔ جنگلے کے ساتھ ساتھ چلنا۔ پل کمزور ہے۔''

یہ بات اس نے اپنی مدھیہ پردیش کی دیہاتی بولی میں کہی تھی۔ میں اس کے جملوں کو صاف اردو میں لکھ رہا ہوں۔ اندھیری رات' بارش کی پھوار' بجلی کی چمک' خدا جانے کون سا جنگل تھا۔ کون سی ندی تھی۔ وہ ندی نہیں بلکہ دریا تھا۔ اگرچہ اس کا پاٹ چوڑا نہیں تھا کیونکہ وہ پہاڑی علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ آگے جانے کے لیے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تھوڑا اطمینان ہوا تھا کہ آگے کوئی قصبہ ہے جہاں کسی نہ کسی جگہ رات بسر کی جا سکتی ہے۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ ایک جنگلہ دکھائی دیا۔ ریل کی پٹڑی اور جنگلے کے درمیان چھوٹا سا راستہ بنا ہوا تھا۔ میں جنگلے کو پکڑ کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ مجھے نیچے پانی کا شور سنائی دیا۔ ایک بار تو میرے بدن میں

خوف کی لہر دوڑ گئی۔ میرے نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ اندھیرے میں مجھے دریا کا پانی دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر جس طرح اس کی آواز آ رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیچے کافی گہرائی میں چٹانوں سے ٹکراتا بہہ رہا ہے۔

میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جنگلے کو پکڑ کر بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے میں پل کی دوسری طرف پہنچا۔ اب مجھے اس بھوجروالی یا بھوجاوالی قصبے کی تلاش ہوئی۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ رات کا وقت' گھٹا ٹوپ اندھیرا' کالی گھٹا' بارش کی پھوار' سوائے آس پاس کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ بھوتوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ خدا کے بھروسے میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایک خوف مجھے یہ بھی تھا کہ کوئی سانپ نہ ڈس لے۔ ان جنگلوں میں سانپ بھی بہت ہوتے ہیں جو برسات کے دنوں میں باہر نکل آتے ہیں۔ کافی دیر تک میں چلتا رہا۔ ایک جگہ روشنی جھلملاتی ہوئی نظر آئی۔ یہ روشنی بائیں جانب اندھیرے میں ٹمٹما رہی تھی۔ میں ریلوے لائن سے اتر آیا۔ بڑی مشکل سے جھاڑیوں کے درمیان ایک پتلی سی پگڈنڈی مل گئی۔ یہ پگڈنڈی ناریل کے درختوں کے نیچے سے ہوتی ایک ٹیلے کے پاس نکل آئی جو روشنی مجھے رات کے اندھیرے میں ریلوے لائن سے نظر آئی تھی وہ بجلی کے ایک بلب کی تھی جو ایک پھاٹک کے اوپر جل رہا تھا۔ پھاٹک کا دروازہ کھلا تھا۔ دیوار کو جنگلی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اندر نگاہ ڈالی۔ چھوٹا سا احاطہ تھا۔ ایک طرف چھپر کے نیچے گائے بیٹھی ہوئی تھی۔ درمیان میں اونچے چبوترے پر ایک کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کی چھت مخروطی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ کوئی مندر تھا۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے مندر میں نے جنگلوں اور دور افتادہ دیہات میں اکثر دیکھے تھے۔ ایک دم سے بجلی چمکی اور بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ میں دوڑ کر چھپر کے نیچے گائے کے پاس چلا گیا۔ مندر کی کوٹھڑی سے کسی نے آواز دی۔

''کون ہو؟''

یہ عورت کی آواز تھی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں کون ہوں۔ عورت نے پھر آواز دی۔ میں نے کہا مسافر ہوں۔ رستہ بھول گیا ہوں۔ ایک عورت کو میں نے کوٹھڑی سے باہر نکلتے دیکھا۔ پھاٹک کے بلب کی ہلکی سی روشنی وہاں تک آ رہی تھی۔ عورت گیروی ساڑھی میں تھی۔ اس کے بال کھلے تھے اور شانوں پر گرے ہوئے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ کوئی چڑیل نہ ہو۔

''یہاں آ جاؤ۔''

میں ڈرتا ڈرتا اس کی طرف گیا۔ وہ دروازے کے ایک طرف ہٹ گئی۔

''مینہ میں کیوں بھیگتے ہو۔ اندر آ جاؤ۔''

کوٹھڑی چھوٹی سی تھی۔ بجلی کا چھوٹا سا بلب اندر بھی روشن تھا۔ ایک جانب دیوار میں ہنومان کا بت رکھا تھا جس پر سیندور ملا ہوا تھا۔ زمین پر چٹائی بچھی تھی۔

''لڑکے! تم ادھر کے نہیں ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟ ادھر جنگل میں کیسے نکل آئے؟''

یہ جوگن قسم کی عورت بھی اس علاقے کی دیہاتی بولی میں بات کر رہی تھی۔ میں اس کے جملے صاف اردو میں لکھ رہا ہوں۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ پنجاب کا ہوں' ٹرین میں بغیر ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔ ٹی ٹی نے جنگل میں اتار دیا۔ جوگن کی عمر چالیس پینتالیس کے قریب ہوگی' رنگ کالا تھا۔ آنکھوں میں کسی وقت شرتی چمک سی پیدا ہو جاتی تھی۔ میرے دل میں خوف سا پیدا ہو رہا تھا کہ یہ عورت کہیں چڑیل نہ نکل آئے۔ میں نے نظر بچا کر اس کے پیروں کو دیکھا وہ سیدھے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ چڑیل کے پیر الٹے ہوتے ہیں۔ کوٹھڑی میں

سیندور اور لوبان کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کا ایک دروازہ کھلا تھا جس میں سے برسات کی رات کی ہوا اندر آرہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا کہ بمبئی جانے والی گاڑی یہاں کہاں سے ملے گی۔ جوگن چٹائی پر جو میلا سا سرہانہ پڑا تھا اس کے نیچے ہاتھ ڈالے کچھ ٹٹول رہی تھی پھر اس نے سرہانے کے نیچے سے ٹین کی گول ڈبی نکال کر کھولی۔ اس میں کالے رنگ کی تین چار گولیاں پڑی تھیں۔ ایک گولی نکال کر اس نے ہتھیلی پر رکھی اور اسے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے مسلنے لگی۔ اس نے میرے سوال کو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ پھر اس نے چٹائی کے کنارے زمین پر پڑی ہوئی مٹی کی ایک چھوٹی سی چلم اٹھا کر کالی گولی کا برادہ چلم میں رکھا۔ چلم کے ساتھ ایک میلی کچیلی لیر لٹک رہی تھی۔ ماچس کی تیلی جلا کر کالے برادے کو دکھائی اور کپڑے کی لیر یا لٹکتی ہوئی دھجی کو ہتھیلی میں لپیٹ کر منہ کے ساتھ لگایا اور زور زور سے کش لگانے لگی۔ چلم میں سے بار بار شعلہ نکلنے لگا۔ جوگن کے منہ سے دھواں نکل نکل کر کوٹھڑی میں پھیلنے لگا۔ اس دھوئیں میں عجیب سی بو تھی۔ یہ تمباکو کی بو نہیں تھی۔ چلم کے اوپر تلے چھ سات کش لگانے کے بعد ہنومان کی مورتی کی طرف دیکھ کر منہ سے کوئی اشلوک بولا اور چلم دیوار کے ساتھ لگادی۔ اب میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ کہنے لگی۔

"ممبئی میا کا شہر یہاں سے بڑی دور ہے۔ وہاں جا کر کیا کرو گے۔ ہنومان جی کے چیلے بن کر میرے پاس رہ جاؤ۔ میں تم سے وواہ کرلوں گی۔"

اس نے چلم میں رکھ کر جو کچھ پیا تھا اس کا اسے نشہ چڑھ گیا تھا۔ وہ بار بار اپنا سر دائیں بائیں جھلانے لگی۔ پھر چلم اٹھا کر میری طرف بڑھا کر بولی۔

"لو تم بھی گانجا پیو۔"

میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے مجھے گردن سے پکڑ لیا۔

"تو آج سے ہنومان جی کا چیلا ہے۔ جے پون پتر کی۔"

میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور میں اپنی گردن چھڑا کر دروازے کی طرف بھاگا۔ چبوترے کی سیڑھیاں اترنے کی بجائے میں نے اوپر ہی سے چھلانگ لگادی۔ میں بارش اور رات کے اندھیرے میں بھاگتا ہوا احاطے کے پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ مجھے اپنے پیچھے اس جوگن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ خدا جانے وہ کیا بول رہی تھی۔ میں بارش اور اندھیرے میں ریلوے لائن کو جاتی پگڈنڈی پر بھاگتا چلا گیا۔ آخر ریلوے لائن پر آکر دم لیا۔ میں نے لائن کے ساتھ ساتھ آگے کی جانب اندھیرے میں جتنا تیز چل سکتا تھا چلنا شروع کردیا۔ لائن کے ارد گرد بکھرے ہوئے پتھر میرے پاؤں میں فلیٹ شوز کے اندر چبھ رہے تھے۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ عورت چڑیل تھی۔ دور ریلوے سگنل کی لال بتی نظر آئی۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے سگنل کی لال بتی تیز ہوگئی۔ میں سمجھ گیا کہ میرے پیچھے سے کوئی ٹرین آرہی ہے۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ دریا کے پل کے قریب آکر ٹرین کی رفتار بہت سست ہوجائے گی۔

☆☆☆

اگر میں دریا کے پل کے نزدیک ہوتا تو گاڑی میں سوار ہوسکتا تھا۔ مگر میں پل کو کافی پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ مجھے ریلوے انجن کی سیٹی سنائی دی۔ میں ریلوے لائن سے نیچے اتر آیا۔ اور ایک درخت کے نیچے آکر بارش سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ دور سے انجن کی روشنی دکھائی دی۔

روشنی کافی دیر تک ویسے ہی ٹمٹماتی نظر آتی رہی جیسے ایک جگہ ساکت ہوگئی ہو پھر روشنی کا دائرہ بڑا ہوتا گیا اور انجن کی چیخ سنائی دی۔ شاید انجن ڈرائیور نے مجھے ریلوے ٹریک کے قریب کھڑے دیکھ لیا تھا۔ روشنی اب بڑی تیزی سے قریب آرہی

تھی۔ میں جھاڑیوں کے ساتھ لگ گیا اور پہلے انجن اور پھر ٹرین کے ڈبے شور مچاتے زمین ہلاتے دھڑ دھڑاتے گزرنے لگے۔ ہوا اور بارش کے تیز چھینٹے مجھ پر پڑنے لگے۔ میں جھاڑیوں کے ساتھ لگ کر کھڑا حسرت بھری نگاہوں سے ٹرین کے ڈبوں کی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔

ٹرین نکل گئی تو میں نے ایک بار پھر بارش میں چلنا شروع کردیا۔ مجھے سردی لگنے لگی تھی دور جہاں ریلوے سگنل تھا اس کی بتی دوبارہ سرخ ہوگئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہاں ریلوے پھاٹک ہوگا اور پھاٹک والے کی جھونپڑی بھی ہوگی۔ جہاں میں بارش سے پناہ لے سکوں گا۔ میں چلتے چلتے بارش میں بھیگتا رات کے اندھیرے میں سگنل کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہاں کوئی پھاٹک وغیرہ نہیں تھا۔ مجھ پر شدید مایوسی طاری ہونے لگی۔ ریلوے لائن زمین سے پانچ سات فٹ اونچی تھی۔ میں نیچے اتر آیا۔ میں اب کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں کم از کم بارش سے مجھے نجات مل جائے۔ اس اندھیری رات میں بائیں جانب مجھے ایک اونچی چٹان کا ہیولا سا دکھائی دیا۔ میں جھاڑیوں اور پانی میں سے گزرتا چٹان کے قریب آیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا جس کا اوپر کا حصہ ایک جانب سے اس طرح باہر کو نکلا ہوا تھا کہ ایک چھجا سا بن گیا تھا۔ میں اس کے نیچے ہو کر ٹیلے کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ مجھے بارش سے نجات مل گئی تھی۔ میرے کپڑے گیلے ہو رہے تھے۔ اس سنگدل ٹی ٹی کو میں دل سے بڑی گالیاں دے رہا تھا جس نے مجھے ٹرین سے نیچے اتار دیا تھا۔ بارش کی بوچھاڑ کا رخ ٹیلے کے عقب میں تھا۔ میں بارش سے بچا ہوا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ مجھے کسی آواز آئی جیسے کوئی دوڑ کر ٹیلے سے نیچے اترا ہو۔ میں نے سانس روک لی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

میں اندھیرے اور بارش میں آنکھیں کھول کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ بارش اب ہلکی ہوگئی تھی۔ مجھے وہاں کوئی آدمی یا جانور نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر میں نے ٹیلے کے اوپر سے کسی انسانی قدموں کی تیزی سے نیچے اترنے کی آواز بڑی واضح طور پر سنی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ میرا وہم ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد بارش بالکل رک گئی جہاں میں بیٹھا تھا وہ جگہ گیلی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہاں سے کوئی سانپ بچھو نہ نکل آئے۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ آگے ضرور کوئی نہ کوئی اسٹیشن آجائے گا اور میں وہاں اور کچھ نہیں تو کسی چھپر کے نیچے رات گزار سکوں گا اور وہاں سانپ بچھو کا ڈر بھی نہیں ہوگا مجھ پر یہ خوف بھی طاری تھا کہ کسی طرف سے کوئی آدم خور شیر نکل کر مجھ پر حملہ نہ کردے۔ یہ مدھیہ پردیش کے جنگلوں کا علاقہ تھا اور میں نے ان جنگلوں کے آدم خور شیروں کے بارے میں بڑی لرزہ خیز کہانیاں رسالوں میں پڑھ رکھی تھیں اب سردی سے بھی میرے دانت بج اٹھتے تھے اگر میرے کپڑے بارش کے پانی سے شرابور نہ ہوتے تو مجھے اتنی سردی نہ لگتی۔

میں ٹیلے کی چھت سے نکلا اور کمر تک آئی ہوئی گھاس میں سے گزرنے لگا۔ گھاس میں ٹخنوں تک پانی کھڑا تھا۔ آخر میں ریلوے لائن پر چڑھ گیا آگے چلنے لگا۔ ریلوے ٹریک پر میرے خیال کے مطابق سانپ بچھو کا خطرہ کم تھا۔ آسمان پر اسی طرح کالے بادل چھائے ہوئے تھے بجلی بھی نہیں چمک رہی تھی۔ ریلوے لائن اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی صرف تین چار فٹ تک مجھے نظر آرہا تھا مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ اس نیم پہاڑی علاقے میں چھوٹے اسٹیشن بھی کافی فاصلے پر بنائے گئے ہیں۔ چلنے سے سردی کا احساس بھی کم ہوگیا تھا میرا پروگرام یہی تھا کہ اب رکنا نہیں چلتے چلے جانا ہے کسی نہ کسی جگہ تو کوئی

دیہاتی ریلوے اسٹیشن آئے گا ہی وہاں سے میں کوئی پسنجر ٹرین بھی پکڑ سکتا تھا' اندھیرے میں دیکھنے کی میری نظریں اب عادی ہو چکی تھیں' میں نپی تلی رفتار کے ساتھ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا' کافی دیر تک چلنے کے بعد مجھے سامنے ایک پل کے آہنی جنگلے کا ہیولا سا نظر آیا۔ یہ پل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہ پل کسی ندی پر بنایا گیا تھا۔ پہاڑی علاقے کی ندیوں پر پل دونوں سروں کے پتھروں کی مضبوط بنیادوں پر بنائے جاتے ہیں اور چھوٹی ندی پر بھی بنا ہوا پل بڑا لگتا ہے اس قسم کے پل میں نے سینٹرل انڈیا کے پہاڑی علاقوں میں بہت دیکھے تھے۔ دریاؤں پر بنے ہوئے پل بہت بڑے ہوتے ہیں اور ان نیم پہاڑی علاقوں کے یہ پل انجینئرنگ کے کمال کا نمونہ ہوتے ہیں' پل پر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لوہے کی پٹڑیاں ڈال کر پیدل چلنے کے لیے چھوٹا سا راستہ بنا دیا گیا تھا۔ میں پل پر چڑھ گیا پل کا جنگلا آہنی گارڈروں کی قینچیوں کی شکل کا بنا ہوا تھا میں نے گارڈروں کی قینچی میں سے نیچے جھانک کر دیکھا مجھے اندھیرے میں پانی کی بھوری سطح نظر آئی' یہ دریا نہیں تھا' ندی تھی' میں ابھی ندی کے پانی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں پھر ٹارچ کی روشنی چمکی کسی نے ریلوے ٹریک پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تھی۔ میں وہیں کھڑا رہا اور جس طرف ٹارچ کی روشنی ہوئی تھی اس طرف دیکھنے لگا۔ انسانوں کی آواز کے ساتھ ہی مجھے اندھیرے میں دو تین انسانوں کے سائے دکھائی دیئے جو ریلوے لائن پر کھڑے تھے۔ ٹارچ کی روشنی پھر جلی۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ لوگ ریل کی پٹڑی پر کوئی شے ڈھونڈھ رہے ہیں پھر ٹارچ کا دائرہ پٹڑی پر ایک جگہ رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی کدال چلنے کی آواز آئی پہلے مجھے خیال آیا کہ شاید یہ ریلوے کے آدمی ہیں اور ریلوے لائن کی مرمت کا کام کرنے آئے ہیں پھر خیال آیا کہ ریلوے کے ملازم آدھی رات کے وقت یہ کام نہیں کیا کرتے' اتنے میں ایسی آواز آئی جیسے پٹڑی کی فش پلیٹ اکھاڑ کر ایک طرف پھینکی گئی ہو ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں یہ لوگ تخریب کار نہ ہوں جو چلتی ٹرین کو گرانے کے لیے لائن کی فش پلیٹیں اکھاڑ رہے ہیں۔

مجھ پر ان لوگوں کا خوف طاری ہو گیا میں ذرا پیچھے ہٹا تو میرے پاؤں کے نیچے سے ایک چھوٹا سا پتھر پھسل کر ندی میں جا گرا' اس کی آواز پیدا ہوئی تو انسانی سائے کام کرتے کرتے رک گئے۔ کدال کی آواز بھی بند ہو گئی دوسرے لمحے پل پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا' ایک آدمی نے چلا کر کچھ کہا اور پھر وہ سب میری طرف دوڑ پڑے۔ ان میں سے کسی نے پستول کا فائر بھی کر دیا' یقیناً یہ فائر مجھ پر کیا گیا تھا' میں لائن کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے چھوٹے سے راستے پر اندھیرے میں دوڑنے لگا۔ ایک اور فائر ہوا۔ گولی میرے سر کے اوپر لوہے کے گارڈر سے ٹکرائی تو بڑا دھماکہ ہوا' وہ لوگ ٹارچ کی روشنی برابر مجھ پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں انہیں دوڑتا نظر آ رہا تھا۔ موت مجھے اپنے پیچھے قدموں کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ میں زیادہ دیر تک نہ دوڑ سکوں گا یہ لوگ پل پار کرنے سے پہلے ہی مجھے دبوچ لیں گے۔ کیونکہ میں نے انہیں ریلوے کی پٹڑی اکھاڑتے دیکھ لیا ہے اس لیے وہ ایک عینی گواہ کو کسی حالت میں بھی زندہ نہیں چھوڑ سکتے۔ پیچھے سے پستول کا تیسرا فائر ہوا تو میرا ایک کان سن ہو گیا مجھے لگا کہ گولی نے میرا کان اڑا دیا ہے میں نے دہشت زدہ ہو کر لوہے کے گارڈروں کے درمیان سے نیچے ندی میں چھلانگ لگا دی۔

میں ندی کے ٹھنڈے پانی میں گرا اور نیچے تک چلا گیا۔ نیچے میرے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے پتھروں

سے ٹکرائے۔ پل زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اگر زیادہ اونچا ہوتا تو میں ان پتھروں سے ٹکرا کر ضرور زخمی ہو گیا ہوتا۔ پانی کے اندر مجھے باہر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' میں غوطہ لگا کر پانی کے اندر ہی اندر جس قدر سانس روک کر آگے نکل سکتا تھا نکل گیا۔ کچھ تیز رفتار پہاڑی ندی کا بہاؤ بھی مجھے آگے لے جا رہا تھا جب میرا سانس ختم ہو گیا تو میں نے پانی سے سر باہر نکالا' اور گردن موڑ کر پیچھے دیکھا پل کی طرف گھپ اندھیرا تھا کچھ نظر نہ آیا نہ کوئی آواز سنائی دی' یہاں ندی ایک ٹیلے کا موڑ کاٹ رہی تھی میں ندی کے ساتھ ہی ٹیلے کا موڑ کاٹ کر دوسری طرف نکل آیا۔ ندی یہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ اس کا بہاؤ بھی کافی تیز ہو گیا تھا' ندی زیادہ گہری نہیں تھی' چونکہ مجھے تیرنا آتا تھا اور تیرنا مجھے بچپن میں ہی میرے والد نے سکھا دیا تھا اس لیے مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ سوائے اس کے کہ میرے کپڑے پھرے بھیگے بلکہ شرابور ہو گئے تھے لیکن میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ میری جان بچ گئی تھی۔

آگے جا کر ندی پہاڑیوں سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئی' اندھیرے میں ندی کی دونوں جانب کے درخت سیاہ بھوتوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میں جلدی جلدی تیر کر ندی سے باہر نکل آیا اور وہیں بیٹھ کر سانس لینے لگا۔ دوبارہ سردی لگنے لگی تھی۔ میں نے قمیص پتلون اتار کر انہیں اچھی طرح سے نچوڑا اور دوبارہ پہن لیا۔ میرے سگریٹ گیلے ہو کر ختم ہو گئے تھے میں نے انہیں ڈبی کے اندر ہی پڑا رہنے دیا۔ سگریٹ خیر سے میں نے آٹھویں جماعت سے ہی پینے شروع کر دیئے تھے۔ میرا اسکول کا ایک ہم جماعت چھپ کر سگریٹ پیا کرتا تھا اس سے مجھے بھی لگ گئے تھے۔ چاندی کے دو چار روپے اور کچھ آنے دونیاں پتلون کی جیب میں ٹوتھ برش کے ساتھ محفوظ پڑی تھیں۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا اندھیرے میں کچھ بھی پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا' اتنا ضرور معلوم ہو رہا تھا کہ پہاڑیاں دور دور چلی گئی ہیں اور آگے میدان اور کھیت شروع ہو گئے ہیں۔ اب میں واپس ریلوے لائن پر بھی نہیں جا سکتا تھا' خدا جانے وہ مجھ سے کتنی دور پیچھے رہ گئی تھی اور آگے کس طرف نکل گئی تھی۔ اندازہ لگا کر میں نے ندی کے ساتھ ساتھ مشرق کی سمت چلنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ آگے کہیں نہ کہیں ریلوے لائن مل جائے گی اور میں کسی اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا۔ ندی کے کنارے جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ زمین رات کی بارش کی وجہ سے گیلی تھی مگر کیچڑ نہیں تھا اور میں آرام سے چل سکتا تھا۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے کچھ دور جا کر ندی کے دونوں جانب درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا یہاں ٹیلے اور پہاڑیاں نہیں تھیں' اندھیرے میں معلوم ہو رہا تھا کہ کھیت بھی نہیں ہیں' بس اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی ہے۔ اچانک مجھے آدم خور شیروں کا خیال آ گیا اور مجھ پر خوف طاری ہونے لگا۔ میں نے شکار کی کہانیوں میں پڑھا تھا کہ شیر عام طور پر رات کو شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں اور اگر ندی قریب ہو تو پانی پینے وہاں ضرور آتے ہیں' اب مجھے ندی پر جھکی ہوئی جھاڑی بھی شیر لگنے لگی۔ میں درختوں کی طرف دیکھنے لگا کہ اگر شیر آ گیا تو میں کسی درخت پر کیسے چڑھوں گا' درختوں کی موٹی موٹی ٹہنیاں زمین سے کافی اوپر جا کر شروع ہوئی تھیں مجھ کو لگا کہ میں جلدی میں درخت پر نہیں چڑھ سکوں گا اور مجھے شیر کھا جائے گا میں نے اس لمحے دل میں توبہ کی اور عہد کیا کہ آئندہ ریل میں بغیر ٹکٹ سفر نہیں کروں گا ندی جس کے ساتھ ساتھ میں چل رہا تھا وہ سطح زمین سے اونچی تھی اس کی دونوں جانب ڈھلان تھی' جہاں درخت ہی درخت تھے ایک جگہ ندی نے موڑ کاٹا تو مجھے درختوں کے درمیان تھوڑے سے

فاصلے پر روشنی نظر آئی۔ میری جان میں جان آ گئی۔ ضرور یہ کوئی چھوٹا سا گاؤں ہے۔ میں ندی کی ڈھلان اتر کر درختوں میں سے ہوتا ہوا روشنیوں کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ یہ مٹی کے تیل والی تین لالٹینیں تھیں جو تھوڑی تھوڑی جگہ چھوڑ کر شاید کسی بانس کے ساتھ لٹکی جل رہی تھیں' شاید کوئی آدمی باسی یعنی مدھیہ پردیس کے جنگلوں میں رہنے والے لوگ ہیں' میں نے سوچا یہ لوگ ضرور میری مدد کریں گے اور مجھے کسی ریلوے اسٹیشن تک پہنچا دیں گے۔ یہ سوچ کر میں جلتی ہوئی لالٹینوں کی طرف بڑھا' مجھے سگریٹ کے تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی دور سے کسی مرد کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں آدم خور شیروں کے جنگل سے نکل کر انسانوں کی دنیا میں آ گیا ہوں۔ گیلی گھاس پر میرے قدموں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میری گردن ایک ہاتھ سے دبوچ کر دوسرے ہاتھ سے میرا بازو پکڑ لیا اور پھر ایک گرجدار آواز سے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ ادھر کیا کر رہے ہو؟“

میں نے کہا۔

”میں رات کے اندھیرے میں راستہ بھول گیا تھا گاؤں کی روشنی دیکھ کر ادھر آ گیا ہوں۔“

اس آدمی کے ساتھ ایک اور آدمی تھا' دوسرے آدمی کی آواز آئی۔ ”اسے ٹھاکر کے پاس لے چلو۔“

یہ جملے وہ مدھیہ پردیش کی مقامی ہندی زبان میں بول رہے تھے۔ انہوں نے میری گردن چھوڑ دی مگر بازو پکڑے رکھا۔ میں نے گردن موڑ کر ان آدمیوں کو دیکھا انہوں نے پگڑیاں باندھی ہوئی تھیں' پگڑیوں کے اوپر سے ایک صافہ گزار کر تھوڑی کے نیچے باندھا ہوا تھا یہ دیکھ کر میں ڈر گیا کہ ان دونوں کے پاس ایک ایک رائفل تھی جو انہوں نے کندھوں پر لٹکائی ہوئی تھی مجھے بھوپت ڈاکو کی کہانی یاد آ گئی جو میں نے لائبریری میں بیٹھ کر کسی کتاب میں پڑھی تھی۔ میرے خدا یہ لوگ ضرور ڈاکو تھے وہ مجھے درختوں میں لے گئے جہاں لالٹین روشن تھیں' ایک چھوٹا سا خیمہ درختوں کے درمیان لگا تھا باہر چارپائی پر ایک آدمی رائفل لیے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا' لالٹین کی روشنی میں اس کی بڑی بڑی مونچھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور جو آدمی مجھے پکڑ کر لائے تھے ان سے پوچھا۔

”یہ لونڈا کہاں سے پکڑ لائے ہو؟“ جس آدمی نے مجھے پکڑ رکھا تھا اسی نے مجھے چارپائی کے پاس زبردستی زمین پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے یہ کوئی پولیس کا جاسوس لگتا ہے ٹھاکر کو دکھانے لایا ہوں۔“ چارپائی پر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ ”ٹھاکر دارو پی کر سو گیا ہے اسے دوسری چھولداری میں لے جا کر بند کر دو۔ صبح دیکھ لیں گے۔“

اتنے میں خیمے کے اندر سے ایک بھاری مردانہ آواز آئی ”کون ہے بے؟“

”ٹھاکر پولیس کا جاسوس پکڑا ہے۔“

”اسے اندر لاؤ میرے سامنے۔“

خیمے کے اندر سے کسی نے کہا جو یقیناً ٹھاکر تھا اور ان ڈاکوؤں کا سردار ہی ہو سکتا تھا۔ ایک آدمی مجھے بازو سے پکڑ کر خیمے کے اندر لے گیا۔ خیمے کے اندر بھی لالٹین جل رہی تھی' زمین پر دری بچھی تھی' میلے کچیلے سے دو گاؤ تکیے لگے تھے' ایک عورت جس نے کاسنی ساڑھی پہنی ہوئی تھی ایک گاؤ تکیے پر سر رکھے منہ دوسری طرف کیے سو رہی تھی۔ دوسرے گاؤ تکیے پر کہنی ٹیکے ایک خوفناک مونچھوں اور چمکیلی سرخ آنکھوں والا بھاری بھرکم آدمی نیم دراز تھا' اس کے سر پر رومال بندھا تھا جس میں سے اس کے بالوں کے پٹے باہر نکلے ہوئے تھے اس کے ہاتھ میں شیشے کا گلاس تھا اور وہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ مجھے اس کے آگے ڈال دیا گیا۔

”ٹھاکر یہ ہے پولیس کا جاسوس' چاندنی میں ہمارے ٹھکانے کی بو لیتا پھر رہا تھا۔“ ٹھاکر نے سر ذرا نیچے کر کے مجھے گھور کر دیکھا اور ہنس کر بولا۔ ”ارے یہ تو بالک ہے۔“

”ٹھاکر آج کل پولیس نے جاسوسی کے لیے بالک بھی بھرتی کر رکھے ہیں۔“

ٹھاکر نے حلق سے عجیب غراہٹ کی آواز نکالی اور گلاس والا ہاتھ بڑھا کر غصے میں کہا۔

”تو اسے لے جا کر بند کر دو' صبح میں خود اسے گولی ماروں گا۔“ میری جان ہوا ہو گئی' جسم دہشت کے مارے ٹھنڈا ہو گیا تھا' میری عمر بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اپنے آپ کو حوصلہ دیتا۔ مجھ پر ان خونی ڈاکوؤں کی ہیبت چھا گئی تھی۔ مجھے پیچھے درختوں کے درمیان ایک چھولداری میں بند کر کے میری تلاشی لی گئی۔ میری جیب سے گیلے سگریٹ کی ڈبی' ٹوتھ برش اور تین چار روپے اور جو آنے دو آنیاں نکلیں وہ ڈاکوؤں نے اپنے قبضے میں کر لیں اور میرے پاؤں میں رسی ڈال کر رسی کو چھولداری کے درمیان والے بانس کے ساتھ کس کر باندھ دیا۔

دونوں ڈاکو مجھے باندھ کر باہر نکل گئے باہر ایک ڈاکو نے دوسرے سے کہا۔

”ارے دھیرج' تو باہر پہرے پر بیٹھ جا' صبح اس جاسوس کو ٹھکانے لگانا ہے۔“

خوف کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا' مگر آخر کیوں؟ میں نے تو ان کا کچھ نہیں بگاڑا' میں پولیس کا جاسوس بھی نہیں ہوں' چھولداری کے اندر ساری رات میں نے خدا سے دعا مانگنے میں گزار دی کہ وہ مجھے ان خونی ڈاکوؤں سے نجات دلائے اس دوران مجھے نیند بھی آ گئی مگر ڈر کے مارے کئی بار اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

صبح ہو گئی' چھولداری میں صبح کی روشنی پھیل گئی باہر درختوں پر سے چڑیوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں' اتنے میں دو ڈاکو اندر داخل ہوئے دونوں کے کاندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں انہوں نے میری رسی کھولی اور بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے گئے چند قدموں کے فاصلے پر ان ڈاکوؤں کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے ایک ڈاکو نے مجھے گھوڑوں کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

”چل وہاں جا کر گھوڑوں کی مالش کر' ٹھاکر نے تیری جان بخشی کر دی ہے۔“

موت ٹل گئی تھی خدا نے میری دعا سن لی تھی میں گھوڑوں کے پاس آ گیا وہاں پہلے سے ایک آدمی ایک گھوڑے کے جسم پر زور زور سے کپڑا پھیر رہا تھا اس نے گلے میں سے اپنا صافہ اتار کر مجھے دیا اور گالی دے کر کہا۔ ”چل بے اس گھوڑے کی مالش شروع کر دے۔“ گھوڑے کی مالش کا مجھے تجربہ نہیں تھا مگر جان بچ جانے پر میں بڑا خوش تھا۔ اس ڈاکو کی دیکھا دیکھی میں نے بھی گھوڑے کی مالش شروع کر دی۔ میرا قد اتنا تھا کہ میرا سر گھوڑے کی کمر سے ذرا اوپر تک آتا تھا۔ میں گھوڑے کے پہلو کی جانب کھڑا ہو کر مالش کرنے لگا پیچھے اس لیے کھڑا نہ ہوا کہ کہیں گھوڑا مجھے دولتی نہ مار دے۔

ان ڈاکوؤں نے مجھے محنت مزدوری پر لگا دیا میں گھوڑوں کی مالش کرتا' کھر کھرا پھیرتا' انہیں چارہ ڈالتا' ان کے ہاں تین گائیں بھی تھیں ان کی دیکھ بھال کا کام بھی میرے سپرد تھا۔ شام کو میرے آگے برتنوں کا ڈھیر لگا دیا جاتا میں سارے برتن مانجھتا' دوپہر کو ندی پر جا کر ان کے میلے کچیلے کپڑے دھوتا' اس دوران ایک ڈاکو مسلسل میری نگرانی کرتا رہتا کہ میں کہیں بھاگ نہ جاؤں۔ اس نگرانی کرنے والے ڈاکو کے ہاتھ میں ہر وقت رائفل رہتی۔ اس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ مجھے گولی مار دے گا۔

ان ڈاکوؤں کا یہ کوئی خفیہ ٹھکانہ تھا رات کے وقت

وہ لوگ آس پاس کے دیہات یا کسی چھوٹے شہر میں ڈاکہ مارنے جاتے اور کافی سامان لوٹ کر لاتے جس عورت کو میں نے رات کے وقت ڈاکوؤں کے سردار ٹھاکر کے خیمے میں دری پر منہ دوسری طرف کیے لیٹے دیکھا تھا وہ عورت دن میں مجھے نظر آتی تھی کبھی ندی کنارے منہ ہاتھ دھوتے کبھی چارپائی پر چھوٹا سا آئینہ سامنے رکھ کر بال بناتی اور کبھی کھانے پینے کا سامان ٹھاکر کے خیمے میں لے کر جاتی ہوئی۔

ایک روز دوپہر کے وقت میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھا برتن دھو رہا تھا کہ وہ عورت دو چار برتن لیے آئی برتن میرے پاس رکھتے ہوئے بیٹھ گئی اس وقت نگرانی کرنے والا ڈاکو وہاں نہیں تھا۔ عورت کا رنگ کالا تھا۔ آنکھیں شربت کے رنگ کی تھیں اس نے بالوں میں خوب تیل لگایا ہوا تھا برتنوں کو ایک طرف لگاتے ہوئے اس نے شہر کی عورتوں والی اردو زبان میں مجھے کہا۔ "یہاں سے بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ ورنہ ساری زندگی ان ڈاکوؤں کی غلامی کرتے گزر جائے گی۔"

اس عورت کو اپنا ہمدرد پا کر مجھے حوصلہ ہوا میں نے کہا۔

"مگر میں کیسے بھاگوں؟ ڈاکو میرے پیچھے لگا رہتا ہے۔"

"آہستہ بولو۔" عورت نے سرگوشی کی پھر ایک تھالی اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اور اونچی آواز میں مجھے ڈانٹنے لگی۔ "کیسے برتن دھوتے ہو؟ ساری میل لگی ہوئی ہے۔"

پھر دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"آج رات تمہیں ایک ترکیب بتاؤں گی۔"

میں کچھ کہنے لگا تو اس نے سرگوشی میں ہی مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "خاموش رہو۔ خبردار کسی سے بات نہ کرنا میں رات کو تمہیں کسی بہانے اپنے پاس بلالوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور مجھے خراب برتن دھونے پر ڈانٹتی ہوئی ٹھاکر کے خیمے کی طرف چل دی۔

جب رات ہوئی تو میرا محافظ ڈاکو مجھے اپنی نگرانی میں چھوٹی سی چھولداری میں لایا۔ میرے ایک پاؤں میں رسی ڈال کر بانس کے کھمبے کے ساتھ باندھ دی اور باہر چل پھر کر پہرہ دینے لگا۔ رات کو دو ڈاکو وقفے وقفے سے پہرہ دیتے تھے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ عورت مجھے کب بلاتی ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں ہی نہیں آرہی تھی کہ وہ عورت ٹھاکر کے خیمے میں رات کو سوتی ہے وہ مجھے ٹھاکر کے ہوتے ہوئے کیسے بلائے گی۔ عورت کی اردو بتا رہی تھی کہ وہ دلی لکھنؤ کے علاقے کی رہنے والی ہے۔ وہ اسی علاقے کی صاف اردو بولتی تھی۔ خدا جانے ان ڈاکوؤں میں کیسے پھنس گئی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ باہر ڈاکوؤں میں معمول کے خلاف کچھ زیادہ ہی ہل چل سی مچی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ کوئی جشن وغیرہ منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ پھر دو تین گھوڑے میری چھولداری کے سامنے سے دوڑتے ہوئے گزر گئے۔ ڈاکو ایک دوسرے کو آوازیں بھی دے رہے تھے۔ پہلے تین گھوڑے گزرے تھے پھر بہت سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی جو آہستہ آہستہ جنگل میں غائب ہوگئی۔ اس کے بعد باہر خاموشی چھاگئی۔ میں اٹھ کر خیمے کے پردے میں سے باہر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے پاؤں میں جو رسی بندھی تھی وہ پانچ چھ فٹ تک ہی جاتی تھی اور جس بانس کے ساتھ میں بندھا تھا وہ اس چھوٹے سے خیمے کے درمیان میں تھا۔ وہاں ایک ٹاٹ بچھا دیا گیا تھا۔ میں ٹاٹ پر لیٹ گیا۔ اس خیال سے نیند بھی نہیں آرہی تھی کہ وہ عورت مجھے بلانے والی ہے۔ خدا جانے کس وقت بلالے۔

اس عورت سے ملنے کے بعد میرے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن روشن ضرور ہوگئی تھی۔

ضرور مجھے فرار کی کوئی ایسی ترکیب بتائے گی کہ میں اس جہنم سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ سارا دن جانوروں کی طرح کام کرتے کرتے میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے آپ کو بیدار نہ رکھ سکا اور مجھے نیند آگئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب کوئی شخص مجھے پاؤں کی ٹھوکر مار کر جگا رہا تھا۔

"اٹھو بے اٹھو۔"

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میرے پاؤں کی رسی پہلے ہی کھول دی گئی تھی۔ میں ابھی تک نیند میں تھا۔ میں بھول گیا کہ اس عورت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے رات کو اپنے خیمے میں بلائے گی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے ٹھاکر جی؟"

میں ان سب ڈاکوؤں کو ٹھاکر جی کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا کہ مجھے جگانے والا وہ ڈاکو ہے جو رات بارہ بجے کے بعد میری نگرانی کی ڈیوٹی پر آتا تھا۔ اس نے مجھے کان سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"چل بے۔ ٹھاکرنی جی کے سر میں درد ہے اس کے سر کی مالش کر۔ چل۔"

مجھے سب یاد آگیا۔ فوراً اٹھا اور محافظ ڈاکو کے پیچھے پیچھے خیمے سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھے ٹھاکر یعنی ڈاکوؤں کے سردار کے بڑے خیمے کی طرف لے جا رہا تھا۔ درختوں کے نیچے بانسوں پر لالٹینیں جل رہی تھیں مگر گھوڑے اپنے تھانوں پر نظر نہیں آرہے تھے۔ محافظ ڈاکو نے ٹھاکر کے خیمے کے باہر کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا۔

"ٹھاکرنی جی لڑکا لے آیا ہوں۔" اندر سے اسی عورت کی آواز آئی۔

"اندر بھیج دے اور تو یہاں سے دفع ہوجا۔"

ڈاکو نے خیمے کا پردہ ایک طرف سے ذرا سا اٹھا کر مجھے اندر دھکا دے دیا۔

خیمے کے اندر وہی منظر تھا۔ پرانے قالین پر گاؤ تکیے لگے تھے۔ لالٹین جل رہی تھی مگر ڈاکوؤں کا سردار ٹھاکر وہاں نہیں تھا۔ ٹھاکرنی یعنی میری ہمدرد عورت قالین پر چادر گردن تک لیے لیٹی تھی۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے صندوق کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"وہاں سے تیل کی شیشی اٹھالا اور میرے سر میں ڈال کر مالش کر۔ سر میں بڑا درد ہے۔"

مجھے یقین سا ہوگیا کہ یہ عورت واقعی سر درد میں مبتلا ہے اور اس نے مجھے سر کی مالش کے لیے ہی بلایا ہے۔ صندوق پر ایک بوتل رکھی ہوئی تھی جس پر کارک لگا تھا۔ میں اٹھا کر ٹھاکرنی جی کے سرہانے کی طرف قالین پر بیٹھ گیا۔ اس نے سر کی پٹی کھول دی اور اونچی آواز میں بولی۔

"چل بے...... تیل ڈال کر مالش کر۔ تیل زیادہ نہ ڈالنا۔ آہستہ آہستہ مالش کرنا۔ ہائے رام سر درد سے پھٹا جاتا ہے۔"

میں نے تھوڑا سا تیل اپنی ہتھیلی میں انڈیل کر ٹھاکرنی کے سر میں ڈالا اور آہستہ آہستہ اسے بالوں میں جذب کرنے لگا۔ وہ عورت خیمے کے دروازے پر جو پردہ پڑا تھا اس طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے سر کی مالش کر رہا تھا۔ اور وہ برابر خیمے کے پردے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ خدا جانے وہ کیا دیکھ رہی تھی۔ میں یہ پوچھتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ رات کو مجھے ٹھاکر کے خیمے میں بلائے گی اور وہاں سے فرار ہونے کی کوئی ترکیب بتائے گی۔

ایک دم سے عورت ذرا سا اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"حرامی چلا گیا ہے۔ باہر کھڑا ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"کون تھا ٹھاکرنی جی؟"

میں نے یونہی پوچھ لیا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

"وہی کم بخت جو تمہیں یہاں لایا تھا۔"

پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سر سے پرے ہٹا دیا اور دھیمی آواز میں بولی۔

"مجھے کوئی سر درد وغیرہ نہیں ہے۔ یہ تمہیں یہاں بلانے کا ایک بہانہ تھا۔ ٹھاکر اپنے آدمیوں کو لے کر کہیں ڈاکہ ڈالنے گیا ہوا ہے مجھے معلوم تھا کہ وہ آج رات ڈاکہ ڈالنے جا رہا ہے۔ اب میری بات غور سے سن۔ میں نہیں جانتی کہ تو کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ اتنا ضرور پتا ہے کہ تو مسلمان ہے اور پنجابی ہے۔ میں تجھے ایک صورت میں یہاں سے فرار ہونے کی ترکیب بتاؤں گی کہ اس کے بدلے تو قسم کھا کہ میرا کام کرے گا۔"

میں نے کہا۔ "آپ جو کہیں گی میں کروں گا مگر خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکال دیں۔"

اس عورت نے کہا۔ "تو پھر قرآن شریف کی قسم کھا کر وعدہ کرو کہ یہاں سے جاتے ہی میرا کام کرو گے۔"

میں نے قرآن شریف کی قسم کبھی نہیں کھائی تھی۔ میں قرآن شریف کی قسم کھاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"میں قرآن شریف کی قسم نہیں کھا سکتا۔ لیکن میں تم سے خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے جو وعدہ کروں گا وہ ضرور پورا کروں گا۔"

اس عورت کے پاس بھی زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام رام دلاری بتایا۔ اب میں آگے اس کا نام ہی لکھوں گا۔

"تو پھر سنو!" رام دلاری نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کل کی رات چھوڑ کر پرسوں رات ٹھاکر پھر کہیں ڈاکہ ڈالنے جائے گا۔ میں اسے کہہ کر اس رات تمہیں اپنے پاس خیمے میں رکھ لوں گی کہ یہ رات کو میرا سر دبائے گا۔ تم ابھی لڑکے سے ہو۔ ٹھاکر تم پر شک نہیں کرے گا۔ پرسوں رات ہی تم یہاں سے فرار ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں راستے کا سارا نقشہ سمجھا دوں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کام کیا ہے جو مجھے کرنا ہوگا؟"

رام دلاری نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور ذرا جھڑک کر کہا۔ "آہستہ بولو۔ ٹھاکر کے آدمی جاسوس ہیں۔"

پھر اس نے اپنی ساڑھی کے بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈال کر خاکی رنگ کا ایک لفافہ نکالا جو ڈاک کے لفافے سے ذرا بڑا اور لمبوترے سائز کا تھا اور تہہ کیا ہوا تھا۔

"وہ سامنے صندوق پر جو دھوتی پڑی ہے وہ اٹھا لاؤ۔"

صندوق پر اسی عورت کی ایک گیروے رنگ کی دھوتی پڑی تھی۔ جنوبی اور وسطی ہند میں عورتوں کی سادہ ساڑھی کو دھوتی بولتے ہیں۔ اس نے جلدی سے دھوتی کا ایک پلو پھاڑ کر خط کو اس میں لپیٹا اور مجھے اٹھ کر کھڑے ہونے کو کہا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس نے مجھے قمیص اوپر اٹھانے کو کہا۔ میں نے قمیص اوپر اٹھائی۔ پھر اس عورت نے اس خط کو جو دھوتی کے پلو میں لپٹا ہوا تھا میری کمر کے گرد باندھ دیا اور قمیص نیچی کر کے بولی۔

"اب بیٹھ جاؤ اور غور سے سنو۔ جو میں کہوں اسے اچھی طرح دماغ میں بٹھا لو۔ پرسوں رات میں تمہیں آدھی رات کے بعد یہاں سے نکال دوں گی۔ تم یہاں سے نکل کر میرے خیمے کے پیچھے کی طرف سے ندی پار کرنا۔ آگے آم کے درختوں کا گھنا باغ آئے گا۔ اس باغ سے بھی گزر جانا پھر ایک چھوٹی برساتی ندی آئے گی۔ اس پر بانس کا ایک پل بنا ہوا ہے۔ اس پل کے پار جاؤ گے تو تمہیں پرانے قلعے کی ٹوٹی پھوٹی دیوار ملے گی۔ اس دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے چلے جانا۔ جہاں دیوار ختم ہوگی وہاں سے ایک راستہ نیچے کھیتوں میں جاتا ہے۔ ان کھیتوں میں پہنچتے ہی

جتنی تیز بھاگ سکتے ہو بھاگنا شروع کر دینا۔ مگر ایک ہاتھ میرے لفافے پر رکھنا۔ کہیں راستے میں لفافہ نہ گرا دینا۔ جہاں کھیت ختم ہو جائیں گے وہاں اونچی اونچی گھاس کا میدان آ جائے گا۔ اس میدان کو بھی پار کر جانا۔ آگے تمہیں ریلوے سگنل کی بتی دکھائی دے گی۔ سگنل کے نیچے سے ریلوے لائن پار کرو گے تو دوسری طرف گرو جی کا سمادھ ہے وہاں چھپ کر دن نکلنے کا انتظار کرنا۔ جب دن نکل آئے تو تمہیں سمادھ کے پیچھے ایک کچا راستہ نظر آئے گا۔ وہ راستہ تمہیں مان پور قصبے میں پہنچا دے گا۔ یہ سارا راستہ تمہیں یاد رہے گا نا؟"

میں نے کچھ تذبذب کا اظہار کیا تو رام دلاری نے ساری تفصیل ایک بار پھر دہرائی۔ میں نے پوچھا۔

"مانپور قصبے میں میں کس کے پاس جاؤں گا؟"

رام دلاری کہنے لگی۔

"وہاں کی پولیس چوکی میں چلے جانا۔ وہاں ست پرکاش نام کا تھانیدار ہے اس کو میرا لفافہ دینا۔ یہ لو پانچ روپے اپنے پاس رکھو۔" اس نے تکیے کے نیچے سے بٹوہ نکال کر مجھے چاندی کے پانچ روپے دیئے اور کہنے لگی۔

"اب تم یہیں اس طرف لیٹ جاؤ۔"

اتنے میں باہر سے کسی مرد نے آواز دی۔

"ٹھاکرانی جی میں گھی گرم کر کے بھجوا دوں۔" رام دلاری نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ لڑکا میرا سر دبا رہا ہے۔ تم جاؤ۔"

میں وہیں ایک طرف لیٹ گیا اور جو جو راستے رام دلاری نے مجھے بتائے تھے اور فرار ہونے کے بعد جن جن راستوں سے مجھے گزرنا تھا وہ میں یاد کرنے لگا۔ رات میں نے رام دلاری کے نرم نرم گدے دار بستر پر گزاری۔ صبح اٹھا تو میرے محافظ نے مجھے محنت مشقت پر لگا دیا۔ ڈاکوؤں کا سردار ٹھاکر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں گھوڑوں کو کھرا پھیرنے کے بہانے رام دلاری کے خیمے کے پیچھے کی طرف سے ہو کر باڑے کی طرف گیا۔ میں نے دیکھا۔ ٹھاکر کے خیمے کے پیچھے ندی بہہ رہی تھی۔ یہ وہی ندی تھی جو سامنے کی طرف سے آ کر ذرا گھوم کر پیچھے سے گزر رہی تھی۔ ندی کی دوسری جانب تھوڑے فاصلے پر آموں کا باغ بھی نظر آ رہا تھا۔ مجھے دوسرے دن رات کو اسی باغ میں سے گزرنا تھا۔ میں اپنے ذہن میں سارے راستوں کو دہراتا اور یاد کرتا گھوڑوں کے پاس آ کر ایک گھوڑے کو کھرا پھیرنے لگا۔

ٹھاکر دوپہر کے وقت گھوڑوں پر سوار جنگل میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ لوٹ مار کا کافی سامان لائے تھے۔ چھ سات گھڑ ڈاکوؤں نے اپنے اپنے گھوڑوں پر ڈال رکھے تھے۔ وہ رات گزر گئی دوسری رات کو ڈاکو پھر کسی دوسرے گاؤں میں ڈاکہ ڈالنے کے لیے چل دیئے۔ رام دلاری نے ٹھاکر سے میرے بارے میں بات کر رکھی تھی۔ ڈاکے کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے رات کے پہلے پہر ڈاکوؤں کے سردار ٹھاکر نے مجھے اپنے خیمے میں بلایا۔ اس وقت رام دلاری بھی سر پر پٹی باندھے اس کے پاس بیٹھی تھی۔ ٹھاکر نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی لال لال خونی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور جنگلی بلے کی طرح غرا کر کہا۔

"سن بے..... تو رات کو یہاں رہے گا اور ٹھاکرانی کی خدمت کرے گا۔ اس کے سر میں تیل کی مالش کرے گا۔ اس کا سر دبائے گا سمجھا کہ نہیں۔"

میں نے فوراً سر ہلا کر کہا۔

"سمجھ گیا ٹھاکر جی۔"

"تو پھر اس طرف ہو کر بیٹھ جا۔"

ٹھاکر مہم پر روانہ ہونے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ رائفل کاندھے پر لگی تھی۔ گلے میں کارتوسوں کی

دو چٹیاں لٹک رہی تھیں۔ اس نے انگریزوں کی طرح پرانی برجس پہنی ہوئی تھی جو گھٹنوں کے اوپر پھولی ہوئی تھی۔ سر پر کالا رومال باندھ رکھا تھا۔ اس نے رام دلاری سے کہا۔

"میں جاتا ہوں۔ پیچھے خیال رکھنا۔ یہ دوائی دودھ کے ساتھ کھاتی رہنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ میری طرف گھور کر دیکھتا ہوا خیمے سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بلند ہوئیں جو آہستہ آہستہ رات کی خاموشی میں جذب ہو گئیں۔ رام دلاری فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں تمہیں ایک بار پھر سارا راستہ سمجھاتی ہوں۔"

اور اس نے ایک رات پہلے جو تفصیل بیان کی تھی اسے دہرانا شروع کر دیا۔ میں اس کے ایک ایک لفظ ایک ایک نشانی کو ذہن نشین کرتا چلا جا رہا تھا۔ جب وہ سمجھا چکی تو آہستہ سے بولی۔

"اب تُو مجھے بتا کہ یہاں سے کدھر جائے گا؟"

میں نے رک رک کر اسے بتانا شروع کیا کہ میں اس خیمے کے پیچھے سے ندی پار کروں گا۔ آگے آموں کا باغ آئے گا۔ جہاں میں بھول جاتا رام دلاری مجھے یاد دلا دیتی۔ جب مجھے سارا راستہ پکا پکا یاد ہو گیا تو رام دلاری بولی۔

"یاد رکھنا، مان پور قصبے کا نام ہے اور وہاں کی پولیس چوکی کا تھانیدار ست پرکاش ہے۔ صرف اس کو میرا خط دینا۔ اس کا حلیہ تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ اس کا رنگ سانولا ہے۔ دبلا پتلا آدمی ہے۔ ماتھے پر دائیں جانب زخم کا آدھا انچ لمبا نشان ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں ہیں اور سر کے درمیان سے تھوڑا گنجا ہے۔"

رام دلاری نے مجھے ست پرکاش کا حلیہ بھی اچھی طرح سے یاد کرا دیا۔ میں نے پوچھا۔

"خط دینے کے بعد میں کیا کروں گا؟" رام دلاری بولی۔

"یہ تمہیں تھانیدار ست پرکاش ہی بتائے گا۔ تم اس کے پاس ہی رہنا اکیلے کسی طرف نکل گئے تو یہ ڈاکو تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔ اٹھو تمہارے فرار ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ خیمے سے باہر لے جائے گی اور ندی تک چھوڑنے جائے گی۔ مگر اس نے وہیں خیمے کے عقبی پردے کے آگے پڑا ہوا صندوق ایک طرف ہٹایا۔ ذرا سا پردہ اوپر اٹھا کر گردن باہر نکال کر دیکھا اور مجھے اشارے سے آگے آنے کو کہا۔ میں گھٹنوں کے بل چلتا خیمے کے پچھلے پردے کے نیچے سے نکل گیا۔ باہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرف کوئی محافظ یا پہرے دار نہیں تھا۔ میں جھک کر جھاڑیوں میں سے گزرتا ندی پر پہنچ گیا اور اندھیرے میں آموں کے باغ کے جھنڈ دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ندی پار کرتے ہی دوڑنا شروع کر دیا۔ میں نے قمیص اور پرانی پتلون پہن رکھی تھی جو گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ رام دلاری کا خط میری کمر کے ساتھ بندھا تھا۔ اس نے مجھے چاندی کے جو پانچ روپے دیئے تھے وہ میری پتلون کی پچھلی جیب میں تھے۔ میں دوڑتے ہوئے آموں کے باغ میں گھس گیا۔ میری نوجوانی کی عمر تھی۔ مجھے ذرا بھی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں باغ میں سے تیز تیز چلتا گزرا۔ آگے برساتی ندی آ گئی۔ اس پر ایک جانب چھوٹا سا بانس کا پل کا خاکہ بھی نظر آ گیا۔ میں نے پل پر پاؤں رکھا تو وہ ڈولنے لگا۔ بہرحال میں بانسوں کو پکڑتا پل پر سے گزر گیا۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں پرانے قلعے کے کھنڈر کو تلاش کرنے لگیں۔ میں کھیتوں میں چلا جا رہا تھا۔ کھیت ختم ہوئے تو سامنے ایک کھنڈر دکھائی دیا۔ رات کے اندھیرے میں وہ کوئی بھوت کمبل اوڑھ کر بیٹھے لگ رہا تھا۔ اس قلعے کی صرف ایک دیوار کا برج باقی رہ گیا تھا۔ رام دلاری کے کہنے کے مطابق میں نے کھنڈر کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ یہ دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ دیوار ختم ہوئی تو آگے ڈھلان آ گئی۔ یہاں اونچی گھاس میں ایک تنگ سا راستہ بنا ہوا تھا۔ میں ڈھلان پر سے اتر کر آگے کھیتوں میں آ گیا۔ رام دلاری نے کہا تھا کہ ان کھیتوں میں پہنچ کر دوڑنا شروع کر دینا۔ میں نے کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی کچی پگڈنڈی پر دوڑنا شروع کر دیا۔ میں نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھ لیا تھا جہاں رام دلاری کا خط کپڑے میں لپٹا میری کمر کے ساتھ بندھا تھا۔ آگے چڑھائی تھی۔ یہ گھاس کا ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے کچھ فاصلے پر ریلوے سگنل کی سرخ بتی نظر آئی۔ میں خوش ہوا کہ میں ڈاکوؤں کے چنگل سے نکل کر ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ ریلوے لائن کافی دور تھی۔ وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی سگنل کی بتی ہری ہو گئی جب میں ریلوے لائن سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا تو پیچھے سے ریل کے انجن کی سیٹی سنائی دی۔ میں وہیں رک گیا۔ انجن کی فلڈ لائٹ مجھ پر پڑنے لگی۔ میں جلدی سے جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ ریل گاڑی شور مچاتی زمین کو ہلاتی گزر گئی۔ میں نے اٹھ کر ریلوے لائن عبور کی۔ رام دلاری نے کہا تھا کہ ریلوے لائن کے پار تمہیں نیچے درختوں میں ایک سمادھ ملے گا۔ اس کا نام گرو جی کا سمادھ ہوگا۔ مجھے یہاں کسی جگہ چھپ کر رات کا باقی حصہ گزارنا تھا۔ میں دونوں جانب اگے ہوئے بڑے بڑے درختوں کے قریب سے گزرتا ذرا آگے گیا تو مجھے ستاروں کی دھندلی روشنی میں ایک چبوترے پر بنی ہوئی چھتری نما بارہ دری سی دکھائی دی۔ یہ گرو جی کا سمادھ تھا۔ یعنی یہاں کسی گرو جی کی کچھ ہڈیاں دفن تھیں۔ میں چبوترے پر چڑھ گیا اور بارہ دری کے اندر جہاں سمادھ کا چھوٹا سا کٹہرا بنا ہوا تھا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ یہاں مجھے دن نکلنے تک بیٹھنا تھا۔ آدھی رات تو پہلے ہی گزر چکی تھی۔ مچھر اتنے کاٹ رہے تھے کہ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں سمادھ کے کٹہرے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ پیچھے کوئی تالاب تھا جہاں مینڈک مسلسل بول رہے تھے۔ مجھے اپنے پیچھے سیٹی سنائی دی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

پیچھے سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا۔ سیٹی کی آواز ایسی تھی جیسے بچوں کے کھلونے کی سیٹی کی ہوتی ہے۔ باریک اور تیز۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ ایکدم مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ کہیں یہ سانپ تو نہیں۔ ان علاقوں میں برسات کے موسم میں سانپ بلوں سے نکل آتے ہیں۔ میں جلدی سے سمادھ کے چھوٹے سے کٹہرے کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ یا اللہ مجھے سانپ نہ کاٹ لے۔ مجھے ایسی موت سے بڑا خوف لگتا تھا۔ میں نے ایک آدمی کو مرتے دیکھا تھا جس کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ وہ آدمی ہمارے محلے کے باہر جو اکھاڑا تھا وہاں نہانے کے بعد دھوتی باندھ رہا تھا کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا۔ اس کے منہ ناک سے خون جاری تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ مر گیا۔ سیٹی کی آواز ایک بار پھر آئی۔ میں نے اندھیرے میں نظریں گاڑ دیں۔ کوئی جانور تیزی سے جھاڑیوں سے نکل کر ایک طرف بھاگ گیا۔

میرے سر پر دہشت کی جو تلوار لٹک رہی تھی وہ ہٹ گئی۔ یہ سانپ نہیں تھا۔ اس کے بعد سیٹی کی آواز بھی نہ آئی۔ اب مجھے یہ ڈر لگنے لگا کہ کہیں کوئی شیر چیتا آ کر مجھے ہڑپ نہ کر جائے۔ اسی دہشت اور خوف کے عالم میں میں نے باقی رات کاٹ دی۔ آسمان پر بادلوں کے پیچھے صبح کی پھیکی پھیکی روشنی ہونے لگی تو میری جان میں جان آئی۔ ریلوے لائن

پر سے ایک گاڑی شور مچاتی گزر گئی۔ جب دن کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا تو میں سادھ کے ٹھڑے سے نیچے اترا اور دوسری طرف آ کر دیکھا۔ یہاں سے ایک پتلا سا راستہ جھاڑیوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ یہی وہ کچا راستہ تھا جس پر سے گزر کر رام دلاری نے کہا تھا کہ تم مان پور قصبے میں پہنچ جاؤ گے۔ مجھے مان پور قصبے کی پولیس چوکی میں جا کر تھانیدار ست پرکاش کو رام دلاری کا خط دینا تھا جو کپڑے میں لپٹا میری کمر کے ساتھ بندھا تھا۔

میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا جھاڑیوں کے درمیان سے گزر گیا۔ آگے ایک چھوٹی سی پکی سڑک آ گئی جس کی دونوں جانب جھاڑیاں بھی تھیں اور اونچے اونچے گھنے درخت بھی تھے۔ ایک بیل گاڑی پیچھے سے آ رہی تھی جس کے آگے بیل جتے ہوئے تھے۔ میں سڑک کے کنارے ہو کر کھڑا ہو گیا۔ بیل گاڑی پر ایک دیہاتی بیٹھا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ دیا تو وہ رک گیا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "مجھے مان پور پولیس چوکی جانا ہے۔"

دیہاتی کا لہجہ ذرا بدل گیا۔

"بھائی وہاں کیا کرنے جا رہے ہو؟ کیا تمہارا کوئی آدمی قتل ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں مجھے تھانیدار جی سے ملنا ہے۔"

گاڑی بان نے بڑی نرمی سے کہا۔

"بھائی اوپر چڑھ کر بیٹھ جاؤ۔ میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

میں چھکڑے کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ چھکڑا خالی تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد قصبے کے مکان نظر آنے لگے۔ سبزیوں ترکاریوں کے کھیت شروع ہو گئے۔ قصبے کے مکان سارے کے سارے اینٹ پتھر کے تھے اور سب کی چھتیں ڈھلانی تھیں۔ وسطی ہندوستان میں چونکہ بارشیں بہت ہوتی ہیں اس لیے یہاں گاؤں کے مکانوں کی چھتیں کھپریل جوڑ کر ڈھلانی بنائی جاتی ہیں تاکہ بارش کا پانی ان پر نہ رکے۔ پتھر چونکہ اس سطح مرتفع والے علاقے میں بہت ہوتا ہے اس لیے مکانوں کی دیواریں پتھروں کی ہوتی ہیں جو دھوپ اور برسات کی بوچھاڑوں کی مار کھا کھا کر زنگ آلود سیاہی مائل ہو جاتی ہیں۔ دھوتی نما ساڑھیوں میں ملبوس نیم عریاں دیہاتی عورتیں کھیتوں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی نظر آ رہی تھیں۔ قصبے کے مکان شروع ہوئے تو ایک جگہ پیپل کا گھنا درخت تھا جس کے قریب ہی چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا۔ اس مندر میں مسلسل گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

گاڑی بان نے ایک کوارٹر نما مکان کے آگے چھکڑا روک دیا اور بولا۔

"بابو بھائی یہی ہے پولیس کی چوکی۔"

میں چھکڑے سے اتر پڑا۔ گاڑی بان تیزی سے چھکڑا آگے نکال کر لے گیا۔ کوارٹر کے دروازے پر ایک جانب ہندی اور انگریزی میں پولیس چوکی لکھا تھا۔ برآمدے میں ایک مریل سا سنتری اسٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ میں اس کی طرف آیا تو وہ ترش لہجے میں بولا۔

"کیوں بے..... کدھر آ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے تھانیدار صاحب ست پرکاش جی سے ملنا ہے۔"

سنتری اسی طرح اسٹول پر بیٹھا بیڑی پیتا رہا۔ پھر ذرا ہنس کر بولا۔

"کیوں بے..... تجھے صبح صبح تھانیدار جی سے کیا کام پڑ گیا ہے۔ کہاں سے آ رہا ہے؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔ "یہ ساری باتیں میں تھانیدار صاحب کو ہی بتاؤں گا۔"

برآمدے میں ایک کمرہ تھا جس پر چق پڑی ہوئی تھی۔ اس کے اندر سے کسی مرد کی تیز آواز آئی۔

"کیوں رے رلیا رام کس سے باتیں کر رہا ہے؟"

اس سنتری کا نام رلیا رام تھا۔ اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ "کوئی لڑکا ہے کہتا ہے بڑے صاحب سے ملوں گا۔"

اس کے بعد چق ایک طرف کو اٹھی اور ایک وردی پوش سپاہی اندر سے نکلا۔ شاید وہ حوالدار ہو گا۔ وہ بھی بڑا سوکھا سا کھا تھا۔ میری طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

میں نے جو باتیں پہلے سنتری کو کہی تھیں وہی دہرا دیں۔ یہ بالکل نہ بتایا کہ میں ست پرکاش کے نام کس کا خط لے کر آیا ہوں۔ دوسرے سنتری یا حوالدار نے برآمدے میں ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"چل ادھر ہو کر بیٹھ جا۔ صاحب آئے گا تو مل لینا۔"

میں برآمدے میں ایک ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ رام دلاری نے جو مجھے چاندی کے پانچ روپے دیئے تھے وہ میری میلی کچیلی پتلون کی پچھلی جیب میں اسی طرح محفوظ پڑے تھے۔ رام دلاری کا خط میری کمر کے ساتھ بندھا تھا۔ سگریٹ کی ڈبیا راستے میں کہیں دوڑتے دوڑتے گر گئی تھی۔ سگریٹ میں نے بچپن ہی میں پینے شروع کر دیئے تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر یہ بری عادت مجھے بھی پڑ گئی تھی۔

کافی دن نکل آیا تھا۔ قصبے کے بازار میں کالے کالے سانولے سانولے دیہاتیوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی کوئی سائیکل پر گزر جاتا۔ کوئی ریڑھا ایک طرف سے آ کر دوسری طرف نکل جاتا۔ اکثر آدمیوں نے صرف گھٹنوں سے اوپر تک دھوتیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اوپر کا دھڑ ننگا تھا۔ عورتوں کے رنگ بھی گہرے سانولے تھے۔ ابھی تک مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ قصبہ مان پور جہاں میں بیٹھا ہوں اس کے آگے کون سا بڑا شہر آتا ہے۔ میں تو بمبئی جا کر فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھنے کے شوق میں گھر سے بھاگ کر آیا تھا کہ راستے میں بغیر ٹکٹ پکڑا گیا اور ٹی ٹی نے بیچ جنگل اور بارش میں اتار دیا۔ اب بھی میں نے یہی سوچا ہوا تھا کہ رام دلاری کا خط تھانیدار کو دے کر میں بمبئی بھاگ جاؤں گا۔ یہاں سے کوئی نہ کوئی گاڑی تو بمبئی کی طرف ضرور جاتی ہو گی۔

اتنے میں ایک وردی پوش پولیس کا آدمی تھانے کے احاطے میں داخل ہوا۔ اس کو دیکھتے ہی اسٹول پر بیٹھے ہوئے سنتری نے بیڑی ایک طرف پھینکی اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس وردی پوش آدمی کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا تو مجھے اس کے ماتھے پر دائیں جانب زخم کا نشان بھی نظر آ گیا۔

ضرور یہی ست پرکاش تھانیدار تھا۔ سنتری نے اسے سلیوٹ کیا اور آگے بڑھ کر دروازے کی چق اٹھا دی۔ تھانیدار اندر چلا گیا۔ میں اسی طرح برآمدے میں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر سنتری سے کہا۔

"تھانیدار صاحب آ گئے ہیں نا؟"

سنتری بولا۔ "ہاں ہاں آ گئے ہیں مگر ابھی کام کر رہے ہیں۔ تم آرام سے بیٹھے رہو۔"

میں پھر وہیں ستون کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اتنے میں وہی تھانیدار کمرے سے باہر آیا اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ میں دوڑ کر اس کے سامنے آ گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

اس کے ہاتھ میں بید کا ڈنڈا تھا۔ میں نے ذرا

آگے ہو کر کہا۔
"میں رام دلاری جی کا خط لایا ہوں۔"
وہ ٹھٹک سا گیا۔ سنتری اتنے میں دوڑ کر آیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچنے لگا۔ تھانیدار نے غصے میں اسے ڈانٹ دیا۔
"کیا کرتا ہے چھوڑ دے اسے۔"
پھر تھانیدار نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے واپس اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں جو حوالدار بیٹھا تھا اسے فوراً باہر جانے کو کہا۔ جب کمرے میں صرف میں اور تھانیدار رہ گئے تو اس نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور کہا۔
"کہاں ہے خط؟"
میں نے کہا۔ "پہلے اپنا نام بتائیں۔"
وہ ذرا سا مسکرایا۔
"میرا نام ست پرکاش ہے۔"
اس دوران میں نے اس کے ماتھے پر دائیں جانب زخم کے آدھ انچ لمبے نشان کو غور سے دیکھ لیا تھا۔ اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کا سر درمیان سے تھوڑا سا گنجا تھا۔ میں نے اپنی کمر کے گرد لپٹا ہوا کپڑا اتارا اور اس میں سے رام دلاری کا لفافہ نکال کر ست پرکاش کو دے دیا۔ وہ لفافہ پھاڑ کر خط پڑھنے لگا۔ خط پڑھتے وقت اس کے چہرے کے تاثرات ایسے ہو رہے تھے جیسے اسے کوئی ایسی شے مل گئی ہو جس کے ملنے کی اسے بالکل امید نہ تھی۔ خط پڑھ کر اس نے تہہ کر کے خاکی بش شرٹ کی جیب میں رکھا اور تیز آواز میں سنتری کو آواز دی۔ سنتری دوڑتا ہوا اندر آ گیا۔ ست پرکاش نے کہا۔
"اس لڑکے کے لیے ناشتہ لے کر آؤ۔"
"یس سر۔"
سنتری سیلوٹ کر کے چلا گیا۔
تب ست پرکاش نے میز پر کہنیاں رکھ کر میری طرف جھک کر ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔
"تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جو ہماری بمبئی پولیس کا بڑے سے بڑا اور چالاک سے چالاک افسر بھی نہیں کر سکا۔ ہم تمہارے دھنوادی ہیں۔ تم پنجاب کے ہو اور مسلمان ہو۔ دھنوادی کا مطلب سمجھتے ہو؟"
میں نے کہا۔ "نہیں سر۔"
"اس کا مطلب ہے ہم تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں۔"
میں نے اس سے کہا۔
"سر! بس میرا ایک کام کر دیں۔ مجھے کسی طرح بمبئی پہنچا دیں۔"
"وہاں تمہارے رشتے دار ہیں کیا؟"
میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ مجھے فلم ایکٹروں کو دیکھنے کا شوق بمبئی لے جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔
"ہاں جی! میرے ایک چاچا جی وہاں رہتے ہیں۔"
ست پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ہم تمہیں خود بمبئی پہنچائیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ مگر ابھی تمہیں میرے پاس رہنا ہوگا۔ شاید تم نہیں جانتے کہ تم مدھیہ پردیش کے ایک بہت بڑے خونی ڈاکو کے ڈیرے سے جان بچا کر نکل آئے ہو۔"
میں نے فوراً کہا۔
"اب جس طرح بھی ہو رام دلاری جی کو بھی وہاں سے نکال لائیں۔ وہ وہاں خوش نہیں ہے۔ اسے ڈاکوؤں کے سردار ٹھاکر نے قید کر کے رکھا ہوا ہے۔"
ست پرکاش آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"فکر نہ کرو۔ ہم رام دلاری کو بہت جلد وہاں سے نکال لائیں گے اور ان ڈاکوؤں کو بھی گرفتار کریں گے۔"
سنتری ناشتہ لے کر آ گیا۔ پیتل کی تھالی میں گرم گرم پوریاں تھیں۔ پیتل کی کٹوریوں میں بھاجی اور اچار تھا۔ چار چھوٹی چھوٹی پوریاں تھیں۔ میں گھر میں صبح صبح قلچے سری پائے کا ناشتہ کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی دو

ڈھائی قلچے کھا جایا کرتا تھا۔ اوپر سے مجھے بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی۔ جب تک سنتری نے صراحی سے پانی نکال کر میرے پاس گلاس رکھا میں تین پوریاں کھا چکا تھا۔ تھانیدار ست پرکاش میری طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ پوچھنے لگا۔
"پوریاں اور منگواؤں؟"
میں نے کھاتے کھاتے کہا۔
"ہوں۔"
ست پرکاش نے سنتری کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔
"چار پوریاں اور لے کر آؤ۔"
"یس سر۔"
ناشتہ کرنے کے بعد ست پرکاش نے میرے لیے چائے منگوائی باہر سنتری کو آرڈر کر دیا کہ اندر کسی کو آنے نہ دیا جائے۔ وہ کاغذ پینسل سامنے رکھ کر بیٹھ گیا اور مجھ سے ڈاکوؤں کے ٹھکانے کے محل وقوع کے بارے میں باتیں پوچھنی شروع کر دیں وہ مجھ سے تفصیلات پوچھتا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ لکھتا اور کاغذ پر کہیں کہیں نشان بھی لگاتا جاتا تھا۔ جب ست پرکاش تھانیدار نے مجھ سے ڈاکوؤں سے متعلق ساری تفصیلات حاصل کر لیں تو مجھے ساتھ لے کر گھر آ گیا۔ اس کا گھر قصبے کی ایک گلی کے کونے پر تھا۔ یہ دو منزلہ پختہ مکان تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔
"یہ لڑکا اپنا بیٹا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ سندری سے کہہ کر اس کے کپڑے دھلوا دینا۔"
ست پرکاش واپس پولیس چوکی چلا گیا۔ میں سارا دن گھر میں رہا۔ ست پرکاش کی ہندو بیوی نے مجھے ایک نئی دھوتی نکال کر پہننے کو دی اور میرے کپڑے نوکرانی سندری نے دھو کر استری کر دیے۔ دوپہر کو مجھے صحن میں جہاں ایک گائے بندھی تھی وہاں بانس کی چارپائی پر تھال میں کھانا ڈال کر دیا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ست پرکاش کی ہندو بیوی مجھے گھر کے کھانا کھانے والی جگہ یعنی چوکے کے قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ اس لیے کہ میں مسلمان تھا۔
اس دوران ست پرکاش تھانیدار نے ساتھ والے قصبے اور قریبی شہر سے بھی پولیس کی نفری منگوالی تھی اور ٹھاکر ڈاکو کی کمین گاہ پر چھاپہ مارنے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ دوپہر کے بعد ست پرکاش پولیس کی مسلح بھاری نفری لے کر ڈاکوؤں کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوا۔ یہ ساری کارروائی مجھے بعد میں رام دلاری نے بتائی۔ پولیس نے چاروں طرف سے ڈاکوؤں کو گھیرے میں لے کر اچانک حملہ کیا تو وہاں افراتفری مچ گئی۔ سب سے پہلے ست پرکاش نے رام دلاری کو اپنی حفاظت میں لیا۔ کئی ڈاکو مارے گئے۔ تین پولیس کے سپاہی زخمی ہوئے۔ ڈاکوؤں کا سردار ٹھاکر اپنے چند ساتھیوں سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
شام کا اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں چھایا تھا کہ پولیس پارٹی قصبے میں واپس آ گئی۔ پولیس کچھ ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے بھی لے آئی تھی۔ رام دلاری کو ست پرکاش تھانیدار اسی وقت خود گھر لے کر آ گیا۔ رام دلاری نے مجھے دیکھا تو خوش ہو کر ست پرکاش کی بیوی سے کہا۔
"بھابو جی! یہ مسلمان لڑکا اگر میری مدد نہ کرتا تو میں یہاں واپس نہیں پہنچ سکتی تھی۔"
رات کو ناریل کی چھال کے سائبان کے نیچے چارپائیاں ڈال دی گئیں۔ رام دلاری نے نہا دھو کر نئی ساڑھی پہن لی تھی۔ اس نے سر میں تیل ڈال کر بالوں میں کنگھی بھی کی ہوئی تھی۔ اس علاقے کے رواج کے مطابق جوڑے میں موتیے کے پھولوں کا جوڑا بھی باندھ رکھا تھا۔ اس وقت مجھے وہ بڑی خوب صورت اور اچھی لگی۔ وہ عمر میں مجھ سے پندرہ بیس سال بڑی ہوگی مگر لگتی بالکل نوجوان تھی۔ ڈاکوؤں کے درمیان رہنے سے بھی اس کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑا تھا۔ وہیں چارپائیوں پر بیٹھ

کر رات کا کھانا کھایا گیا۔ ست پرکاش نے ڈاکوؤں پر یلغار اور پولیس مقابلے کا سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ اپنی بیوی کو سنایا اور اپنی بہادری کا رعب جماتا رہا۔ رام دلاری اس دوران میری چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی اور ہنستے ہوئے بولی۔

”مجھے بھائی جی نے بتایا ہے کہ تم بمبئی جانا چاہتے ہو اور تمہیں ایکٹروں اور فلم ایکٹرسوں کو دیکھنے کا شوق ہے۔“

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں بمبئی کی طرف ہی جا رہا تھا کہ بغیر ٹکٹ پکڑا گیا۔“

رام دلاری نے کہا۔ ”وہ تو مجھے معلوم ہے۔ تو پھر تم میرے ساتھ ہی بمبئی چلنا۔ میں بمبئی میں ہی رہتی ہوں۔“

جب رام دلاری نے اپنے بارے میں کھل کر بتایا کہ وہ بمبئی کی فلموں میں ایکسٹرا عورتوں کے ساتھ کام کرتی ہے اور بڑا اچھا ڈانس کرتی ہے۔ ست پرکاش تھانیدار اس کی پھوپھی کی بیٹی کا خاوند تھا اور آگرہ سے اجین اور پھر اجین سے مان پور کی پولیس چوکی میں آ کر لگا تھا تاکہ اس علاقے کو ڈاکوؤں سے صاف کرے۔ رام دلاری ایک فلم یونٹ کے ساتھ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں حصہ لینے کے لیے اجین کے تاریخی مندروں میں آئی ہوئی تھی اور مندر کے قریب ایک جنگل میں یونٹ کی دوسری ایکسٹرا گرلز کے ساتھ مقیم تھی کہ وہاں آدھی رات کو ڈاکہ پڑ گیا تھا کہ لے اپنے ڈاکوؤں [illegible]

رام دلاری ان سب عورتوں سے بڑھ کر پسند آئی اور وہ اسے اٹھا کر ساتھ ہی لے گیا۔ ست پرکاش تھانیدار نے اجین اور اندور شہر کے [illegible] وندھیاچل کے سارے پہاڑی جنگلوں کو چھان مارا مگر اسے ڈاکوؤں کا کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔

[illegible]

”کیا تم مجھے بھی شوٹنگ پر ساتھ لے جایا کرو گی؟“

رام دلاری نے ہنس کر کہا۔

”تمہیں فلم کی شوٹنگ پر بھی لے جاؤں گی اور اپنی سہیلیوں سے بھی ملاؤں گی۔“

میں بڑا خوش ہوا۔ اس سے پہلے میں دو بار گھر سے بھاگ کر بمبئی جا چکا تھا مگر کسی نے مجھے فلم اسٹوڈیو میں نہ جانے دیا تھا۔ اب مجھے فلم ایکٹرسوں کو دیکھنے کا بڑا اچھا موقع مل رہا تھا۔ تین دن رام دلاری نے ست پرکاش تھانیدار کے ہاں قیام کیا۔ چوتھے دن ست پرکاش لاری میں ہمارے ساتھ بیٹھ کر بھارت کے تاریخی شہر اندور آیا۔ اندور سے میں اور رام دلاری بمبئی جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جب تک گاڑی نہیں چلی ست پرکاش پلیٹ فارم پر موجود رہا۔ اندور سے روانہ ہو کر گاڑی ساری رات ست پڑا کی پہاڑیوں اور جنگلوں میں سفر کرتی رہی۔ راستے میں کھنڈوا نام کا شہر بھی آیا۔ دوسرے روز گاڑی ناسک پہنچی تو دن کافی نکل آیا تھا۔ دوپہر کے وقت بمبئی شہر کا مضافاتی اسٹیشن باندرہ بھی گزر گیا۔ رام دلاری نے سامان سمیٹتے ہوئے مجھے کہا۔

”تیار ہو جاؤ۔ بمبئی کا اسٹیشن آ رہا ہے۔“

[illegible] بمبئی [illegible] بمبئی کی بلڈنگیں نظر آ رہی ہیں۔ سڑک پر ناریل کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ ٹرین یارڈ میں [illegible]

[illegible]

راتیں کہاں بسر ہوں گی۔ کھانے پینے کی مجھے فکر نہیں تھی۔ کیونکہ میں دونوں دفعہ گھر سے پیسے چوری کر کے بھاگا تھا لیکن اس بار مجھے اس بات کی پریشانی نہیں تھی کہ میں اتنے بڑے شہر میں کہاں رہوں گا۔ رات کہاں بسر کروں گا۔ اس بار رام دلاری میرے ساتھ تھی اور وہ مجھے اپنے گھر لے جا رہی تھی۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ رام دلاری بمبئی کی فلموں میں ایکسٹرا رول ادا کرتی ہے اور اس کی وجہ سے میں فلموں کی شوٹنگ بھی دیکھوں گا اور فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو بھی ملوں گا۔

ٹرین بمبئی ریلوے اسٹیشن کے کشادہ پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک گئی۔ رام دلاری نے مجھے ایک تھیلا پکڑاتے ہوئے کہا۔

”میرے ساتھ رہنا۔ ادھر اُدھر نہ ہو جانا۔“

میں نے تھیلا پکڑ لیا اور رام دلاری کے ساتھ ڈبے سے باہر نکل آیا۔ رام دلاری نے قلی کو بلا کر اس کے سر پر سامان رکھوایا اور کہا۔

”باہر چلو۔“

اسٹیشن سے باہر ایک طرف بمبئی کی خاص سواری وکٹوریہ گھوڑا گاڑیاں قطار میں کھڑی تھیں۔ [illegible]

[illegible]

میں اور رام دلاری [illegible]

کی چھت ٹین کی ہوئی تھی۔ یہ پرانی بمبئی کی طرح کی آئل کلاتھ کی چھت تھی جو بارش ہو تو کھول دی جاتی تھی۔ اس وقت بمبئی میں بارش نہیں ہو رہی تھی۔

میں بارش کے انتظار میں تھا۔ میں دونوں دفعہ جب بمبئی آیا تھا تو مون سون کا سیزن تھا اور دونوں دفعہ بمبئی میں ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ وکٹوریا اسٹیشن سے نکلتے ہی ہیملٹن روڈ پر آہستہ آہستہ چل پڑی۔ یہ میں تین چالیس کے زمانے کی بات سنا رہا ہوں۔ اس وقت برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ زندگی بڑی سست رفتار اور پرسکون تھی۔ بمبئی کی سڑکوں پر بھی اس زمانے میں اتنا رش نہیں ہوتا تھا۔ سنگ مرمر کی چھوٹی گول میزوں والے ایرانی ریستورانوں کی چائے بڑی خوشبودار ہوتی تھی۔ چھوٹے سے کاؤنٹر پر شیشے کے مرتبانوں میں انگلش بسکٹ، ٹافیاں اور ہاتھی مارکہ سگریٹ بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ ان دنوں بمبئی میں ہاتھی مارکہ اور حیدرآباد دکن کا چار مینار سگریٹ غریب مزدوروں کا بڑا مقبول سگریٹ تھا۔ یہ شاید ایک آنے کا پیکٹ ہوتا تھا۔

وکٹوریا سڑک کے کنارے کنارے سست رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ گھوڑے کے سموں کی کلپ کلوپ کی آواز آ رہی تھی۔ پھر وکٹوریا کافی آگے جا کر [illegible] جانب گھوم گئی۔ [illegible]

[illegible]

ساتھ لیے جیسے ہی ایک دومنزلہ پرانی بلڈنگ کے پاس آئی اوپر سے اسے دوتین عورتوں نے دیکھ لیا اور ایک دوسری کواونچی آواز میں کہا۔

"اری! رام دلاری آ گئی۔"

سب عورتیں نیچے آ گئیں۔ اور رام دلاری سے گلے ملنے لگیں۔ ان میں جوان لڑکیاں بھی تھیں اور ادھیڑ عمر بھی تھیں۔ سب نے ساڑھیاں پہن رکھی تھیں اور ان کے رنگ سانولے اور کالے کالے تھے۔ یہ بمبئی فلم انڈسٹری کی ایکسٹرا گرلز تھیں جو اس چالی یا بلڈنگ میں رام دلاری کے ساتھ رہتی تھیں۔ کسی نے پوچھا۔

"رام دلاری! تو کہاں تھی ری؟"

کسی نے کہا۔

"اری اخبار میں لکھا تھا پولیس تجھے ڈاکوؤں سے چھڑا لائی ہے۔ ڈاکو کیسے تھے؟" پھر سب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ رام دلاری نے کہا۔

"مری کیوں جاتی ہو۔ سب بتادوں گی۔ ذرا دم لینے دو۔"

رام دلاری کے فلیٹ پر تالا پڑا تھا۔ اس نے چابی لگا کر تالا کھولا۔ سامان اندر رکھوایا۔ کوچوان کو پیسے دے کر رخصت کیا اور کارنس پر کسی دیوی کی تصویر لگی تھی، آگے بڑھ کر ساڑھی کے پلو سے تصویر کو صاف کیا اور پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"ممبا دیوی! تیری کرپا ہوئی، میں گھر واپس آ گئی۔"

کمرے میں سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ کونے میں لوہے کے پلنگ پر بستر لگا ہوا تھا۔ میلے میلے تکیے پڑے تھے۔ ایک طرف رسوئی کا سامان پڑا تھا۔ دوسرے کونے میں قد آدم دیوار تھی جس کی دوسری جانب نلکا لگا تھا۔ یہ نہانے اور کپڑے دھونے کی جگہ تھی۔ اسی قسم کی نچلے متوسط طبقے کی بلڈنگوں میں باتھ روم کامن ہوتے ہیں جنہیں بمبئی کی زبان میں سنڈاس کہا جاتا ہے۔ ہر منزل کے لمبے برآمدے کی ایک جانب آدمیوں اور دوسری جانب عورتوں کے باتھ روم یا سنڈاس بنے ہوتے ہیں۔ کمروں کے اندر نہانے اور کپڑے دھونے اور رسوئی وغیرہ کے استعمال کے لیے دیوار کی اوٹ میں نلکا لگا ہوتا ہے۔

میں تھیلا تپائی پر رکھ کر لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دیواروں پر اسی زمانے کی فلمی ہیروئنوں اور ہیرو کی تصویریں کاٹ کر چسپاں کی ہوئی تھیں۔ رام دلاری نے ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد باندھتے ہوئے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"منہ ہاتھ دھولو۔ تمہیں نئے کپڑے خرید کر دینے ہیں۔ میرے ساتھ اسٹوڈیو پتلون پہن کر جایا کرو گے۔"

دیوار کی اوٹ میں نل کے پاس بیٹھ کر میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ رام دلاری نے بھی منہ دھو کر بالوں میں کنگھی کی۔ نئی ساڑھی ٹرنک میں سے نکال کر پہنی۔ ساڑھی پہننے سے پہلے اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بڑے بے شرم ہو۔ منہ دوسری طرف کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

اتنے میں اس کی فلم اسٹوڈیو کی ایکسٹرا گرل سہیلیاں آ گئیں۔ وہ رام دلاری سے اس کے ساتھ گزرے واقعات سننے کو بے تاب تھیں۔ مگر رام دلاری نے ان سب کو یہی کہا کہ بس میں آ گئی ہوں۔ ڈاکو لے گیا تھا۔ پولیس نے چھاپہ مارا اور مجھے برآمد کر لیا۔ ایک سانولی سی دبلی پتلی لڑکی نے بسنتی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے رام دلاری سے پوچھا۔

"یہ سائیڈ ہیرو کہاں سے اٹھا لائی ہو؟"

میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ رام دلاری نے مسکرا کر کہا۔

"اری! یہ ہیرو مجھے نہ ملتا تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔ بڑی بہادری دکھائی اس نے۔"

ایک اور عورت کہنے لگی۔

"تیرے جانے سے کورس ڈانس میں ہمارا بھی جی نہیں لگتا تھا۔ سیٹھ بھی تیرا پوچھا کرتا تھا۔"

"وہ گنجا مردواڑی۔"

"ہاں ہاں۔"

رام دلاری نے بالوں کے جوڑے میں ربن باندھتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کرے اب دو تین فلموں کا کام مل جائے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا۔"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد رام دلاری کی ایکسٹرا گرل سہیلیاں اپنے اپنے فلیٹوں میں چلی گئیں۔ یہاں سے ہم سرخ رنگ کی بس میں بیٹھ کر بمبئی کی اس علاقے کی ایک کپڑا مارکیٹ کے پاس اتر گئے۔ یہاں ریڈی میڈ کپڑوں کی ایک دکان سے رام دلاری نے مجھے دو ٹھنڈی پتلونیں اور دو قمیصیں خرید کر دیں۔ ایک چپل بھی خرید کر دی۔

شام کو اس نے چولہے کے پاس بیٹھ کر آلو کی بھاجی بنائی۔ چھوٹے چھوٹے پھلکے پکائے اور میرے ساتھ کھانا کھایا۔ کہنے لگی۔

"ابھی تک میں نے یہاں کسی کو نہیں بتایا کہ تو مسلمان ہے۔ سوچتی ہوں کیوں نہ میں تمہارا ایک ہندوانہ نام رکھ دوں۔ بات یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ تم اب میرے پاس ہی رہو۔ تم نے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا ہے کہ میں جس کا بدلہ اتارنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں پڑھاؤں گی اگر نہیں بھی پڑھو گے تو تمہیں فلموں میں چھوٹا موٹا رول دلادیا کروں گی۔ ہوسکتا ہے تم ہیرو بن جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "میں ہندو نہیں ہوں، میں مسلمان ہوں۔"

رام دلاری نے میرے گال پر تھپکی دے کر کہا۔

"ارے پگلے میں کب کہتی ہوں کہ تو ہندو ہے۔ تو مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔ میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میرے ساتھ ایک مسلمان لڑکے کو رہتے دیکھ کر سب لوگ شک کریں گے۔ تمہارا فرضی ہندوانہ نام رکھ دوں گی تو کوئی شک نہیں کرے گا۔ نام رکھنے سے تم ہندو تھوڑے ہو جاؤ گے۔ دیکھتے نہیں فلم انڈسٹری میں کتنے ہی مسلمان ہیں جنہوں نے اپنے نام ہندوانہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہے اننت کو لے لو۔ وہ پشاور کا مسلمان ہے مگر نام اس نے ہندوؤں والا رکھا ہوا ہے۔ بولو تمہارا کیا نام رکھوں؟"

میں نے کہا۔ "کمار رکھ دو۔ یہ نام مجھے پسند ہے۔"

رام دلاری ہنسنے لگی۔

"واہ رے میرے ہیرو۔ اچھا ٹھیک ہے آج سے میں تمہیں دوسروں کے سامنے راجکمار کہہ کر بلایا کروں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

مجھے راجکمار نام پسند بھی تھا۔ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب میں نے امرتسر کے پرل ٹاکیز میں ایک فلم دیکھی تھی جس کا نام تھا۔ "آوارہ گرد راجکمار۔" یہ فلم مجھے بڑی پسند آئی تھی۔ اس میں ایک راجہ کا بیٹا ہوتا ہے جو بھیس بدل کر رعایا کا حال چال معلوم کرنے شہر شہر آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے۔ رام دلاری رسوئی میں چیزیں سمیٹنے لگی۔ میں اپنی نئی چپل کو میلے کپڑے سے رگڑ کر چمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"کمار؟"

میں سمجھا شاید وہ باہر کسی کو بلا رہی ہے۔ جب دوسری بار اس نے کمار کہہ کر بلایا تو مجھے فوراً خیال آیا کہ میرا فرضی نام کمار ہے۔ راج کمار۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"کیا ہے میڈم؟"

اس نے مجھے جھڑک کر کہا۔

"تم مجھے میڈم نہ کہا کرو۔ دیدی کہا کرو۔ اس لیے کہ تم مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح پیارے ہو۔ جانتے ہو؟ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔"

پھر میں نے دیکھا کہ رام دلاری کا چہرہ ایک دم اداس ہو گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگے آئینے میں اپنے ماتھے پر لگے ہوئے دھبے کو رومال سے صاف کر رہی تھی۔ میری طرف پلٹ کر بولی۔

"تم مجھے دیدی کہو گے نا؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں دیدی۔"

اس نے میرے پاس آ کر میرا ماتھا چوم لیا۔

"میرا راج کمار بھائی...... چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ رات ہو رہی ہے ہمیں اسٹوڈیو چلنا ہے۔ تمہیں پرمیلا جی سے ملاؤں گی۔"

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"رنجیت اسٹوڈیو جانا ہے؟"

وہ ہنس پڑی۔

"ارے! تمہیں رنجیت اسٹوڈیو کا نام بھی معلوم ہے؟ نہیں ہم پرکاش اسٹوڈیو جائیں گے۔ ان کی ایک فلم میں کام کر رہی تھی کہ اس کمینے ٹھاکر نے مجھے اٹھا لیا۔ قمیص کے بٹن بند کرو۔"

بمبئی کے بازاروں میں رات کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں کہ ہم اپنی چالی سے نکل کر ایک بس میں سوار ہو گئے۔ اس بس نے ہمیں بمبئی کے ایک مضافاتی علاقے اندھیری پہنچا دیا۔ پرکاش فلم اسٹوڈیو اندھیری کے علاقے میں ہی تھا۔ پرکاش فلم کمپنی کے نام سے یہاں سٹنٹ فلمیں بنتی تھیں اور ان کی سٹنٹ فلمیں میں امرتسر میں دیکھا کرتا تھا۔ ان فلموں میں امجد خان کے والد صاحب جے انت کے فلمی نام سے ویلن کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ ان کا اسلامی نام مجھے یاد نہیں رہا۔ فلمی نام جے انت تھا۔ پرکاش فلم کمپنی یا پرکاش مووی ٹون کی فلموں میں ہیرو اوما کانت نام کا ایک ایکٹر ہوتا تھا' ہیروئن ایک کرسچین عورت ہوتی تھی جس کا فلمی نام پرمیلا تھا۔

رام دلاری نے مجھے اسٹوڈیو کے ایک بڑے فلور میں ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود ایکسٹرا گرلز کے سپلائر سے باتیں کرنے لگی۔ فلور پر کسی سٹنٹ فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ اداکار جے انت وہاں نہیں تھا۔ ہیرو اوما کانت اور ہیروئن پرمیلا وہاں موجود تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی میک اپ ٹھیک کر رہی تھی۔ میں اسے قریب سے دیکھنے کے شوق میں اٹھ کر صوفے کے پیچھے آ گیا۔ پرمیلا کا چہرہ میک اپ کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مجھے بڑی خوب صورت لگی۔ تھوڑی دیر بعد شوٹنگ شروع ہو گئی۔ میں بڑی دلچسپی اور حیرانی کے ساتھ پرمیلا اور ہیرو کو اداکاری کرتے دیکھ رہا تھا۔ رام دلاری بھی میرے قریب ہی لوہے کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ کوئی ہیروئن نہیں تھی کہ اس کو صوفے پر بٹھایا جاتا۔ دوسری ایکسٹرا عورتیں بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ جب سین ختم ہوا تو رام دلاری کہنے لگی۔

"شوٹنگ تو ساری رات ہوتی رہے گی۔ چلو اپنی باڑی پر چلتے ہیں۔"

باڑی سے مراد اپنا فلیٹ تھا۔

دوسرے دن ہندوؤں کی کسی دیوی کی پوجا کا تہوار تھا۔ بمبئی شہر میں دیوی کے بت کے بڑے جلوس نکلے ہوئے تھے۔ ایک جلوس ہمارے بازار سے بھی گزرا۔ دیوی کا ایک کالا سیاہ بت ٹرک پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں گیندے کے ہار پڑے تھے۔ ہندو کھڑتالیں بجاتے دیوی کے بھجن گاتے ٹرک کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

شام کو رام دلاری نے مجھ سے کہا کہ میں دیوی درشن کے لیے مندر جا رہی ہوں۔ تم چلو گے؟ میں نے سوچا چل کر دیکھتے ہیں کہ ہندو لوگ دیوی کی پوجا کیسے کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ "ہاں دیدی! میں بھی

چلوں گا۔"

وہ ہنس کر بولی۔

"جانتے ہو جس مندر میں میں جا رہی ہوں وہاں کسی مسلمان کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان چلا جائے تو پجاری اسے وہیں قتل کر دیتے ہیں۔ پچھلے سال ایک مسلمان غلطی سے مندر میں چلا گیا تھا۔ پجاری کے آدمیوں نے اسے ترشول مار مار کر ہلاک کر کے اس کا خون دیوی کے چرنوں میں ڈالا تھا۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پولیس کو پتا نہیں چلا؟"

رام دلاری جو ہندو دھرم کے معاملے میں بڑی کشادہ دل تھی کہنے لگی۔

"ارے کون پوچھتا ہے' پولیس میں بھی تو زیادہ ہندو ہی ہیں۔"

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"نہیں نہیں تم میرے ساتھ مت چلنا۔ کسی کو پتہ چل گیا تو ہندو سینا والے تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

مگر میں دیوی کے مندر میں ضرور جانا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر وہاں ایسی کون سی خاص شے ہے کہ وہاں مسلمان داخل نہیں ہو سکتا۔ میں ضد کرنے لگا۔

"میں مسلمان بن کر تھوڑی جاؤں گا۔ میں تو ہندو بن کر تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ تم نے خود ہی تو میرا نام راج کمار رکھا ہے اور فلم اسٹوڈیو میں بھی سب کو بتایا ہے کہ میں ہندو ہوں۔"

رام دلاری نے میری ضد اور بے حد اصرار کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ رام دلاری کے کہنے پر میں نے تنگ پاجامہ اور کھدر کا کرتہ پہن لیا۔ اس نے میرے ماتھے پر سیندور کا ٹیکا بھی لگا دیا اور بولی۔

"خبردار مندر میں کسی سے زیادہ بات نہ کرنا۔ پجاری مہنت میرا واقف ہے۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آ جائے اور تم سے بھی باتیں شروع کر دے۔ اپنا نام راج کمار ہی بتانا۔ میں اسے کہوں گی کہ تم میری موسی کی بیٹی کے لڑکے ہو اور امرتسر سے بمبئی کی سیر کرنے میرے ہاں آئے ہوئے ہو۔ اب اس کو دماغ میں بٹھا لو۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہ کرنا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تم بالکل فکر نہ کرو دیدی۔ تم نے جو کہا ہے ویسے ہی کروں گا۔"

میں بمبئی کے اس مندر کا نام بھول گیا ہوں جس میں کوئی مسلمان داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا مندر میں آ نکلتا تو اسے مہنت کے پجاری وہیں قتل کر ڈالتے تھے۔ یہ مندر بمبئی شہر کے ایک گنجان علاقے میں تھا۔ کافی بڑا مندر تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے دروازے تک جانا پڑتا تھا۔ چونکہ وہ پوجا کا کوئی خاص تہوار تھا اس لیے مندر کے اندر اور باہر ہندو عورتیں' بچوں اور مردوں کا ایک ہجوم موجود تھا۔ مندر میں سنکھ اور ٹل بج رہے تھے۔ مندر کے دروازے پر ایک سادھو لمبی جٹائیں چھوڑے ترشول زمین میں گاڑے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ رام دلاری نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ سادھو صرف اس لیے وہاں بیٹھا ہے کہ اپنے تجربے اور مشاہدے سے یہ معلوم کرے کہ ہندو پجاریوں میں کوئی مسلمان تو مندر میں داخل نہیں ہو رہا۔ فضا میں لوبان کی تیز بو رچی ہوئی تھی۔ کئی عورتوں کے ہاتھوں میں پیتل کی تھالیاں تھیں جن میں پوجا کی سامگری تھی۔ دیوی کا بت ایک کوٹھڑی میں تھا جس کا دروازہ تنگ تھا۔ دروازے کے باہر ایک پجاری بیٹھا لوگوں سے پیسے وصول کر رہا تھا اور انہیں رتن جوت کے دو پھول دے دیتا تھا۔ یہ پھول لے کر ہندو عورتیں اور مرد کوٹھڑی میں داخل ہو جاتے اور دیوی کی پوجا کر کے دوسری طرف سے باہر نکل جاتے۔ رام دلاری نے مجھے باہر ہی کھڑے

رہنے کو کہا اور خود دیوی کی پوجا کرنے کوٹھڑی میں چلی گئی۔

میں ایک آدھ منٹ وہاں کھڑا رہا پھر چل پھر کر مندر کا مشاہدہ کرنے لگا۔ مندر کا دالان کافی بڑا تھا۔ جگہ جگہ دیوی دیوتاؤں کے پتھر کے بت نصب تھے جن کے آگے سے ہندو مرد عورتیں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر گزر جاتیں۔ میرے ماتھے پر رام دلاری نے تلک لگا دیا تھا۔ میرا لباس بھی ہندوانہ تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں پڑ سکتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ پھر بھی یہ سوچ کر دل میں خوف کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی کہ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ میں مسلمان ہوں تو یہ ہندو مجھے قتل کر دیں گے۔

پھرتے پھراتے میں دالان کے کونے کی طرف نکل گیا جہاں ایک گھنا درخت تھا۔ اس درخت کی جٹائیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ میں ان جٹاؤں کو دیکھنے کے لیے درخت کے قریب آ گیا۔ درخت کا تنا بہت بڑا تھا۔ تنے پر سیندور ملا ہوا تھا۔ میں درخت کے پیچھے گیا تو مجھے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی کسی کو تھپڑ مار رہا ہے۔ ساتھ ہی کسی لڑکی کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز آئی پھر کسی مرد کی آواز آئی۔ اس نے لڑکی کو گالی دے کر چپ رہنے کو کہا تھا۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ وہاں ایک پرانی کوٹھڑی تھی جس کی چھت پر گھاس پھوس پڑا تھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ یہ آوازیں کوٹھڑی میں سے ہی آئی تھیں۔ میں کوٹھڑی کی طرف جانے ہی لگا تھا کہ اندر سے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور دو سادھوؤں ایسے گیروے کپڑوں والے آدمی کوٹھڑی میں سے نکلے۔ انہوں نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور چلے گئے۔ مجھے بڑا تجسس ہوا کہ یہ لوگ اندر کس لڑکی کو تھپڑ مار رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر بند دروازے کے ساتھ کان لگایا۔ اندر سے کسی لڑکی کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں بظاہر انجان بن کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر ٹہلتے ٹہلتے کوٹھڑی کی پچھلی طرف آ گیا۔ یہاں کوٹھڑی کی یہ ایک کھڑکی تھی جو بند تھی اور باہر کی جانب کھڑکی کی چوکھٹ میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ میں کھڑکی کے پاس جا کر کان لگا کر سننے لگا۔ اندر سے لڑکی کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز برابر آ رہی تھی۔ میں نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑکی کے بند پٹ پر انگلی سے ٹھک ٹھک کی۔

لڑکی کے رونے کی آواز بند ہو گئی۔

میں نے ایک دفعہ پھر انگلی سے کھڑکی کے پٹ پر کھٹک کھٹک کی۔ ساتھ ہی میں نے کھڑکی کی سلاخوں سے کان لگا دیا۔ کوٹھڑی میں سے لڑکی کے رونے کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

کھڑکی کے پیچھے سے کسی لڑکی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"میرا نام عائشہ ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے یہاں سے باہر نکالو۔"

میں نے کہا۔ "کھڑکی کھولو۔"

اس نے کہا۔ "کھڑکی پر تالا لگا ہے۔"

پھر لڑکی رونے لگی۔ وہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ طبیعت میں جولانیاں تھیں۔ کسی خطرے کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ویسے بھی میں ایڈونچر پسند تھا اور رام دلاری کو ڈاکوؤں کے نرغے سے نکالنے کے بعد میں کچھ زیادہ ہی دلیر ہو گیا تھا۔ اور یہاں سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہندوؤں نے دیوی کے مندر میں ایک مسلمان لڑکی کو قید کر رکھا تھا۔ خدا جانے وہ اسے کہاں سے اغوا کر کے لائے تھے اور اس کے ساتھ کیا کرنے والے تھے۔ میں اس وقت اپنے آپ کو کسی فلمی ہیرو کی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے فوراً کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں رات کو آ کر تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔"

کوٹھڑی میں سے لڑکی نے روتے ہوئے کہا۔

"یہ ہندو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے میرے بابا کو خبر کر دو۔ وہ جھونپڑ پٹی میں رہتے ہیں۔ قاسم بھائی ان کا نام ہے۔ تمہیں اللہ رسول کا واسطہ ہے میرے بابا کو بلاؤ۔ مجھے یہاں سے نکالو۔"

لڑکی روئے جا رہی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"روؤ مت۔ میں رات کو آؤں گا۔ تمہیں یہاں سے نکال کر تمہارے بابا کے پاس پہنچا دوں گا۔"

"کیا تم مسلمان ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔

"ہاں..... میں رات کو آؤں گا۔"

لڑکی کے رونے کی آواز بند ہو گئی۔ دالان کے برآمدے کی جانب سے ایک سادھو ہاتھ میں کرمنڈل لیے لمبی جٹاؤں والے درخت کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں فوراً کھڑکی سے ہٹ گیا اور دوسری طرف سے ہو کر مندر کی بڑی دیوی والی کوٹھڑی کے باہر اسی جگہ آ کر کھڑا ہو گیا جہاں رام دلاری مجھے چھوڑ کر گئی تھی۔

عورتیں اور مرد دیوی درشن کے لیے مندر میں جا رہے تھے اور دیوی کے درشن کرنے کے بعد کوٹھڑی سے باہر بھی نکل رہے تھے۔ میری نگاہیں رام دلاری کو تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میری قمیص پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔

رام دلاری غصے سے بولی۔

"تم کہاں دفع ہو گئے تھے؟"

وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ تم کہاں آئے ہوئے ہو؟ کہاں چلے گئے تھے؟"

میں نے کہا "دیدی میں مندر کی سیر کرنے لگا تھا۔"

"بڑا شوق ہے تمہیں سیر کا۔ چلو واپس چلو۔"

ہم مندر سے نکل کر باہر فٹ پاتھ پر آئے تو رام دلاری نے ذرا پیار کے ساتھ کہا۔

"پگلے! دیوی کے مندر میں پجاری اس کھوج میں پھرتے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی مسلمان تو اندر جاسوسی کرنے نہیں آ گیا۔ تم پر ذرا کسی کو شک پڑ جاتا تو تمہیں تو مرنا ہی تھا' ساتھ میں میری جان بھی مصیبت میں پھنس جاتی۔"

اس وقت دوپہر گزر چکی تھی۔ بمبئی کے آسمان پر بادل صبح سے چھائے ہوئے تھے۔ ابھی تک بارش نہیں ہوئی تھی۔ ہم بس میں بیٹھ کر فلیٹ میں واپس آ گئے۔ رام دلاری سبزی ترکاری بنانے میں لگ گئی۔ میں اس کے سامنے چوکی پر بیٹھ گیا۔ وہ بینگن تھالی میں کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔

"سوچتی ہوں میں نے یہاں سب کو یہ بتا کر کہ تم ہندو ہو اور میرے رشتے دار ہو غلطی کی۔ کسی وقت بھانڈا پھوٹ گیا تو میں یونہی ماری جاؤں گی۔ مگر خیر اب تم ہندو ہی بنے رہنا مگر اس مندر کی طرف کبھی نہ جانا۔ وہ مسلمانوں کا بوچڑ خانہ ہے۔"

رام دلاری نے مجھے بتایا کہ چونکہ دیوی کے مندر میں مسلمانوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اس لیے بمبئی کے مسلمانوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اس مندر میں ہندو پجاری ہر سال کسی نہ کسی مسلمان کو اغوا کر کے مندر میں لے جاتے ہیں اور اسے دیوی کے آگے قتل کر کے اس کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔

"پچھلے سال اسی بات پر یہاں ہندو مسلم فساد بھی ہو گیا تھا' کئی لوگ مارے گئے تھے۔"

اچانک مجھے اس مسلمان لڑکی کا خیال آ گیا جس

کو ہندوؤں نے اغوا کر کے مندر کی کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ ضرور اسے بھی دیوی کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ہندو پجاریوں نے اغوا کیا ہوگا۔ اب مجھے فکر لگ گئی کہ کہیں میرے مندر میں جانے سے پہلے پہلے پجاری اس لڑکی عائشہ کو قتل نہ کر دیں لیکن سوال یہ تھا کہ کیا میں اس مسلمان لڑکی کو مندر سے نکال سکوں گا؟ میرے دل نے کہا وہ مسلمان لڑکی نہ جانے کس غریب آدمی کے گھر کا چراغ ہے اور ہندو نہ جانے کیسے اسے اٹھا کر موت کے منہ میں لے گئے ہیں۔
مجھے یاد آ گیا کہ عائشہ نے کہا تھا کہ اس کا گھر جھونپڑ پٹی میں ہے اور اس کے باپ کا نام قاسم بھائی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں عائشہ کے باپ کو جا کر خبر کر دوں تو ہو سکتا ہے وہ پولیس کو لے کر مندر میں پہنچ جائے اور اپنی بیٹی کو برآمد کر لے۔ پھر خیال آیا کہ عائشہ کا باپ ایک غریب آدمی ہوگا جو جھونپڑی میں رہتا ہوگا۔ اس کی کون سنے گا اور بقول رام دلاری کے بمبئی کی پولیس میں ہندو زیادہ ہیں اور وہ لوگ مندر کے معاملے میں بالکل دخل نہیں دیتے۔ اگر دخل دیتے بھی ہیں تو مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی طرف داری کرتے ہیں۔
عائشہ کے بارے میں میں نے جان بوجھ کر رام دلاری سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اگرچہ وہ مجھ سے چھوٹے بھائیوں کی طرح پیار کرتی تھی مگر آخر وہ ایک ہندو عورت تھی اور یہ حقیقت اس زمانے اور اسی عمر میں ہی میری آوارہ گردیوں اور ہندوؤں کے ماحول میں زیادہ وقت گزارنے سے مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ ہندو آخر ہندو ہی ہوتا ہے اور مسلمان کا معاملہ سامنے آ جائے تو بہت زیادہ ہندو ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مسلمان کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور اسے پھلتا پھولتا اور خوش حال دیکھنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔
میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ رات ذرا گہری ہو گئی تو میں مندر پہنچ جاؤں گا۔ میں نے رام دلاری سے پوچھا کہ یہاں رات کو کتنی دیر تک لوکل بسیں چلتی ہیں۔ اس نے کہا۔
''رات گیارہ بجے آخری بس یہاں سے گزرتی ہے۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''
میں نے کہا۔ ''دیدی! آج میرا فلم دیکھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ پہلا شو دیکھوں گا۔ نو بجے ختم ہو جائے گا۔ بس مل جائے گی۔''
رام دلاری ہنس کر بولی۔
''بمبئی آ کر تم بگڑتے جا رہے ہو۔ اچھا، جاؤ فلم دیکھ آنا۔ مگر کون سی فلم دیکھو گے؟''
''ایسا کرو منروا سینما میں سہراب مودی کی فلم پکار لگی ہے۔ یہ سینما ہماری سینکلٹن اسٹریٹ پر ہی ہے مگر زیادہ دیر نہ لگانا۔''
میں نے خوش ہو کر کہا۔
''نہیں دیدی! شو ختم ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا۔''
یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ جس کوٹھڑی میں ہندوؤں نے مسلمان لڑکی کو بند کر رکھا ہے اس پر تالا لگا ہے۔ میں تالا نہیں توڑ سکتا تھا۔ مجھے لوہے کی چھوٹی سلاخ کی ضرورت تھی جس کی مدد سے میں کنڈی اکھیڑ سکتا تھا۔ میں نے کمرے کے کونوں کھدروں میں پڑی چیزوں کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دی۔ مجھے یاد آیا کہ باہر برآمدے کے کونے میں جس طرف سنڈاس تھا ادھر دیوار میں ایک کھتہ بنا ہوا تھا جہاں کچرا اور پرانی چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ میں کسی بہانے اٹھ کر وہاں گیا اور کھتے میں سلاخ تلاش کرنے لگا۔ سلاخ تو نہ ملی لیکن لکڑی کا ایک فٹ لمبا ڈنڈا مل گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ یہ روٹی بیلنے والا بیلنا تھا۔ یہ میرے کام آ سکتا تھا۔ میں نے اسے صاف کر کے اپنی قمیص کے اندر چھپا لیا۔ شام ہو رہی تھی۔ رام دلاری نے مجھے پانچ روپے دیے اور میں بلڈنگ سے نکل کر بازار میں آ گیا۔ میرا پروگرام بھی یہی تھا کہ پہلے فلم دیکھوں گا، فلم نو بجے ختم ہو جائے گی اس کے بعد دیوی کے مندر کا رخ کروں گا اور وہاں صورت حال کا جائزہ لوں گا اور جیسے ہی موقع ملا مسلمان لڑکی کو وہاں سے نکال کر بھگا لے جانے کی کوشش کروں گا۔ دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ لڑکی وہاں پر موجود ہو۔ کہیں ہندو اسے کسی دوسری جگہ نہ لے گئے ہوں یا انہوں نے اسے قتل کر کے دیوی کی بھینٹ نہ چڑھا دیا ہو۔
ہندووانہ تلک اسی طرح میرے ماتھے پر لگا ہوا تھا۔ شکل وصورت اور لباس سے بھی میں بالکل ہندو لڑکا لگتا تھا۔ لکڑی کا چھوٹا ڈنڈا یعنی بیلنا میں نے کرتے کے اندر چھپا کے رکھ لیا تھا۔ جو لوگ بمبئی رہ چکے ہیں انہیں ضرور علم ہوگا کہ سینکلٹن روڈ بمبئی سنٹرل کے ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے گزرتی ہے اور اس سڑک پر جنوب کی طرف چلتے جائیں تو کچھ دور جا کر منروا ٹاکیز کا سینما ہاؤس آ جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سہراب مودی کی فلم ''پکار'' اس سینما میں نئی نئی لگی تھی اور بڑا رش لے رہی تھی۔ یہ سینما ہاؤس بھی منروا مووی ٹون والوں کا ہی تھا۔ اس کی خوب صورت لابی کی چھت اور فرش پر جگہ جگہ شیشے لگے ہوئے تھے۔ میں بس میں بیٹھ کر منروا ٹاکیز پہنچ گیا۔ بڑا رش تھا۔ بہرحال میں بھی تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر سینما ہاؤس میں جا کر بیٹھ گیا۔ فلم شروع ہوئی۔ جب فلم ختم ہوئی۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ میں جلدی جلدی سینما ہاؤس سے نکل کر بس اسٹاپ پر آ گیا۔
یہاں سے میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ امبے دیوی یا شاید مجھے دیوی کے مندر کو کون سی بس جاتی ہے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ اس مندر کا ان دونوں میں سے کوئی نام تھا۔ اس شخص نے مجھے خاص نمبر کی بس بتائی۔ دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نمبر کی بس آئی تو میں اس میں سوار ہو کر مندر کے چوک میں پہنچ گیا۔ مندر کی روشنیاں سامنے نظر آ رہی تھیں۔ پوجا کے تہوار کی وجہ سے وہاں بڑی رونق تھی۔ میرے ماتھے پر تلک لگا تھا۔ بے دھڑک مندر کے گیٹ میں سے نکل کر دالان میں آ گیا۔ یہاں بھی خوب روشنی تھی۔ دور کونے میں وہ جٹا دھاری گنجان درخت نظر آ رہا تھا جس کے پیچھے کوٹھڑی میں مسلمان لڑکی قید تھی۔ لکڑی کا ڈنڈا میں نے کرتے کے اندر چھپایا ہوا تھا۔ سوچ رہا تھا لڑکی کوٹھڑی میں ہی ہو۔ کہیں مندر کے پجاری اسے نکال کر کسی دوسری جگہ نہ لے گئے ہوں۔ ایک دو منٹ دالان میں یونہی ادھر اُدھر چکر لگاتا رہا۔ پھر کوٹھڑی کے عقب میں آ کر جائزہ لیا کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوئی جگہ بھی ہے یا نہیں۔ کوٹھڑی کے پیچھے مندر کی دیوار تھی جو زمین سے پندرہ بیس فٹ اونچی تھی۔ نیچے ڈھلان تھی جو ایک ویران سی سڑک تک چلی گئی تھی۔ یہاں جگہ جگہ کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔
میں درخت کے نیچے آ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ پوجا کی غرض سے آنے والے ہندو مرد عورتیں اسی طرف جا رہے تھے۔ یہاں دو سادھو میرے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ یہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ دالان میں جو بجلی کے بلب لگے تھے ان کی روشنی یہاں تک پہنچتے پہنچتے کافی مدھم ہو جاتی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کوٹھڑی کے پیچھے اندھیرا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور بظاہر بڑی بے نیازی سے ٹہلتا ٹہلتا کوٹھڑی کے عقب میں آ گیا۔ پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مسلمان لڑکی کوٹھڑی میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ میں نے بند کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ کان لگایا۔ اندر خاموشی تھی۔ میں نے آہستہ سے ٹھک ٹھک کیا۔ اس کے چند لمحوں بعد اندر سے بھی کسی نے کھڑکی پر انگلی مار کر ٹھک ٹھک کیا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔
''عائشہ تم ہو؟''
''ہاں...'' کوٹھڑی کے اندر سے مسلمان لڑکی کی

سہمی ہوئی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کہا۔

"دروازے کے پاس آجاؤ۔"

یہ کہہ کر پیچھے ہٹ کر واپس درخت کے پیچھے آ گیا اور ادھر ادھر منڈلاتے ہوئے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ کوٹھڑی کے پیچھے جا کر نیچے سڑک کو بھی دیکھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر جو اونچی عمارت تھی اس کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ حالات بڑے سازگار تھے۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا فوراً کر گزرنا چاہیے تھا۔ ہندوؤں کے نرغے سے ایک غریب مسلمان لڑکی کو نکال لے جانے کے جذبے نے مجھے کچھ زیادہ دلیر بنا دیا تھا۔ میں پیچھے کی طرف سے ہو کر کوٹھڑی کے دروازے پر آیا۔ اب ہچکچانے یا دیر کرنے کا مقام نہیں تھا۔ میں نے دروازے کے پاس آتے ہی کرتے کے نیچے سے لکڑی کا ڈنڈا نکالا۔ اسے کنڈے کی سنگلی میں پھنسا کر زور سے اپنی طرف کھینچا۔ دوسری بار زور لگانے سے سنگلی کا کنڈا اپنی جگہ سے اکھڑ گیا۔ لڑکی دروازے کے ساتھ ہی لگ کر کھڑی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور میری طرف لپکی۔ یہ ایک دبلی پتلی لڑکی تھی۔ میں نے اسے سرگوشی میں کہا۔ "نیچے بیٹھ جاؤ۔"

میں بھی نیچے بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔ پھر میں آہستہ آہستہ مندر کی عقبی دیوار کی طرف کھسکنے لگا۔ لڑکی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی زمین پر بیٹھے بیٹھے گھٹنوں کے بل میرے پیچھے آنے لگی۔ میں نے دیوار کے پاس جا کر اسے ہاتھ سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ خود اٹھ کر دیوار کی دوسری جانب جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف سڑک خالی تھی۔ میں نے نیچے ہو کر لڑکی سے کہا۔

"عائشہ! دس پندرہ فٹ کی دیوار ہے جلدی سے نیچے کود جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ جلدی کرو۔"

مسلمان لڑکی عائشہ کی حالت یہ تھی کہ اس وقت میں اگر اسے کہتا کہ مقبرہ جہانگیر کے مینار سے کود جاؤ تو وہ وہاں سے بھی کود جاتی۔ وہ دیوار کے اوپر چڑھ گئی۔ پھر دیوار پر چت لیٹے لیٹے اپنی ٹانگوں کو گھما کر نیچے سڑک کی جانب کیا اور ہاتھ دیوار کی منڈیر میں پھنسا کر نیچے کود گئی۔ میں بھی ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر دیوار پر سے دوسری طرف کود گیا۔ لڑکی دیوار سے کودنے کے بعد ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی سڑک پر جا کر رکی تھی۔ میں بھی کودنے کے بعد ڈھلان پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑھکتا ہوا سڑک تک چلا گیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے عائشہ کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔

"بھاگو۔"

میں خود بھی سڑک پر ایک طرف بھاگ رہا تھا اور عائشہ کا ہاتھ پکڑے اسے بھی ساتھ ساتھ بھگا رہا تھا۔ اس علاقے سے میں بالکل واقف نہیں تھا جو سڑک سامنے آتی اسی پر ایک جانب اندھیرے میں ہو کر ہم بھاگنا شروع کر دیتے۔ آگے کوئی مارکیٹ آ گئی۔ وہاں روشنیاں ہو رہی تھیں اور کچھ بند گاڑیاں اور ایک ٹرک بھی کھڑا تھا۔ میں نے عائشہ کو ایک درخت کے پیچھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ہمارے سانس پھولے ہوئے تھے۔ میں نے عائشہ کو دیکھا وہ سانولے رنگ کی غریبانہ سی شکل والی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے سانس لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تمہاری جھونپڑ پٹی کدھر ہے؟ تمہیں اس کا راستہ آتا ہے؟"

عائشہ نے دونوں جانب اور پھر سامنے کی عمارتوں کو دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے مجھے گھر کا راستہ معلوم نہیں ہے۔"

میری نگاہیں چاروں طرف کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

یہ دیوی کے مندر کے آس پاس کا علاقہ تھا اور وہاں ہمارا زیادہ دیر ٹھہرنا کسی حالت میں بھی ٹھیک نہیں تھا۔ ذرا سانس ٹھیک ہوا تو میں نے عائشہ سے کہا۔

"آ جاؤ کسی دوسری سڑک پر چل کر معلوم کرتے ہیں۔"

ہم اٹھ کر سڑک کے کنارے کنارے تیز تیز چلنے لگے۔ آگے ایک چوک آ گیا۔ یہاں چوک میں کسی آدمی کا بت لگا ہوا تھا۔ عائشہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"یہ پارسی کا بت ہے۔ یہاں سے مجھے راستہ آتا ہے۔"

مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جھونپڑ پٹی کو بس کون سے نمبر کی جاتی ہے یا ٹرام کا روٹ کون سا ہے۔ ہم مندر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ اب مجھے ہندوؤں کی پروا نہیں تھی۔ یہاں سے میں نے ایک دو آدمیوں سے معلوم کیا۔ پہلے ایک ٹرام پکڑی۔ پھر ایک بس میں بیٹھ کر سفر کیا اور آخر بمبئی شہر کے اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں ایک بہت بڑے پل کے پاس ایک میدان میں جھونپڑیوں کی بستی آباد تھی۔ یہاں اندھیرا بھی تھا اور کہیں کہیں جھونپڑیوں میں روشنی بھی ہو رہی تھی۔ عائشہ میرے آگے آگے تیز تیز چل رہی تھی۔ ہم جھونپڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ یہ بڑی گندی جگہ تھی۔ جھونپڑیوں کے درمیان گندے پانی کی نالی تھی۔ عائشہ ایک جھونپڑی میں بے اختیار گھس گئی۔ تھوڑی دیر میں اندر سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ دوسری جھونپڑیوں میں سے عورتیں باہر نکل آئیں۔ ایک ادھیڑ عمر کا چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی والا آدمی جھونپڑی سے نکل کر میرے پاس آیا۔ اس کے سر پر مسلمانوں والی سفید کروشیے کی ٹوپی تھی۔ اس نے آتے ہی مجھے گلے سے لگا لیا اور جھونپڑی میں لے گیا۔

جھونپڑی میں لالٹین جل رہی تھی۔ ایک جھلنگا سی چارپائی پر عائشہ اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھی رو رہی تھی۔ ادھیڑ عمر آدمی عائشہ کا باپ قاسم بھائی تھا اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بیٹا! ہم تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکیں گے۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہم اپنی بیٹی کو شاید زندگی بھر دوبارہ نہ دیکھ سکتے۔"

عائشہ کے باپ کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بیٹی کو ہندو اٹھا کر اسی دیوی کے مندر میں لے گئے ہیں۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے پولیس کو رپورٹ کیوں نہیں کی تو قاسم بھائی نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"بیٹا! پولیس بھی تو ہندوؤں کی ہے۔ مسلمان تو بس گنتی کے ہیں۔ اگر میں پولیس کو رپورٹ بھی کرتا تو میری کون سنتا؟ مندر کے بڑے پجاری نے مجھے ایک آدمی کے ذریعے پیغام بھی بھجوا دیا تھا کہ اگر پولیس کو اطلاع کی تو تمہاری لڑکی کی لاش جھونپڑ پٹی میں پہنچا دی جائے گی۔"

میں نے قاسم بھائی سے کہا۔

"اب آپ کیا کریں گے۔ مندر کے بڑے پجاری کو پتا چل گیا کہ مسلمان لڑکی فرار ہو گئی ہے تو وہ سیدھے یہاں آ جائیں گے۔ اس کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟"

قاسم بھائی فکر مند ہو کر بولا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مندر کا بڑا پجاری اپنے آدمی یہاں ضرور بھیجے گا۔ ہم غریب مسلمان ہیں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ مندر کے پجاری کو بڑے بڑے ہندو سیٹھوں کی اور پولیس افسروں کی حمایت حاصل ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"آخر ہندو مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے مندر میں کس لیے لے جاتے ہیں۔ میں نے سنا ہے

کہ پہلے بھی دو مسلمان لڑکیوں کو یہ لوگ اٹھا کر لے گئے تھے اور پھر ان کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔"

قاسم بھائی ٹھنڈا سانس بھر کر بولا۔

"یہ ہندو پجاری مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے جنوبی ہندوستان کے مندروں میں فروخت کر دیتے ہیں جہاں پجاری انہیں دیوداسیاں بنا کر مندروں میں بند کر دیتے ہیں۔ خدا ان کافروں کو غارت کرے۔"

پھر وہ اپنی بیوی اور عائشہ کی ماں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"راتوں رات یہاں سے نکل چلو۔ باندرہ میں عائشہ کی ماسی کے پاس چلے جاتے ہیں۔"

عائشہ کی ماں دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"وہ لوگ تو کل ہی آگرہ چلے گئے ہیں۔"

قاسم بھائی کا سر لٹک سا گیا۔ مایوسی کے ساتھ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے یہاں بیٹھے رہتے ہیں جو ہوگا سہہ لیں گے۔"

اچانک میرے اندر ایک ہلکا سا دھماکا ہوا۔ میں نے قاسم بھائی سے کہا۔

"عائشہ میری بہن ہے۔ میں عائشہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

قاسم بھائی، عائشہ اور اس کی ماں میری طرف منہ اٹھا کر تکنے لگے۔

قاسم بھائی کہنے لگا۔

"بیٹا! تم خود بمبئی میں پردیسی ہو۔ عائشہ بیٹی کو کہاں چھپاتے پھرو گے؟"

میں نے کہا۔ "آپ لوگ بھی تو عائشہ کو لے کر یہاں نہیں رہ سکیں گے۔ اسے مندر کے پجاری کے غنڈے عائشہ کی تلاش میں یہاں ضرور آئیں گے اور اسے دوبارہ اٹھا کر لے جائیں گے۔"

عائشہ اور اس کی ماں رونے لگیں۔ عائشہ کی ماں نے کہا۔

"ہم یہ جھونپڑی چھوڑ کر کہاں جائیں گے ہمارا اس کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

قاسم بھائی انتہائی پریشانی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا پھر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

"پولیس اگر غریب مسلمانوں کو نہیں پوچھتی تو کیا ہوا میں بیٹی کو صبح کی نماز کے وقت بڑی مسجد کے امام صاحب کے پاس لے جاؤں گا اور سارا ماجرا بیان کر دوں گا۔ وہ ضرور اس معاملے میں ہماری مدد کریں گے۔"

مجھے قاسم بھائی کی یہ تجویز اچھی لگی۔ میں نے کہا۔

"آپ ابھی امام صاحب کے پاس عائشہ کو لے کر کیوں نہیں چلے جاتے؟ مجھے خطرہ ہے کہ جونہی مندر کے بڑے پجاری کو عائشہ کے فرار کا علم ہوا وہ اپنے غنڈے بھیج کر اسے پھر اغوا کرنے کی کوشش کرے گا۔"

قاسم بھائی نے جوش میں آتے ہوئے کہا۔

"اجی ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ان ہندوؤں کی پولیس میں بڑی پہنچ ہے مگر ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں ایک ایک کو ایسا مزا چکھاؤں گا کہ پھر کبھی جھونپڑی کا رخ نہیں کریں گے۔ بیٹی کا معاملہ ہے اسے میں فجر کی نماز پڑھنے جاؤں گا تو ساتھ لیتا جاؤں گا اور امام صاحب کے حوالے کر آؤں گا۔"

(باقی آئندہ ماہ)